سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۲۷)

بزمِ تیموریہ

یعنی ہندوستان کے تیموری بادشاہون، شہزادون اور
شہزادیون کی علم دوستی، علما نوازی اور اُن کے درباری شعرا
وفضلا، اور دوسرے اصحابِ کمال کا تذکرہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم۔اے

(رفیق دار المصنفین)

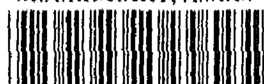


باہتمام

مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈہ مین چھپی،

۱۳۶۷ھ
۱۹۴۸ء



فہرست مضامین

بزم تیموریہ



محمد شاہ
۳۰۵ - ۳۱۴

احمد شاہ
۳۱۵ - ۳۱۶

عالمگیر ثانی
۳۱۶

شاہ عالم ثانی
۳۱۶ - ۳۲۰

بہادر شاہ ظفر
۳۲۱ - ۳۴۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تیموری سلاطین رزم و بزم دونوں میدانوں کے مرد تھے، وہ جس درجہ کے فاتح و کشورکشا تھے اسی درجہ کے علم پرور اور ادب نواز بھی، وہ ترکی اور فارسی دونوں میں اور آخری دور کے بادشاہ اردو میں بھی کمال اور شعر و ادب کا نہایت بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور اس کے نکتہ سنج نقاد تھے، جیسا کہ ان کی نظم و نثر اور تذکروں کے بیانات سے ظاہر ہے،

ان کے دور میں ہنگامۂ کارزار کے ساتھ علم و ادب کی محفل بھی گرم تھی، انکا دربار ہر فن کے اصحاب کمال اور علماء و شعراء کا مخزن تھا، اور انکی سرپرستی میں بہت سے علمی و ادبی کام انجام پائے لیکن اس زمانہ میں تاریخ نویسی کا مذاق ایسا تھا کہ مورخین سارا زور قلم فتوحات اور کشورکشائی کی داستان سرائی میں صرف کر دیتے تھے، اور علم و ادب کے حالات کی جانب انکی توجہ کم رہتی تھی، تاہم اس دور کی تاریخیں انکے ذکر سے یکسر خالی بھی نہیں ہیں لیکن رزم کے مقابلہ میں بزم کے نقوش اسقدر دھندلے اور پراگندہ ہیں کہ ان سے انکا پورا مرقع نظر نہیں آتا،

تیموری سلاطین کی رزمیہ داستانیں تو بہتوں نے سنائی ہیں لیکن انکی انجمن آرائی کے دلچسپ افسانے بہت کم لوگوں نے سنائے ہیں، اور گو ضمناً انکی ادب نوازی کے واقعات اور ان کے عہد کے شعراء و ادباء کے متفرق حالات لوگوں نے لکھے ہیں لیکن ابتک پورے استیعاب کے ساتھ اس دور کا ادبی گلدستہ کسی نے تیار نہیں کیا ہے اس لیے دارالمصنفین میں جب تاریخ ہند کی تدوین کا کام شروع ہوا تو خیال ہوا کہ تیموریوں کے سیاسی و تمدنی حالات کے ساتھ انکی علم پروری اور ادب نوازی کا نقشہ بھی دکھایا جائے تاکہ ان کے کارناموں کا ہر رخ سامنے آجائے

چنانچہ ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے نے جنکے متعلق تاریخ ہندوستان کے بعض حصے کیے گئے تھے، اس کام کو شروع کیا، اور معارف میں تیموری بادشاہوں کے علمی ذوق کے عنوان سے مضمون کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اتنا بڑھا کہ ایک کتاب کے بقدر ہو گیا، اسلیے اسکو مستقل کتابی صورت میں شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا، اسکی نظر ثانی میں انھوں نے بہت سے اور معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے، اور اب اسکی ضخامت پہلے سے دونی ہو گئی ہے۔

تیموریوں کے عہد کے علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء اور انکے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے اسلیے اس کتاب میں صرف ان ہی لوگوں کو لیا گیا ہے جو انکے دربار سے متوسل تھے، اور انہی کا کارناموں کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموری کی سرپرستی میں انجام پائے، ان میں بھی بہت سے شعراء کو طوالت کے خیال سے قلم انداز کر دیا گیا ہے، بعض ممتاز شعراء مثلاً فیضی، طالب آملی، نظیری، کلیم اور صائب وغیرہ پر اسلیے مختصر لکھا گیا ہے کہ انکی شاعری پر مفصل تبصرہ شعر العجم میں موجود ہے، جس پر اضافہ کرنا ممکن نہ تھا، اور ان ہی کو دہرانا تحصیل حاصل تھا بعض شعراء کے کلام کے انتخاب میں قصداً اختصار سے کام لیا گیا ہے، البتہ کہیں کہیں طویل قصائد بھی نقل کر دیے گئے ہیں کہ اس دور کی قصیدہ نگاری کا اندازہ ہو سکے،

اردو زبان کی ترقی میں تیموریوں کا بڑا حصہ ہے لیکن یہ ایک وسیع موضوع تھا، اسلیے اس کتاب میں اس پر بحث نہیں کی گئی لیکن محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر تبصرہ سے اسکا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا،

بہرحال تیموری سلاطین کی علم پروری اور ادب نوازی کا یہ مرقع اصحاب نظر کی خدمت میں پیش ہے اور ان کے نقص و کمال کا فیصلہ وہی کر سکتے ہیں،

افسوس ہے کہ صحت کے اہتمام کے باوجود کتاب میں کتابت و طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی صحت کے لیے آخر میں غلطنامہ لگا دیا گیا ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں،

سید سلیمان ندوی
رمضان
۲۰ اگست ۱۹۴۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابر

بابر نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی عظیم المرتبت فاتح اور اولوالعزم بادشاہ تھا، بلکہ ارباب بصیرت نے اس کو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابل قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، وہ تیمور کی چھٹی نسل میں تھا، نہ کہ ہیں میدانِ کارزار کی پامردی و شجاعت کے علاوہ علم و ثقافت سے شیفتگی و دلدادگی بھی پائی تھی، عام طور سے تیمور کو ایک ظالم اور سفاک فاتح سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی یہ تصویر ان مورخوں نے کھینچی ہے جنھوں نے تعصب کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ ملک گیری اور کشور کشائی کی معرکہ آرائی کے ساتھ ساتھ اس نے علم فن کی انجمن آرائی بھی اسی طرح کی جس طرح ایک تاج و تخت کے مالک کو کرنا چاہیے، چنانچہ ارباب فضل و کمال خلوت و جلوت بلکہ میدان جنگ میں بھی اس کے ساتھ رہتے، تزک تیموری میں خود اس کی زبان سے ہے کہ

"محدثین و ارباب اخبار و قصص کو میں اپنے پاس بلاتا، ان سے انبیاء، اولیاء، اور سلاطین کے قصے سنتا، سلاطین کے عروج و زوال کے واقعات معلوم کرتا، ان سلاطین کے قصے اور ان کی گفتار و کردار سے تجربے حاصل کرتا، اور دنیا کی تواریخ و آثار سے

مطلع ہوتا، مشائخ، صوفیہ اور عارفان خدا سے بھی ملتا، اور ان کی صحبت سے اخروی فوائد حاصل کرتا، معرفت کی باتیں سنتا، ان کے خوارق عادت وکرامات کا مشاہدہ کرتا، اور ان کی صحبت سے سرور حاصل کرتا تھا۔۔۔۔۔۔

میرا حکم تھا کہ جو لوگ سادات وعلماء میں سے ہیں ان کا اعزاز واحترام کیا جائے، ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے، ان کے ساتھ پوری رعایت ہو۔[1]

ملفوظات تیموری میں ہے:۔

"جب میں تولمبہ پہونچا تو دریا کے ساحل پر خیمہ زن ہوا، تولمبہ ملتان سے قریب ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔۔۔۔۔۔ میرے وزراء نے تولمبہ کے باشندوں پر دو لاکھ روپے کا تاوان عائد کیا تھا، اس کی وصولی کے لیے عمال بھی مقرر ہو گئے تھے، ان باشندوں میں سادات بھی تھے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے تھے علمائے اسلام بھی تھے، جو وارث پیمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتے ہیں، سادات وعلماء میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لیے میں نے حکم دیا کہ ان سے تاوان نہ لیا جائے بلکہ میں نے بلا کر خلعت اور عربی گھوڑے عطا کیے۔"[2]

ملفوظات تیموری میں تیمور کی کشورکشائی اور جہانبانی کی کہانی خود اس کی زبانی ہے جو اس کے دربار کے ارباب علم ودانش نے قلمبند کی ہے، **تزوک تیموری** میں ملکی وحربی نظم ونسق کے ضوابط وقوانین ہیں، جو خود تیمور کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات دربار کے اہل قلم کی حاشیہ آرائی سمجھی جائے، لیکن شرف الدین یزدی نے ظفر نامہ تیمور کی وفات کے تیئس سال بعد لکھی، اس میں مرقوم ہے:

---

[1] تزوک تیموری، مطبع فتح الکریم بمبئی، ص ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲ [2] ملفوظات تیموری الیٹ، ج ۳ ص ۴۱۴

"صاحبقران کے ساتھ سفر اور حضر میں برابر سادات، علماء، فقہاء، اہل فضل و دانش بخشیان الیغور اور دبیران فارس رہتے تھے، فرمان شاہی کے مطابق وہ روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتے، صاحبقران کے افعال و اقوال، ملک و ملت کے احوال اور ارکان دولت کے کوائف بڑی تحقیق کے ساتھ حیطہ تحریر میں لائے جاتے، سخت حکم تھا کہ ہر واقعہ بغیر کسی تصرف اور اضافہ کے لکھا جائے، خصوصاً ذاتی اصالت و نجابت کے بیان میں کسی قسم کی رعایت یا مداہنت نہ ہو حتیٰ کہ صاحبقران کی شہامت و شجاعت کے ذکر میں بھی مبالغہ نہ ہو۔ چنانچہ اس حکم کو سامنے رکھکر اصحاب قلم و بلاغت واقعات کو نظم و نثر میں مرتب کرتے، یہ تحریریں صاحبقران کے سامنے پڑھی جاتیں اور وثوق کے ساتھ ان کی تصحیح ہوتی، اسی طرح ترکی اور فارسی میں وقتاً نثر اور نظم میں تالیف ہوتے، دربار کے بعض وابستگان واقعات کی تفتیش تحقیق میں پوری کوشش کرتے ......[1]

تیمور ہندوستان میں محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا تو شرف الدین یزدی کا بیان ہے کہ میدان جنگ میں ارباب کمال اور اصحاب علم اس کے جلو میں تھے۔

"در وقت تعیین مواضع سروران و اعیان مرحمت حضرت صاحبقران کہ در ہمہ حال شامل احوال اہل علم و کمال بودی از جمع علماء رفیع مقدار کہ ظفر کردار ملازم رکاب آیہ آثار بودند مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام سید جلال الحق والدین کشی و مولانا عبدالجبار پسر قاضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی ......"[2]

ہر لڑائی کے بعد فتح و نصرت کی خوشی میں تیمور علماء و سادات کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا،[3] دربار کے ایک جید عالم مولانا نظام الدین شامی نے تیمور کی فرمائش پر سادہ

---

[1] ظفرنامہ ج ۱ ص ۲۵-۲۲ و ۲۴۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۱۔ [3] ملفوظات تیموری، الیٹ ج ۳ ص ۴۷۵،

اور سلیس فارسی میں اس عہد کی ایک تاریخ لکھی، اس کا نام بھی ظفرنامہ ہے، تیمور کی وفات سے ایک سال پہلے یہ تالیف ختم ہوئی،[1] افسوس ہے کہ یہ ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی ہے،

تیمور کی یہ علم نوازی اور علم پروری اس کی نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی، تیمور کے پوتے الغ بیگ کی ہیئت دانی مشہور ہے، الغ بیگ کے دو لڑکے ممتاز شاعر اور نثر نگار تھے، بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کو بھی یہ ثقافتی دولت میراث میں ملی، بابر نے اپنی تزک میں باپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"ان کے اخلاق و اطوار یہ تھے، حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، قضائے عمری سب ادا کر دی تھی، بیشتر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے مرید تھے، اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، حضرت خواجہ بھی ان کو فرزند کہا کرتے تھے، وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، خمسین (یعنی خمسۂ نظامی و خمسہ خسرو)، مثنوی (یعنی مثنوی جلال الدین رومی) اور تاریخ کی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، شاہنامہ بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت رکھتے تھے، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے"[2]

عمر شیخ مرزا نے تاشکند کے مشہور چغتائی خان یونس خان کی لڑکی قتلق نگار خانم سے بھی شادی کی، اس کی ایک بڑی وجہ یونس خان کی علم دوستی بھی تھی، بابر قتلق نگار خانم ہی کے بطن سے تھا، یونس خاں کی ایک اور لڑکی خوب نگار خانم محمد حسین گورگان دغلت کے حبالۂ عقد میں آئی، اس سے ایک لڑکا حیدر میرزا دغلت تھا، جو تاریخ رشیدی کا مصنف ہے حیدر مرزا دغلت

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ (فارسی) ج ۱ ص ۱۷۰، [2] اردو تزک بابری مترجمہ میرزا نصیر الدین حیدر گورگانی ص ۱۰

اپنے نانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"خان (یعنی یونس خان) مولانا شرف الدین علی یزدی کے ساتھ بارہ سال رہے، اور فضائل کا کسب کیا، ان کے ایسا خان ان سے پہلے اور بعد میں نہیں پیدا ہوا، جب مولانا کا انتقال ہوگیا تو خان یزد سے عراق، فارس اور آذربائیجان کی طرف چلے گئے، شیراز میں فضلاء کی مجلسوں میں شریک رہے، یہاں وہ استاذ یونس کے نام سے مشہور ہوئے...... ان میں بہت سے فضائل تھے، قرآن کی قرارت خوب کرتے تھے، موزوں طبیعت بھی رکھتے تھے، موسیقی اور مصوری میں بھی ماہر تھے..........[1]

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہوگا کہ بابر کے باپ اور ماں دونوں کا خاندان علمی حیثیت سے بھی متمول تھا، اس لیے اس کی ابتدائی تعلیم بلند پیمانہ پر ہوئی ہے، طفولیت سے عنفوان شباب کے زمانہ تک اس کے جو اتالیق اور اساتذہ مقرر ہوئے، ان کے نام شیخ مزید بیگ، بابا قلی علی خدائی بیرڈی) بیگ، اور خواجہ مولانا قاضی عبداللہ تھے، شیخ مزید بیگ کا ذکر بابر اپنی تزک میں اس طرح کرتا ہے:۔

"شیخ مزید بیگ میرے پہلے اتالیق تھے، ان کے قاعدے اور قرینے بہت اچھے تھے، وہ بابر مرزا (ابن بایسنغر میرزا ابن شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور) کی خدمت میں بھی رہے تھے، عمر شیخ کی سرکار میں ان سے بڑا کوئی دوسرا امیر نہ تھا،[2]

بابر اپنے استاد اور پیر خواجہ مولانا قاضی عبداللہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"خواجہ مولانا قاضی کا نام عبداللہ تھا، اور عرف خواجہ مولانا تھا، باپ کی طرف سے ان کا نسب شیخ برہان الدین قلیچ تک پہنچتا ہے اور ماں کی جانب سے سلطان ایلیک ماضی تک

---

[1] تاریخ رشیدی ترجمہ ان، ایس، و، ای، ڈی، راس ص ۵، ۱۵۵ و ۴۷، [2] تزک بابری ص ۱۲ و ۱۳،

ملک فرغانہ میں اس خاندان کے لوگ پیشوا، شیخ الاسلام اور قاضی رہے ہیں، خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبید اللہ کے مرید تھے، ان ہی سے تربیت پائی تھی، مجھ کو خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے ...... مولانائے مرحوم عجیب شخص تھے، ڈر اور خوف تو ان میں نام کو نہ تھا، ایسا دلیر آدمی دیکھا نہ سنا، یہ صفت بھی ولایت کی دلیل ہے، دنیادار کیسے ہی بہادر ہوں مگر کچھ دھڑکا اور اندیشہ رہتا ہے، خواجہ اس سے بالکل پاک تھے[1]"

یہ بتانا مشکل ہے کہ ان لائق اتالیق اور اساتذہ کی نگرانی میں بابر کے ابتدائی درس میں کون کونسی کتابیں تھیں، مگر تزک میں اس نے کلام پاک، سعدی کی گلستاں و بوستاں، فردوسی کی شاہنامہ، نظامی اور خسرو کے خمسے، شرف الدین علی یزدی کی ظفرنامہ، اور ابو عمر منہاج الجوزجانی کی طبقات ناصری کا جا بجا ذکر ہے، اس لیے قیاس بلکہ صحیح قیاس ہے کہ خاندانی روایات کے مطابق یہ کتابیں اس کی ابتدائی تعلیم کے درس میں ضرور رہیں، بابر کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس زبان کے علاوہ اس نے عربی اور فارسی کی بھی پوری تعلیم پائی، جیسا کہ مندرجۂ بالا کتابوں کے نام سے ظاہر ہے،

بابر سن شعور کو پہنچا تو آبائی مملکت کو علوم و فنون کا گہوارہ پایا، سمرقند، فرغانہ، خراسان، اور خصوصاً شہر ہرات ارباب فضل و کمال سے پر تھا، بابر نے ان مقامات کے علماء و شعراء سے بالواسطہ اور بلا واسطہ کسی نہ کسی طرح سے استفادہ ضرور کیا ہے، بچپن کے زمانہ میں اس نے مولانا عبد الرحمٰن جامی علیہ الرحمہ کی شہرت سنی تھی، اور جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو مولانا جامی کا وصال ہو چکا تھا، مگر ان کی ذات سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اپنی تزک میں ان کا ذکر کرتا باعث برکت سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں علوم ظاہر و باطن میں اپنا نظیر نہ رکھتے

[1] تزک بابری ص ۲۶ و ۵۵، بابا قلی علی اور بغدادی ہروی بیگم کے ذکر کے لیے دیکھو تزک بابری ص ۱۲ و ۳۳،

تھے، اور جوش عقیدت میں ان کے مزار کی زیارت کو بھی گیا،

بابر شیخ الاسلام سیف الدین احمد سے بھی متاثر تھا، وہ ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد میں سے تھے، ترکستان سے آکر خراسان کے شیخ الاسلام ہوئے، ان کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ نہایت سمجھدار تھے، علم معقول و منقول سے خوب واقفیت رکھتے تھے، بڑے پرہیزگار اور متدین عالم تھے، شافعی تھے، مگر ہر مذہب کی رعایت کرتے تھے، ستر برس تک انھوں نے جماعت کی نماز ایک روز بھی ناغہ نہیں کی، بابر ملا شیخ حسن کے علم کلام کا بھی قائل تھا، اس کی رائے میں وہ حکمت، معقول اور علم کلام کے بڑے ماہر تھے، تھوڑے لفظوں میں بڑے بڑے مضامین کا بیان کرنا ان کے اختراعات میں سے تھا، ان کا ثانی کوئی نہ تھا، اجتہاد کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے، مگر اجتہاد نہ کرتے تھے، علم حدیث میں بابر میر جمال الدین محدث کا قدر دان تھا، ان کے بارے میں وہ رقمطراز ہے کہ "خراسان میں علم حدیث کا جاننے والا ان جیسا کوئی نہ تھا" عربی ادب میں بابر میر عطاء اللہ مشہدی کا معترف تھا، جس نے علم قافیہ میں ایک فارسی رسالہ لکھا تھا، اس کا ایک رسالہ صنایع بدایع بھی تھا جس میں شعر کے صنائع پر بحث ہے، بابر کو یہ رسالہ بہت پسند تھا، علم فقہ میں بابر قاضی اختیار کا قائل تھا، جنھوں نے فقہ میں ایک "عمدہ" رسالہ بھی تصنیف کیا تھا،

بابر نے اپنے ہم عصر شعراء سے بھی براہ راست یا غائبانہ مراسم رکھے، اور ان کے کلام کا مطالعہ عمیق نظروں سے کیا، ان شعراء پر اس نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے اس سے اس کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے بلند ذوق کا اندازہ ہوگا، مثلاً علی شیر بیگ نوائی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

علی شیر بیگ بے نظیر آدمی تھا، ترکی زبان میں شعر کہا کرتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کیا کہے گا، اس نے چھ مثنویاں لکھیں پنج تو خمسہ کے جواب میں ہیں اور ایک منطق الطیر
۱
کے وزن پر لسان الطیر لکھی ہے، غزلوں کے چار دیوان مدون کئے ہیں، ترکی کے کلام میں بہت

غرائب الصغر، نوادر الشباب، بدائع الوسط، فوائد الکبر ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں جو ان سے کمتر درجہ کی ہیں، مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے طرز پر ایک انشا بھی لکھی ہے، جو خطوط جن کے نام لکھے تھے، وہ جمع کر لیے ہیں، ایک کتاب میزان الاوزان نام فن عروض میں لکھی ہے اس میں گڑبڑ بہت کی ہے، رباعی کے چوبیس وزن میں سے چار وزن غلط لکھے ہیں، بعض بحروں کے اوزان میں بھی غلطی کی ہے، جو شخص اس کو دیکھے گا جان جائے گا، ایک دیوان فارسی میں بھی لکھا ہے، فارسی میں فانی تخلص ہے، اس کے بعض اشعار برے نہیں ہیں، ہزار گرے ہوئے ہیں، فن موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں، عمدہ نقش اور پیشرو بنائے ہیں، اہل فضل اور اہل ہنر کا قدر دان و مربی علی شیر بیگ جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے۔"

ایک اور شاعر شیخم بیگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

اس نے اپنا تخلص سہیلی رکھا تھا، اس لیے شیخ سہیل مشہور ہو گیا، اس قسم کا شعر کہتا تھا جس میں ڈراونے الفاظ اور معانی ہوں، اس کے اشعار میں سے ایک شعر ہے:

شب غم گرد باد آہم ز جا می برد گردوں را
فرو برد اژدہائے سیل اشکم ربع مسکوں را

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس شعر کو مولانا عبدالرحمٰن جامی کے سامنے پڑھا، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ صاحب! آپ شعر کہتے ہیں یا آدمی کو ڈراتے ہیں، اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا، اور مثنویاں بھی لکھی ہیں،

اختصار و ایجاز اور جامعیت کے ساتھ بابر نے اور شعراء پر جو تنقیدیں کی ہیں ان کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں،

شاعروں میں ایک آصفی تھا، وزیر زادہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا تخلص آصفی رکھا،

اس کے اشعار بامعنی اور رنگین ہیں، عشق و حال دونوں ہیں کورا تھا، اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنا کلام کبھی جمع نہیں کرتا، شاید یہ دعویٰ بناوٹی ہو، کہتے ہیں کہ اس کا کلام انیسی اسفرائی نے جمع کیا ہے، غزل کے علاوہ اور صنعت میں شعر کم کہتا تھا، میں جس زمانہ میں خراسان گیا ہوں اس زمانہ میں مجھ سے ملا تھا، ایک بنائی تھا ہری کا رہنے والا، اس کے باپ کا نام استاد محمد بنا (معمار) تھا، اسی مناسبت سے اس نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا، اس کی غزلوں میں رنگ اور حال دونوں باتیں ہیں، اس نے دیوان مرتب کر لیا ہے، مثنویاں بھی کہی ہیں، ایک مثنوی میوہ کے تلازمہ میں لکھی ہے، جس کی بحر تقارب ہے، لغو مثنوی ہے، ایک مختصر مثنوی بحر خفیف میں ہے، ایک اس سے بڑی مثنوی ہے بحر خفیف ہی میں، اس مثنوی کو آخر عمر میں پورا کیا ہے، .... ایک شاعر سیفی بخاری تھا .... ایک دیوان تو اس نے معمولی طرز سے لکھا ہے اور دوسرا تمام اہل حرفت کے واسطے ہے، اس میں مثالیں بہت باندھی ہیں، اس کی کوئی مثنوی نہیں ہے، اپنے اس قطعہ میں وہ کہتا ہے:

مثنوی گرچہ سنت شعراست — من غزل فرض عین می دانم

پنج بیتے کہ دل پذیر بود — بہتر از خمستین می دانم

ایک رسالہ عروض کا فارسی میں بھی لکھا ہے، اشعار اس کے کم ہیں، مگر ایک طرح وہ پرگو ہے، کم تو اس سبب سے کہ کوئی کام کی بات نہیں لکھی، اور پرگو اس لحاظ سے کہ جھکتے ہوئے فقرے، کھلے الفاظ اور اعراب کے ساتھ لکھے ہیں، .... ایک شاعر عبداللہ مثنوی گو جام کا رہنے والا ملا کا بھانجا تھا، ہاتفی اس کا تخلص تھا، خمسہ کے مقابلہ میں اس نے مثنویاں لکھی ہیں، ہفت پیکر کے جواب میں تیمور نامہ لکھا ہے، اس کی مثنویوں میں سے لیلیٰ مجنوں بہت مشہور مثنوی ہے، گو جیسی شہرت ہے ویسی اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے، ایک شعر معنی کی

تھا، غالباً اس جیسا معما کسی نے نہ کہا ہو، اس کی عمر معما ہی کہنے میں گزری ہے عجیب فقیر مزاج،
نامراد اور بے بدل آدمی تھا، ایک ملا محمد بدخشی تھا، اشکمش کا رہنے والا، جو داخل بدخشان نہیں
ہے، مگر تعجب ہے کہ تخلص بدخشی تھا، اس کے اشعار مذکورہ بالا شعراء کے اشعار کے برابر نہ تھے،
فن معما میں اس نے رسالہ لکھا ہے، اس کا معما عمدہ نہیں ہے، البتہ خوش صحبت آدمی تھا۔
سمرقند میں مجھ سے ملا تھا، ایک یوسف بدیعی فرغانہ کا رہنے والا تھا، قصیدہ خاصہ کہتا تھا،
ایک آہی تھا، غزل اچھی کہتا تھا، صاحب دیوان تھا، ایک محمد صالح تھا، اس کی غزلوں
میں چاشنی ہوتی تھی، مگر بندش اس چاشنی کے برابر نہ ہوتی تھی، ترکی میں بھی شعر کہتا تھا،
اور برا نہ کہتا تھا، آخر میں شیبانی خان کے پاس آگیا تھا، وہاں تھوڑی بہت قدر ہو گئی تھی،
ترکی زبان میں شیبانی خان کے نام پر ایک مثنوی لکھی ہے، لیلیٰ مجنون وزن رمل مسدس
میں جو وزن سبحہ ہے، یہ مثنوی سست اور گری ہوئی ہے۔ .... ایک شاعر شاہ حسین
کامی تھا، اس کے اشعار برے نہیں ہیں، غزل گو تھا، غالباً اس کا دیوان بھی ہو، ایک مثنوی
بھی اس نے لکھی ہے، ایک ہلالی تھا، دیوان کے علاوہ اس کی ایک مثنوی بھی ہے،
اگرچہ اس کے اور اشعار ایک انداز کے ہیں، مگر اس مثنوی کا مضمون اور بندش دونوں
خراب ہیں، پچھلے شاعروں نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں عاشق کو مرد اور معشوق
کو عورت باندھا ہے، اس نے ایک فقیر کو عاشق بنایا ہے، اور بادشاہ کو معشوق، جو اشعار
بادشاہ کے اقوال اور افعال کے لکھے ہیں، ان میں سراسر فحش ہے، اپنی مثنوی لکھنے کے لیے
ایک بادشاہ کی نسبت ایسا لکھا ہے کہ فواحش کی نسبت بھی نہیں لکھا جاتا، اس کا حافظہ بہت
قوی تھا، چالیس ہزار شعر یاد تھے، کہتے ہیں کہ اکثر خمستین کے اشعار یاد کر لیے تھے، علم
عروض وقافیہ میں اس کی بڑی شہرت تھی، اس کے اشعار برے نہیں ہیں صاحب

دیوان بھی ہے۔"[۵۱]

تزک بابری | بابر نے اسی طرح اور دوسرے شعراء پر بھی اپنی وقیع رائے کا اظہار کیا ہے، جس کو ہم یہاں پر طوالت کی خاطر نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں، اس کے علمی ذوق میں مذکورۂ بالا فضلا کی صحبت اور شعراء کے مطالعۂ کلام سے جو جلا ہوئی اسی کا نتیجہ اس کی **تزک بابری** ہے جس کا شمار آج بھی دنیا کے بہترین علمی اور تاریخی سرمایہ میں کیا جاتا ہے، اور ہر ملک کے ارباب کمال نے بڑے ذوق و شوق سے اپنی اپنی زبانوں میں اسکے ترجمے کئے ہیں، یہ کتاب بابر نے اپنی مادری زبان ترکی میں لکھی تھی، گو ترکی کسی زمانہ میں اعلیٰ قسم کی علمی زبان نہیں رہی، لیکن بابر نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے اس زبان میں بھی ایسا سلیس، لطیف اور شگفتہ طرز بیان اختیار کیا کہ اس کی کتاب ارباب علم و فن کے لیے جاذب توجہ ہو گئی اور اس کے ترجمے میں پڑھنے والے کو وہی لذت محسوس ہوتی ہے، جو ترکی جاننے والوں کو اصل کتاب میں ملتی ہوگی، ابوالفضل مؤلف اکبر نامہ بلاشبہہ دنیا کے اعلیٰ انشا پردازوں میں ہے، وہ تزک بابری کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے،

"و واقعات خود را از ابتداے سلطنت خود تا حالِ ارتحال از قرارِ واقع بعبارت فصیح و بلیغ نوشتہ اند،

پھر اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں میں رطب اللسان ہوتا ہے،

دستور العملیست بجہت فرمانروایان عالم، و قانونیست در آموختن اندیشہای درست و فکرہاے صحیح براے تجربت پذیران و دانش آموزانِ روزگار، و آں دستور العمل دولت و اقبال را بموجب حکم جہاں مطاع شہنشاہی بتاریخ سی و چہار الٰہی و قتیکہ رایات عالیات

---

[۵۱] تزک بابری ص ۸۶، ۱۴۴، ۱۴۸، ۱۷۵، [۵۲] تزک بابری کے نام واقعات بابری اور بابر نامہ بھی ہیں،

از گلگشت بہارستان کشمیر و کابل مراجعت فرمودہ بود میرزا خان خانخانان بن بیرم خاں بفارسی ترجمہ نمود تا فیض خاص الخاص آن بعموم تشنہ لبانِ رشحات سعادت فائز شود، و گنج پنہاں اور نظر تہی دستانِ دانش آشکارا گردد۔[۵]

ممکن ہے کہ تزک بابری کی یہ مدح سرائی بابر کے پوتے کے ایک درباری مورخ کی محض خوشامد پہ محمول کی جائے، مگر موجودہ دور کے یورپین مصرین اور ناقدین نے اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی تعریف و توصیف کی ہے، حالانکہ وہ مسلمانوں کے کسی علمی اور تاریخی کارنامہ کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے ہیں، ہنری ایسٹ لکھتا ہے:۔

بابر کی تزک ان سوانح عمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی کہی جا سکتی ہیں.....

....یہ کسی طرح سے (expedition of xenophon) سے کمتر درجہ کی نہیں

) Commentaries of Caesar سے کچھ ہی کم ہو سکتی ہے!

یہی انگریز اہل قلم آگے چل کر تحریر کرتا ہے!

یہ کتاب نہ صرف تاریخی واقعات کے لیے اہم ہے، بلکہ اس میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ (یعنی بابر) کس قدر غیر معمولی دماغ کا آدمی تھا، اور اسکا مشاہدہ کتنا قوی تھا، موجودہ دور کے سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ بابر نے کابل، فرغانہ، اور ہندوکش کے شمالی علاقوں سے متعلق جو بیانات قلمبند کئے ہیں وہ اپنی صداقت اور تفصیلات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہیں، اور ان میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے۔ اس ملک میں ۱۵۲۵ء میں وہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا، اس نے یہاں جو کچھ

[۵] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۸

دیکھا اور پایا اس کو پچیس صفحوں میں تحریر کیا ہے، اس ملک کے نہ صرف حدود اربعہ، آبادی، آمدنی، ذرائع آمدنی وغیرہ کا صحیح صحیح حال لکھا ہے، بلکہ یہاں کے پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں، چوپایوں، اور آبی جانوروں کے عادات و خصوصیات سے متعلق اتنے مفید معلومات فراہم کئے ہیں کہ موجودہ دور کے ماہرین نباتات و حیوانات بھی ان سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان چیزوں کے متعلق اپنے مشاہدات کا ذکر کرتا ہے، اور پھر دوسروں سے جو کچھ سنا تھا اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے، آخر میں ان چیزوں کی ترقی کے لیے اپنے ذاتی مشورے بھی پیش کرتا ہے.......[1]

سوانح بابر مولفہ ولیم ارسکن میں اس کتاب کی خوبیاں ان الفاظ میں بتائی گئی ہیں،

بابر کی تزک اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے، جن حالات میں اس نے یہ لکھی وہ اور تعجب خیز ہے، اس میں ایک تاتاری فرمانروا کی زندگی کی جزوی تفصیلات ہیں، اس کی رائے اور اس کے جذبات بالکل فطری طور پر نظر آتے ہیں، ان میں کوئی تصنع اور تکلف نہیں، ہر چیز صفائی اور سچائی سے لکھی گئی ہے، طرز تحریر سادہ اور مردانہ ہے، اسی کے ساتھ شگفتہ اور دلآویز بھی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو غیر معمولی ذہانت اور مشاہدہ کی قوت رکھتا ہے، وہ اپنے ہم وطنوں اور معاصروں کے خد و خال، عادات و اطوار، افعال و اعمال کی تصویر ایسی صفائی کے ساتھ کھینچتا ہے جیسے کوئی کچھ آئینہ میں دیکھ رہا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب ایشیا کی تاریخی تالیفات میں اپنی مثال آپ ہے، ایشیا کے عام مورخین اکابر کے اعمال و حرکات کا ذکر تو پرشکوہ طریقہ پر کرتے ہیں، لیکن ان کے عادات و اطوار کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگوں کا ذکر مطلق نہیں کرتے

[1] تاریخ ہند، ہنری ایلیٹ ج ۴ ص ۲۲۰، ۲۱۸

ہیں لیکن بابر ہر فرد کی شکل وصورت، پوشاک، طور اور طریقے اس خوبی اور سچائی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ہم اپنے کو ان اشخاص کے درمیان کھڑا پاتے ہیں، اور ان کی تمام سیرت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔"[1]

ایس۔ایم۔ اڈورڈس نے بابر نامہ کو St. Augustine اور روسو کی Confession اور گبن اور نیوٹن کی Memoirs کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔[2] اس کا خیال ہے کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک حق، صداقت اور راستبازی پر مشتمل ہے۔ اس عہد کے مشرقی اہل قلم زیادہ تر مرصع، مسجع اور پر تکلف عبارت لکھنے کے عادی تھے لیکن بابر نے اپنی سادہ فطرت کے لحاظ سے سادہ طرز تحریر بھی اختیار کیا۔ اس کا ذہنی کمال یہ ہے کہ وہ چند الفاظ میں کسی شخص کی سیرت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتا ہے، ہرات کے سلطان حسین مرزا، پھر سلطان احمد مرزا، اور اپنے باپ کے درباری امرا کی جو قلمی تصویر پیش کی ہے وہ بہت ہی خوب اور قابل تحسین ہے۔[2]

ایک اور انگریز اہل قلم لکھتا ہے کہ بابر نامہ پڑھنے کے بعد غیر ارادی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ بابر کا سینہ محبت، شفقت اور انس سے لبریز تھا، اس کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے اس نے عسرت میں بھی دن گذارے اور شان وشوکت کے ساتھ شاہی تخت پر جلوہ افروز بھی ہوا، مگر اس کے طبعی ذوق میں تبدیلی کسی حال میں نہیں ہوئی، دربار کی پرشکوہ آرایش میں بھی اپنے بچپن کے ساتھیوں کو نہیں بھولا، ان میں سے بعض کو یاد کر کے اشکبار بھی ہوا، ان کی باتوں کا حوالہ اکثر دیا کرتا تھا، ان کے ساتھ بچپن میں جو کھیل کھیلتا تھا، یا جو پرلطف مجلسیں ہوتی تھیں، ان کو بار بار اپنی تحریروں میں دہراتا ہے، وہ اپنی ماں اور گھر کی عورتوں سے دور رہنے کے باوجود اپنی تزک

---

1. Life of Baber by V. Erskine ص ۵۲۳
2. Baber: Diarist and Despot by S.M. Edwardes باب چہارم

ہیں ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے جیسے وہ ان کے ارد گرد بیٹھا ہوا[1]

تزک بابری کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ تمام اہم زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے، اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خاں خانخاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ایک فرانسیسی اہل قلم M. pavel de. Courteille نے اس کو فرانسیسی میں منتقل کیا، Mrs. Leyden اور Erskine دونوں نے مل کر اور پھر A. D. Beveridge نے اس کو انگریزی جامہ پہنایا، موخر الذکر نے اپنے ترجمہ میں اتنے مفید حواشی اور ضمیموں کا اضافہ کیا ہے کہ بہت کم کتابوں کو یہ خوبیاں میسر ہوئی ہونگی، روس کی اورینٹیل اکیڈمی نے روسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اردو قالب میں اس کو مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی نے تبدیل کیا،

بابر کی شاعری | بابر ایک اعلیٰ قسم کا ادیب ہونے کے ساتھ ترکی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا حیدر دوغلت مؤلف تاریخ رشیدی کا بیان ہے کہ میر علی شیر بیگ نوائی کے بعد ترکی شاعروں میں کوئی اور بابر کا مدمقابل اور ہمسر نہ تھا، فرشتہ رقمطراز ہے کہ

"در علم موسیقی و شعر و انشاء و املا نظیر نداشت"[2]

اکبر نامہ میں ہے:

"آں حضرت را در نظم و نثر پایۂ عالی بود، خصوصاً در نظم ترکی، و دیوان ترکی آں حضرت در نہایت فصاحت و عذوبت واقع شدہ، و مضامین تازہ دراں مندرج است"[3]

بابر کا ایک دیوان شاہی کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، اس دیوان کے علاوہ اس نے

---

[1] الفنسٹن، تاریخ ہندوستان ج ۲ صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۷

[2] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱ [3] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۰

۹۲۸ھ میں ترکی زبان میں ایک مثنوی مبین بھی اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، اسی لیے یہ درفقہ مبین اور فقہ بابری کے نام سے بھی موسوم ہے اس کی ایک شرح بھی شیخ زین نے لکھی تھی[1]، بابر کی منظوم تالیفات میں ایک رسالہ والدیہ بھی ہے، یہ رسالہ اس کے استاد اور مرشد خواجہ عبید اللہ احراری کی تصنیف ہے، بابر نے ترکی میں اس کا منظوم ترجمہ کیا، جن حالات میں اس نے یہ رسالہ ہندوستان کے قیام کے زمانہ (۹۳۵ھ) میں ترجمہ کیا ہے وہ خود اس کی زبان سے سننے کے لائق ہیں

"جمعہ کے دن تئیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی، ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا، بہت دیر تک بیچینی رہی، دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا، کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا، اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت کو مقبول ہو، اس کے قبول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح قصیدہ بردہ مقبول ہوا، اور اس کا کہنے والا مرض فالج سے اچھا ہو گیا، اسی طرح میں بھی تندرست ہو جاؤں، اسی نیت سے وزن رمل، مسدس مخبون وضرب کبھی ابتر کبھی مخبون محذوف میں جس میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کا سبحہ بھی ہے رسالہ نظم کرنا شروع کیا، اسی رات میں تیرہ شعر لکھ ڈالے، بطریق التزام ہر روز دس بیتوں سے کم نہ لکھیں، شاید کوئی دن ناغہ ہوا ہو، اگلے سال بھی اور کئی بار اور کبھی ایسا بخار کم سے کم چالیس دن تک رہا ہے، خدا کی عنایت اور حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن انتیسویں کو ذرا افاقہ ہو گیا، اور پھر صحت ہو گئی، ہفتہ کے دن ربیع الاول کی انتیسویں [illegible] نظم تمام ہو گئی، ایک دن باون شعر ہوئے"[2]

---

[1] بابرنامہ مترجمہ مسز اے۔ ایس۔ بیورج ص ۶۲۰، [2] تزک بابری اردو ص ۳۳۶

بابر نے رسائل عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر بھی ایک کتاب لکھی[۱] اسکا سنہ تالیف شاید ۹۳۳ھ ہے[۲]

بابر نے اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کیا ہے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے پھر بھی جو کچھ ہیں ان کو اساتذۂ فن نے نگاہ تحسین سے دیکھا ہے، ابوالفضل نے اکبرنامہ میں لکھا ہے، کہ "ہمچنیں بزبان فارسی نیز اشعار دلپذیر دارند" (جلد اول ص ۱۱۸) تزک بابری اور دوسری کتابوں میں جو اس کے فارسی اشعار ملے ہیں ان کو ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

۹۱۵ھ میں بابر نے اپنے ہم جلیس خواجہ کلاں کو بجور کے قلعہ کی نگرانی کے لیے بھیجدیا، اسکی جدائی سے پریشان ہوا تو اس کے جانے کے دو ایک روز بعد یہ قطعہ لکھ کر اس کے پاس بھیجا،

قرار و عہد بیاران چنیں نبود مرا | گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہاے زمانہ چہ چارہ ساز د کس | بجور کرد جدا یار را ز یار آخر

قلعہ بجور کے نام کی رعایت سے آخر شعر میں لفظ بجور نے قطعہ کو پرلطف بنادیا ہے،

پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر غیر ملکی ماحول سے پریشان تھا، اجنبی حریف کی اجنبی زبان سے اس کے ساتھی بھی کچھ بددل تھے، گھبرا کر اس نے ایک شعر کہا

شدہ جمعے وبود جمعے پریشاں | گرفتار قومے و قومے عجائب

بیانہ کے قلعہ کی تسخیر کے موقع پر بابر نے اس کے حاکم نظام خان کو وعدہ وعید کے فرمان بھیجے، اور اس فرمان پر فی البدیہہ یہ قطعہ بھی لکھ بھیجا، جس میں بیانہ اور بیان کی رعایت لفظی ملاحظہ ہو

باترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ | چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش | آنجا کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است

---

[۱] طبقات اکبری ج ۲ ص ۳۷، [۲] بابرنامہ مترجمہ مسز بیورج ضمیمہ جات ص ۰۰، [۳] ایضاً ج ۲،

۹۳۴ھ میں بابر نے چندیری فتح کیا، تو اس فتح کی تاریخ کا مادہ "فتح دار الحرب" نکلا، بابر نے اس کو یوں موزوں کیا،

بود چندے مقام چندیری　　پر ز کفار و دار حرب بی ضرب
فتح کردم بحرب قلعۂ او　　گشت تاریخ فتح دار الحرب[1]

تزک بابری میں جابجا ایسے فارسی اشعار ہیں جن پر گمان ہوتا ہے کہ وہ بابر ہی کے ہیں، مگر ان پر کامل وثوق نہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل کرنے سے ہم گریز کرتے ہیں، تاریخ فرشتہ میں ہے کہ بابر نے کابل میں ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض کھدوایا تھا، یہاں اپنے خوش طبع دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی بزم منعقد کرتا تھا، اسی مناسبت سے ایک شعر کہکر حوض پر کندہ کرایا تھا، وہ شعر یہ ہے:

نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست[2]

یہ شعر آج بھی پرکیف مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بابر کا یہ شعر بھی منقول ہے:

باز اے ہمائے کہ بے طوطی خطت　　نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

ابوالفضل کو بابر کے یہ دو مطلع بہت پسند تھے،

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم (۱)　　وگرنہ رفتن ازیں شہر می توانستم
تا بزلفت سیہش دل بستم (۲)　　از پریشانی عالم رستم

اکبر نامہ میں بابر کی یہ رباعی بھی منقول ہے،

درویشاں را گرچہ نہ از خویشانیم　　لیک از دل وجاں معتقد ایشانیم

[1] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۴۳۳، ۴۹۲، ۲۹۴، ۳۲۰، ۲۲۰۔ [2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱،

دوراست گوی شاہی از درویشے　　شاہیم ولے بندۂ درویشانیم[۱]

درویشوں سے بابر کی یہ عقیدت اس ذوق و تصوف کی بنا پر تھی جو اس نے اپنے مرشد حضرت خواجہ علیہ اللہ کی صحبت میں حاصل کیا، چنانچہ شیخ کے وصال کے بعد شیخ کا تصور کر کے کہتا ہے :-

در ہوائے نفس گمرہ عمر ضایع کردہ ایم　　پیش اہل اللہ ز افعال خود شرمندہ ایم

یک نظر با مخلصان خستہ دل فرما کہ ما　　خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

حسب ذیل دو شعر میں بابر یا تو اپنے مرشد کی طرف سے مذکورہ بالا اشعار کا جواب دیتا ہے یا اپنے شیخ کو پھر مخاطب کرتا ہے،

اخلاص و عقیدۂ تو روشن شدہ است　　حالات و طریقہ ات مبرہن شدہ است

حایل چو نماند زود برخیز و بیا　　دل خواہ تو ترتیب معین شدہ است

تذکرۂ مرآۃ الخیال (ص ۹۰) میں بابر کی یہ غزل منقول ہے

در دور ما ز کہنہ سواران یکے ے است　　واں کو دم از قبول نفس می زندنے است

ایں سلطنت کہ ماز گدا ایش یافتیم　　دارا ند اشت ہرگز و کاؤس رکے است

وانی کمان ابرو کجانان سیہ چرا است　　کز گوشہا ش دو دو دل خلق در پے است

دارد بزلف او دل زنار بند ما　　سودائے کفر و کافری وہرچہ در وے است

بابر رسید نالہ زارت بگوش یار　　مجنوں وقوف یافت کہ لیلی دریں مے است

بابر نے اپنی ایک بزم ادب کی بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز تصویر کھینچی ہے،

نماز سے پہلے بدہ سرا میں آئے، آفتاب نکلے لشکر والے سیر کرتے ہوئے آنے شروع

---

[۱] اکبر نامہ ج اص ۱۱۹، ۱۲۰،

ہوئے، یہ لوگ دور دراز سے نزدیک اریق میں ٹھہرے ہوئے تھے، مگر ہم کو نہ دکھائی دیے، جن میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے، جیسے شیخ ابوالوجید، شیخ زین ملا علی خاں، نردی بیگ اور خاکسار وغیرہ، اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

محبوبی ہر عشوہ گرے را چہ کند کس | جائیکہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

فرمایش کی کہ اس زمین میں کچھ شعر کہو، شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے، ملا علی خاں سے بہت ہنسی کھلی ہوتی تھی، ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؂

مانند تو مدہوش گرے را چہ کند کس | نرگاؤ کے مادہ خرے را چہ کند کس

پہلے اس سے جو کچھ اچھا برا کہتے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا جب میں ین کو نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں، اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین گذریں، افسوس ہے کہ اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں، اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا، اس شعر کے کہتے وقت اصلاً خیال نہ رہا، دو ایک روز کے بعد کبرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہو گئی، اور کھنکار میں خون آنے لگا، اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہ کس طرف سے ہے، اور یہ تکلیف کیوں ہے، فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہِ فَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا .... میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹا لیا، سچ یہ ہے کہ کسی گنہگار بندہ کے دل میں ایسے خیال کا پیدا ہونا ایک بڑی دولت ہے، جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جو بندہ اس طرح متنبہ ہو جائے وہ اس کو سعادت عظمیٰ سمجھے، (ص ۵۴، ۲۵۳)،

خط بابری | بابر نے اپنی جودت طبع سے ایک خاص قسم کا خط اختراع کیا، جو شاید خط نسخ کی کہ

شکل تھی، اسی خط میں ایک کلام مجید لکھکر مکہ معظمہ بھیجا، منتخب التواریخ میں ہے:-

واز جملہ غرایب و اختراعات آن شاہ مغفرت پناہی خط بابریست کہ مصحفی بدان خط نوشتہ و بمکہ معظمہ فرستادہ[1]

تزک بابری میں اس خط کا جا بجا ذکر ضرور ہے، مگر کہیں اس کی تفصیل نہیں، بابر نے اس خط کو سنہ ۹۱۰ھ میں ایجاد کیا، مگر اس کا لکھنا آسان نہ تھا، اس لیے مقبول نہ ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ عہد اکبری میں یہ خط مفقود ہو چکا تھا، مگر خوشنویسی کے اساتذہ اس خط میں لکھنا کمال فن سمجھتے تھے، اکبر کے دور حکومت میں میر عبدالحئی مشہدی اس خط کا باکمال استاد تھا،

بابر کے دربار کے فضلاء و شعراء

بابر نے جن ارباب علم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، ان کے علاوہ اس کے دربار میں ممتاز فضلاء و شعراء کی بھی ایک جماعت تھی، جو برابر اس کی معیت میں رہتی تھی، ان میں سے بعض کے مختصر حالات ہم یہاں پر درج کرتے ہیں،

شیخ زین الدین: صدارت کے عہدہ پر فائز تھے، معقولات و منقولات میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، واقعات بابری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، بابر ان کی فارسی انشاء پردازی کا معترف تھا، اس نے جب رانا سانگا پر فتح پائی تو اس خوشی میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا، اس کے لیے شیخ زین ہی نے فرمان لکھا، جو تمام قلمرو میں بھیجا گیا، اس فتح پر بابر نے شیخ زین سے ایک فتحنامہ بھی لکھایا، اس سے بابر کی فوج کی کیفیت، ہندوؤں کے لشکر کی حالت، اور دونوں کی صف آرائی اور معرکہ آرائی کے طریقے مفصل طور سے معلوم ہوتے ہیں، بابر نے دونوں فرامین کو اپنی تزک میں شامل کر دیا ہے[2]، شیخ زین نے بابر کی مثنوی مبین

---

[1] منتخب التواریخ مولفہ عبدالقادر بدایونی جلد اول ص ۳۴۳، [2] ایضاً جلد سوم ص ۲۷۳،

کی ایک شرح بھی لکھی، بابر کی فتح ہندوستان کے متعلق ایک تاریخ بھی قلمبند کی، وفائی تخلص رکھتے تھے، منتخب التواریخ میں ان کے اشعار درج ہیں، جن میں دو رباعیاں یہ ہیں،

آزمیدی بر قیباں و رمیدی از ما (۱) ما چہ کردیم و چہ دیدی چہ شنیدی از ما

بہ حال بردن ما حاجت بیداد نبود می سپردیم اگر می طلبیدی از ما

غم گریباں گیر شد سر در گریباں چوں کشم (۲) شوق دامنگیر آمد پا بداماں چوں کشم

اے گریبانم ز شوقت پارہ دامن چاک چاک بے تو پا در دامن و سر در گریباں چوں کشم

بابر کی وفات سے تین سال پہلے ۹۴۲ھ میں بمقام اکبرآباد عالم جاودانی کو سدھارے، وہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اسی کے احاطہ میں دفن کیے گئے، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

صاحب کمالات صوری و معنوی بود و در معما و تاریخ و در بدیہہ یافتن و شعر و سائر جزئیات نظم و نثر و انشاء بے قرینہ زمان خود بود[۱]۔

بابر کے دربار کے ممتاز فضلا میں مولانا بقائی بھی تھے، ایک مثنوی مخزن کی زمین میں لکھکر بابر کی خدمت میں پیش کی،

مولانا شہاب الدین علم و فضل، شعرگوئی خصوصاً معماگوئی میں بلند پایہ رکھتے تھے، کلام پاک اور حدیث پران کی نظر وسیع تھی، شاعر بھی تھے، تخلص حقیر تھا، شاعری کے کچھ نمونے منتخب التواریخ (مولفہ عبدالقادر بدایونی) کی جلد اول (ص ۳۴۲) میں ملیں گے، ۹۴۲ھ میں وفات پائی، میر آخوند نے "شہاب الثاقب" سے تاریخ وفات نکالی ہے،

شاعروں میں شیخ ابوالوجد فارغی، سلطان محمد کوسہ، سرخ و داعی شیخ جمالی کنبو مشہور تھے، اطبار میں میر ابوالبقا، مولانا یوسفی اور خواجہ نظام الدین علی خلیفہ اپنے علم کے لیے مشہور تھے[۲]

[۱] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، نیز دیکھو صبح گلشن مولفہ نواب سید علی حسن خاں ص ۲۵۹ [۲] ڈاکٹر ایم، اے، ج، ۲، ص ۱۱۶

یہ تمام ارباب کمال بابر کی علم نوازی کا حال سنکر خراسان، ہرات اور دوسری جگہوں سے ہندوستان آئے تھے، بابر بھی ان کی پذیرائی اور سرپرستی پورے شاہانہ انداز سے کرتا تھا، ۹۳۵ھ میں گوالیار کی مہم میں سخت بیمار ہوگیا، بیماری سے شفا پائی تو ایک جشن عشرت منعقد کیا، اس جشن میں تمام ایلچی قزلباش، اوزبک اور ہندو بھی شریک ہوئے، بابر نے ان سب کو ترازو کے پلڑے بھر بھر کر چاندی اور سونا دیا، اس موقع پر بھی سادات اور علما، کو فراموش نہ کیا، اس جشن کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے:-

> دوسرے حقداروں اور سادات کو بھی اپنی بخشش سے فیض پہنچایا، اخوند میر مؤلف حبیب السیر اور مولانا شہاب الدین معمائی اور مرزا ابراہیم قانونی جو اپنے فن کے بے نظیر استاد تھے، اور ہرات سے ہندوستان میں تازہ وارد ہوئے تھے، اس جشن عشرت میں بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوکر شاہی نوازشوں سے مالامال کئے گئے، اور جملہ مقربوں میں داخل ہوئے، (ج ۱ ص ۲۱۰)

اخوند میر کا ذکر آگے آئے گا،

کتب خانہ بابر سفر اور حضر دونوں میں کتب خانہ ساتھ رکھتا تھا[۱]، ۹۳۲ھ میں بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا، تو لاہور کے پاس غازی خاں سے متصادم ہوا، غازی خاں کو شکست ہوئی، تو بابر اس کے قلعہ میں داخل ہوا، جہاں اس کو بے شمار دولت ملی، لیکن بابر کے لیے سب سے قیمتی سرمایہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا، غازی خاں بڑا علم دوست تھا، جید عالم ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کر رکھی تھیں، بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کر لیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں اور کچھ شہزادہ کامران کے لیے کابل روانہ کیں،[۲]

۱؎ تزک بابری اردو صفحہ ۳۰۳
۲؎ تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۲۰۳

ہمایوں

ہمایوں سنہ ۹۱۳ھ ماہ ذیقعدہ میں کابل میں پیدا ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بابر اپنی قوت و اقتدار کی خاطر ایک مقام سے دوسرے مقام کو پریشان حال پھر رہا تھا، کبھی باپ کی متروکہ مملکت سے محروم ہو کر پہاڑوں کی برفانی چٹانوں پہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا نظر آتا ہے کبھی برف کاٹ کر فوج کے لیے راستہ بناتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کبھی اپنی جودت جہانگیری سے کابل کا بادشاہ بن بیٹھتا ہے، تو کبھی عزیزوں اور دوستوں کی کج ادائیوں سے اسی شہر کی گلیوں میں برہنہ پا پھرتا دکھائی دیتا ہے،

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنی اولاد کی تعلیم خاطر خواہ نہ دلا سکا ہوگا، پھر بھی یہ عجیب بات نظر آتی ہے، کہ اس کی تمام اولاد علم و ہنر سے مالا مال تھی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا،

ہمایوں کی تعلیم و تربیت ہمایوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی مستقل بیان موجود نہیں، اس کی پیدائش کے تھوڑے دنوں کے بعد تزک بابری کی تحریر کچھ عرصہ تک بند رہتی ہے، جو ہمایوں کی طفولیت اور تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے، اس لیے بابر اس کے متعلق لکھنے سے قاصر رہا، تاریخوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں جب چار سال چار مہینہ اور چار روز کا ہوا تو رسم مکتب کی تقریب ادا کی گئی، اس کے اتالیق خواجہ کلاں اور شیخ زین الدین رہے، جو بابر کے درباری امرا میں سے تھے، اس کی تعلیم کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے

بابرنامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کی تالیفات اس کی اولاد کے زیر مطالعہ رہیں، ذکر آچکا ہے کہ بابر نے اپنی مثنوی مبین کامران کی تعلیم کی غرض سے لکھی تھی، بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ہمایوں کو بھی جو کامران سے صرف ایک یا دو سال عمر میں بڑا تھا، اس مثنوی کے ذریعہ سے مذہب و اخلاق کا درس نہ دیا گیا ہو، تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ مذہب و اخلاق میں ہمایوں کی تربیت اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی، وہ صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند تھا، کبھی وہ قسم نہ کھاتا اور نہ کبھی فحش لفظ زبان پر لاتا تھا، کسی سے بہت خشمگیں ہوتا تو صرف لفظ سفیہ کہہ دیتا، معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھا، اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدائے عزوجل کا نام کبھی نہیں لیا[1]، ممکن ہے کہ یہ مذہبی اور اخلاقی جلا باپ ہی کی تربیت اور اس کی تالیف کردہ مثنوی کے ذریعہ سے پیدا ہوئی ہو،

بادشاہ ہوکر ہمایوں نے جس علمی مذاق کا ثبوت دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم ویسی ہی ہوئی تھی جو ایک شہزادہ کے لیے ضروری ہوتی ہے، تمام معاصر مورخین اس کو ایک بلند پایہ شاعر اور علم ریاضی وہیئت کا ماہر و عالم بتاتے ہیں،

ہمایوں کی سخن سنجی و سخن فہمی اس کے اعلیٰ علمی مذاق کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کی تمام زندگی جنگ و جدل میں گذری، پھر بھی فرصت کے اوقات میں شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھا، گو اس کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس نے اشعار فارسی ہی میں موزوں کیے، اس کے ذوق شعر و شاعری کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں،

ہمایوں جب شیر خاں سے شکست کھاکر بے وفا بھائیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے لاہور پہنچا، تو مرزا کامران نے بہ ظاہر موافقت اور در پردہ مخالفت کی، شیر خان آگے بڑھتا چلا آرہا تھا،

[1] بدایونی ج ۱ ص ۴۶۸،

کامران نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خفیہ طور پر اس سے سازش کرلی، کہ شیر خان پنجاب لیکر اسے کابل، قندھار، اور غزنی کا تنہا مالک بنا کر چھوڑ دے، اور ظاہرا ہمایوں سے شیر خاں کے خلاف جنگ کرنے کی تدبیروں کے متعلق مشورے کرتا رہا، یہانتک کہ شیر خاں بہت ہی قریب پہنچ گیا، اور ہمایوں کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا، مرزا کامران نے شیر شاہ کے قاصد کا پرجوش استقبال کیا، اور اس کی آمد میں بڑا جشن منایا، ہمایوں نے اس موقع پر ایک رباعی کہی،

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد — پیوستہ زخویشتن جدائی باشد

خود را بنمائی غیر دیدن عجب است — ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

اور اس کو مرزا کامران کے پاس بھیجدیا، گلبدن بیگم کا خیال ہے کہ ہمایوں نے کامران کے پاس وہ رباعی نہیں بھیجی، بلکہ قاصد کے ذریعہ سے شیر خان کے پاس ارسال کی، [۱]

ہمایوں شیر خان سے ہزیمت اٹھانے کے بعد پریشان حال پھر رہا تھا، کہ اپنی پسماندہ فوج کے ساتھ جیسلمیر پہنچا، وہاں کے بیابان میں پانی کی کمی کی وجہ سے لشکری پیاس سے مرنے لگے، بمشکل ایک کنواں نظر آیا، مگر اس کنوئیں پر پانی کے لیے لشکریوں میں ایسا جھگڑا ہوا کہ بہت سے فوجی کنوئیں میں گر کر ہلاک ہوگئے، ہمایوں نے اسی وقت یہ شعر کہا

چناں ز دجا کہا گر دوں لباس دردمنداں را — کہ نے دست آستیں می یابد و نے سر گریباں را [۲]

ہمایوں ایسے موقعوں پر بہت متاثر ہوکر اشعار کہتا تھا، اور جب کبھی اپنے حال کے موافق کوئی شعر سنتا تو بے اختیار ہوجاتا تھا، جب ہندوستان کا تخت و تاج کھو کر شاہ طہماسپ کی دعوت پر ایران جارہا تھا تو ہرات میں سلطان محمود مرزا نے اس کا استقبال کیا، اور خاص طور پر جشن نشاط مرتب کیا، صابر قاق نے جو خراسان کا مشہور گویا تھا ایک غزل گانا شروع کیا، جس کا مطلع یہ تھا،

---

[۱] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۴۰ [۲] بدایوں ج ا ص ۴۳۹،

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

جب وہ اس شعر پر پہنچا،

ز رنج و راحت گیتی مرنجاں دل مشو خرم
کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

تو ہمایوں کے دل پر ایک سخت چوٹ لگی، اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے[1]،

ہمایوں نے جب سنہ ۹۵۱ھ میں ایران کی طرف رخ کیا تو شاہ طہماسپ صفوی کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ اشعار سپرد قلم کئے،

خسروا عمریست تا عنقای عالی ہمتم
قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است

روزگار سفلۂ گندم نمای جو فروش
طوطی طبع مرا قانع بارزن کردہ است[2]

دشمنم شیریست اما پشت بر من کردہ بود
این زماں از ضعف طالع رو بمن کردہ است[3]

التماس از شاہ آں دارم کہ با من آں کند[4]
آنچہ با سلماں علی در دشت ارژن کردہ است[5]

اس کے ساتھ یہ رباعی بھی تھی

اے شاہ جہاں کہ نہ فلک پایۂ تست
در دست ولایت ہمہ سرمایۂ تست

شاہان جہاں جملہ ہمای طلبند
بنگر ہما چگونہ در سایۂ تست

شاہ ایران نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا[6]

ہمای اوج سعادت بدام ما افتد
اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

---

[1] مآثر رحیمی ج ا ص ۵۰۰، کلکتہ، اکبرنامہ ج ا ص ۳۰۲، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، [2] روز روشن (مولفہ نواب صدیق حسن) میں یہ مصرع اسطرح درج ہے، ایں زماں از ناحفاظی رو بمن کردہ است [3] مخزن الغرائب ج، دارم استدعا ز شاہنشہ کہ با من آں کند، [4] مخزن الغرائب ا ر ج، بدایونی، ج ا، ص ۴۵،

[6] اکبرنامہ ج ا، ص ۲۰۵،

ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ ہمایوں جب ایران پہنچا تو اس نے شاہ ایران کو ایک رباعی بھی لکھ بھیجی، جس کا ایک شعر شاید شاہ ایران کے مذکورۂ بالا شعر کا جواب تھا،

شاہاں ہمہ سایۂ ہما می خواہند ۔۔۔ بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو[1]

شاہ طہماسپ نے ہمایوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور بھائی بنا کر اپنے یہاں رکھا، مگر امیروں اور درباریوں کو یہ بات ناگوار گذری، اور رفتہ رفتہ شاہ کے کان بھر کے ہمایوں کو اس سے برگشتہ کر دیا، ہمایوں مصیبت کا مارا تھا، بیرم خاں کی صلاح کے موافق احتیاط کو مد نظر رکھا، اسی دوران میں شاہ طہماسپ کی بہن سلطانہ بیگم اور قاضی جہاں قزوینی اور حکیم نور الدین ایسے حاشیہ نشینوں نے باہم یک رائے ہو کر یہ کوشش شروع کی کہ شاہ کے دل سے غبار کدورت دور ہو جائے، چنانچہ ایک روز سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی پڑھ کر سنائی،

ہستیم ز جاں بندۂ اولاد علی ۔۔۔ ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں سر ولایت ز علی ظاہر شد ۔۔۔ کردیم ہمیشہ ورد خود ناد علی

شاہ طہماسپ اس رباعی کو سن کر بے حد خوش ہوا، اور ہمایوں کی جانب سے اس کے دل کی کدورت جاتی رہی،[2]

اسی غریب الوطنی کے زمانہ میں ہمایوں نے تبریز کی سیر کی، عہد ماضی کے آثار قدیمہ اور سیر گاہیں دیکھیں، ان کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا اور اس وقت یہ رباعی پڑھی[3]،

افسوس کہ سرمایہ بکف بیروں شد ۔۔۔ در دست اجل بسے جگرہا خوں شد

کس نامد از آں جہاں کہ تا پرسم ازو ۔۔۔ کاحوال مسافران عالم چوں شد

۱؎ بدایونی ج ۱ ص ۴۵۵، ۲؎ فرشتہ ص ۲۱۵، ۳؎ اکبرنامہ ص ۲۲۰

ہمایوں کی قسمت نے جب ایک بار پھر ساتھ دیا تو وہ از سر نو فوج ترتیب دے کر کامران کے خلاف قندھار پر حملہ آور ہوا، اس وقت ہمایوں کا رفیق بیرم خان قلعہ قندھار کے محاصرہ میں ساتھ تھا، قلعہ قندھار بہت ہی مستحکم تھا، اس کی دیوار کا عرض سات گز تھا، اس کو تسخیر کرنا آسان نہ تھا، لیکن بیرم خاں کی سپہگری اور جوانمردی سے آخر میں یہ فتح ہوا، ہمایوں نے اس مسرت میں ایک نظم کہی اور بیرم خاں کے پاس بھیجدی، وہ نظم حسب ذیل ہے:[1]

باز فتحے ز غیب روے نمود | کہ دلِ دوستاں ازاں بکشود
شکر اللہ کہ باز شادانیم | بر رخ یار و دوست خندانیم
دوستاں را بکام دل دیدیم | میوۂ باغ فتح راچیدیم
روزِ نو روزِ بیرم است امروز | دل احباب بےغم است امروز
شاد بادا ہمیشہ خاطر یار | غم نگردد بگرد یار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ است | دل بفکر و جہالت افتادہ است
گوش خرم شود ز گفتارت | دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریم حضور شاد بہم | بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازیں فکر کار ہند کنیم | عزم تسخیر ملک سند کنیم

ہمایوں نے اس مثنوی کے حاشیہ پر حسب ذیل رباعی بھی لکھی،

اے آنکہ انیس خاطر محزونی | چوں طبع لطیف خویشتن موزونی
بے یاد تو من نیم زمانے ہرگز | اما تو بیاد من محزوں چونی

بیرم خاں نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا،

---

[1] خافی خاں حصہ اوّل ص ۱۲۵،

اے آنکہ بذاتت سایۂ بیچونی — از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی
چوں میدانی کہ بے توچوں میگذرد — چوں می پرسی کہ در فراقم چونی[1]

بیرم خاں کے ایک خط کے جواب میں ہمایوں نے یہ رباعی لکھی تھی،

اے یار لطیف طبع پاکیزہ گہر — وی عمدہ اہل فضل وارباب ہنر
بکشای نظر امید کز نور حضور — می آرمت از تیرگی ہجر بدر[2]

مقیم نامی ایک شخص کے متعلق اس نے حسب ذیل شعر کہا،

مقیم شد غم تو در دلم چہ چارہ کنم — عجب غنیمت اگر دل زسنگ خارہ کنم[3]

ہمایوں کی وفات سے کچھ دن جب قریب آئے تو ایک روز اس نے کہا کہ آج صبح کی نماز کے بعد عالم غیب نے یہ رباعی سنائی

یارب بکمال لطف خاصم گردان — واقف بحقائق خواصم گردان
از عقل جفاکار دل افگار شدم — دیوانۂ خود خوان و خلاصم گردان

اور اس کو پڑھ کر رونے لگا، ان دنوں ہمیشہ وہ کہتا کہ عالم فانی سے بوئے موت آتی ہے،
چنانچہ محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع نہایت خوشخط لکھا یا تھا،

شنیدہ ام کہ بریں طارم زراندود است — خطے کہ عاقبت کار جملہ محمود است[4]

ظاہر ہے کہ ہمایوں کے شعر وسخن کے ذوق کے سبب اس زمانہ کے شعرا شاہی
جود وکرم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہوں گے، بدایونی کا بیان ہے۔

"شعرائے بسیار نادرۂ روزگار از دامن او برخاستہ اند،،[5]

ہمایوں ان شعرا کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا، اور شعر وشاعری کی مجلسیں

---

[1] مآثر الامرا ج ۱، ص ۳۰۲ [2] ریاض الشعرا قلمی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ [3] لطائف نامہ فخری ص ۳۱۲ شائع کردہ اورینٹل کالج، لاہور، [4] اکبر نامہ ص ۳۶۳، ۳۶۲ [5] بدایونی ص ۴۶۹ ج ۱

برابر گرم رہتیں، ہمایوں کی نکتہ سنجی، دقتِ نظر اور معانی آفرینی کی جلا ان صحبتوں میں خوب ہوئی، جس کے باعث وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلا تکلف اصلاحیں دیتا تھا، ایک بار ملا حیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا،

ہمچو پروانہ بشمعے سرو کار است مرا پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یہ اصلاح دی،

می روم پیش اگر بال و پرم می سوزد

ملا حیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے[1]

جاہی تیمان نے شاہ محمد خاں شاپور والی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی، ہمایوں کے سامنے وہ ہجو پڑھی گئی:-

شاعر شاہ ہمایونم و خاک در گہ می زنند کوکبۂ شاعریم طعنہ بمہ

خسرو شوم و ابیات خوشم قبل سپہ دیدم از قحبہ زنی ظلم نہ جرم و نہ گنہ

پارۂ کاغذ اگر از ہذیاں گشتہ سیہ سوئے ہجوش اگر اندیشہ شود رو بہ

غرض آنست کہ ایں خر صفتاں ابلہ عزت و حرمت ایں طائفہ دانند نگہ

وائے آنست کہ بخیلِ شعر ابستیزد ہر کہ با ما بستیزد بہ بلا بستیزد

آخری مصرعہ کو سنکر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا کہ اس کو اس طرح پڑھو،

ہر کہ با ما بستیزد و بخدا بستیزد

ابو الفضل نے اکبر نامہ میں ہمایوں کی شاعری کے ذوق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

و توجہ عالی بہ شعر و شعرا نیز داشتند۔ و از انجا کہ طبع موزوں از خصائص فطرت سلیم است[2]

---

[1] مآثر رحیمی ص ۶۱۲ ج ۱، و اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۲۱

در خلالِ اوقات وارداتِ قدسی را (چه از حقیقت و چه از مجاز) در سلک نظم می کشیدند و

دیوان شعر آنحضرت در کتابخانہ عالی موجود است" (ج ۱ ص ۳۶۸)

ابوالفضل کو ہمایوں کی حسب ذیل رباعیاں پسند تھیں، اسی لیے اس نے اکبرنامہ میں ان کو نقل بھی کیا ہے،

اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب (۱) حال دل خود مگوے با ہیچ طبیب
کاریکہ ترا باآں جفا کار افتاد بس قصہ مشکل است و بس امر عجیب

اے دل ز حضور یار فیروزی کن (۲) در خدمت او بصدق دلسوزی کن
ہر شب بخیال دوست خرم بنشیں ہر روز بوصل یار نوروزی کن

اے آنکہ جفای تو بعالم علم است (۳) روزیکہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسد از ستم چرخ بدل مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں ہمایوں کے دیوان سے اپنی پسند کی چند غزلوں کے اشعار نقل کئے ہیں، (ص ۳۳۳ ج ۱)

گذشت از دل سرگشتہ ناوک ستمش نماند بر من دلدادہ لذت المش
بقصد کشتن عشاق گر کند میلے عجب نباشد از اخلاق و شیوہ کرمش
کراست زہرہ قرب حریم حرمت او کہ جبرئیل امیں نیست محرم حرمش
اگر بپرسش عشاق می نہد قدمے ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمش

ولہ

خوش آنکہ باخیالت عمری نشستہ بودم در شوق سرو قدت از جاے جستہ بودم
علیم مکن کہ گفتم موے ترا پریشاں در شرح جعد زلفت پیوستہ بستہ بودم

در شرح غنچهٔ او ہرگز نگفتہ حرفے — لب را دراں حکایت پیوستہ بستہ بودم
عقا کہ چوں ہمایوں در حال وصل غنچہ — با دوست در حکایت از خویش رفتہ بودم

ولہٗ

داغ عشق تو بر جبین من ست — خاتم لعل تو نگین من ست
تا نشستم چوں خاک بر در تو — پشت بام فلک زمین من ست
ہر کجا شاہ و شہریاری بود — ایں زماں بندهٔ کمین من ست
خط مشکیں بصفحہ گلفام — آیت رحمت مبین من ست

ولہٗ

من اشک رواں چو گنج قاروں دارم — گلگوں درون کیسہ زافیوں دارم

مختلف دور کے تذکرہ نگاروں نے ہمایوں کی سخن گستری کی داد دی ہے، اور اس کے پسندیدہ اشعار سے اپنے تذکروں کے صفحات مزین کئے ہیں، مرزا علاء الدولہ قزوینی نے نفائس المآثر (۹۸۲ھ) میں ہمایوں کی حسب ذیل غزلیں اور ایک رباعی نقل کی ہے،

کار من با مہوشے افتادہ است (۱) درد و غم آتشے افتادہ است
خانہ ام روشن شد از روے حبیب — پرتوے زمہوشے افتادہ است
دل مرا اے جان بہر سوی کشد — تا دلم باد لکشے افتادہ است
کام دل خواہم گرفتن ایں زماں — چوں بدستم سرخوشے افتادہ است
عقل و ہوش از من مجوئید ای بتاں — چوں ہمایوں بیہشے افتادہ است

وصف لعل تو بر زبان منست (۲) آتشے در میان جان منست

هرکه باشد بمجلس رندان — بے خود از نعره و فغان مست
آنچه در وصف حسن او گویند — جمله در شرح و در بیان مست

رباعی

اے آنکه زیاد تو دلم باشد شاد — بے یاد تو خاطرم دمے شاد مباد
روزیکه زیاد تو کنم صد فریاد — آیا ز من غمزده است آید یاد

سفینہ خوشگو مولفہ بندرابن میں یہ رباعی مرقوم ہے،

یارب که رضائے دل درویشان ده — این ریش دل شکسته را درمان ده
حد نیست که گویم این مده یا این ده — چیزے که رضائے تو در آنست آن ده

ریاض الشعراء (۱۱۶۱ھ) میں علی قلی داغستانی نے منجملہ اور اشعار کے ایک رباعی یہ بھی لکھی ہے:-

ابرو که فلک بقبضهٔ قدرت اوست — داده است ترا و چیز کان هر دو بدست
هم سیرت هم آنکه دوست داری کس را — هم صورت آنکه ترا دارد دوست

روز روشن میں نواب صدیق حسن نے ہمایوں کی شاعری کا ذکر انہیں لفظوں میں کیا ہے، احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں رقمطراز ہیں،

بادشاه بود ملکی ملکات و بجمیع فضائل و کمالات صوری و معنوی آراسته و در علوم هیات و نجوم و سائر علوم عربیه بے نظیر و مربی اهل فضل و کمال و مرجع اهل تقوی و صلاح و بشعر و شعرا مائل و خود شعر نیکو گفتے،

A History of persian Literature and Langage at the maghal court by A. Ghani.

مخزن الغرائب میں بہت سے اشعار منقول ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں،

دریا دلیم و دیدۂ ما معدن درست | گر دست ما تہی است ولے چشم ما پر است

این نہ سرو است کہ در باغ قدافراختہ است | شمع سبزیست کہ پروانۂ او فاختہ است

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صاحب دیوان بھی تھا، یہ دیوان کتب خانوں میں گم رہا، مگر اب یہ امر باعث مسرت ہے کہ استاذی المحترم جناب سید حسن عسکری صاحب زاد لطفہٗ (پروفیسر تاریخ، پٹنہ کالج، پٹنہ) نے اپنی مساعی جمیلہ سے یہ دیوان اپنے وطن مالوف کھجوا (ضلع سارن) کے کتب خانہ سے ڈھونڈ نکالا ہے، اس پر استاذی المکرم جناب حافظ شمس الدین صاحب (شعبۂ فارسی، پٹنہ کالج) نے ایک سیر حاصل مقالہ لکھکر معاصر (۳۹ئہ) پٹنہ میں شائع کیا تھا، راقم الحروف کی نظر سے بھی یہ دیوان گذرا ہے، خیال تھا کہ جناب حافظ صاحب موصوف اس دیوان کو طبع کرا کے دلدادگانِ علم و ادب کو ممنون فرمائینگے مگر ابھی تک یہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا، اس میں سے بعض چیزیں ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

ایک حمد ملاحظہ ہو:-

اے حسن تو دیباچہ مجموعۂ معنی | لامع شدہ از روے تو انوار تجلی

حاشا کہ جدا از تو تواں زیست ولیکن | دارم بخیالے ز جمال تو تسلی

در مملکت حسن توئی شاہ ولایت | کردم بولاے تو کنوں روے تولی

تا حسن تو در جلوہ گری گشت ازاں رو | وامق پے عذرا شد و مجنوں پے لیلی

حقانیت سے لبریز بہت سی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے وادی لامکاں مکانت | دور ازل و ابد زمانت

اے ہستی بے نشان مطلق — شد ہستی بے نشاں نشانت

اے آنکہ مقید زمان و زمنی — کس را بنود لائق ذاتت سخنی

جانے کہ بنی حق ثنای تو بگفت — کے شرح صفات تو کند ہیچ منی

اے خالق جملہ خلائق — تو مصدر کل و خلق مطلق

حالیتے روی نمود از لاریب — کاندر آں نہ شہادتست نہ غیب

صوفیانہ رنگ کی بھی رباعیاں ہیں مثلاً

اے آنکہ درد دخول بر خود بستی — با تو بہ و زہد عافیت بنشستی

ہرگز نکند فائدہ ایں طور ترا — از خود چو گذشتی بخدا پیوستی

مایم صفات حق مختار ودود — ظاہر شدہ از آئینۂ نور شہود

چوں یک شجریم در باغ وجود — ما فرع وجودیم و خدا اصل وجود

حمد و نعت سے ملے جلے مطالب کی بھی رباعی ملاحظہ ہو:

من ہیچ نیم ہیچ نمیدانم نام — بر فضل تو نا نیم شب و روز مدام

آنگاہ بحق حرمت مہتر لام — بر بندہ ہمایوں برساں فیض تمام

کچھ خالص نعتیہ رباعیاں بھی ہیں، مثلاً

اے سرور کائنات دراصل وجود — حقا کہ توئی حبیب حق معبود

برخیز نما جمال عالم آرا — زیرا کہ توئی ز خلق عالم مقصود

سلطان سریر انبیائی تو — خورشید سپہر اولیائی تو

ہر دم ہمہ پیرو طریق تو اند — رہ شرع بخلق رہنمائی تو

پند و موعظت پر بھی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے آنکہ طلبگار رہ حقیقی | در شیوۂ صدق و راستی صدیقی
زنہار کہ غیر حق نہ بینی ہرگز | چوں بینی تو کافر و زندیقی

خواہی کہ جہاں بطبع تو راست شود | آں چیز کہ خواستی ہماں خواست شود
باید کہ تو باطبع جہاں راست شوی | تا ہرچہ خدا خواستہ آں خواستہ شود

ہمایوں کی مزید ایک دو غزلوں کی سادگی اور خیالات کی برجستگی سے بھی ناظرین محظوظ ہوں،

حجابست از نور در پیش ما | ازاں گشتہ بیگانہ ایں خویش ما
تو شاہی وحسن و صد سلطنت | بلائیست بر جان درویش ما
ملاحت نمودی زجاں سوختی | نمک ریختی تازہ بر ریش ما
وفا می کنی وجفا می کشیم | نباشد جز ایں شیوہ و کیش ما
ہمایوں برُوے تو چوں بنگرد | حجابست از نور در پیش ما

سراسر شادی عالم بیکدم غم نمی ارزد | بنزدم عمر صد سالہ بیک ماتم نمی ارزد
غنیمت داں جوانی راکہ ایام خوشست اما | ولے با عالم پیری و پشت خم نمی ارزد
کو آں تخت سلیماں و کو آں احوال مُونسش | چہل خانہ زر قاروں بیک جو ہم نمی ارزد
بجوی جنت الماوی نبودی ایں ہمایوں را | کہ جنت ہم بسیر گردائی آدم نمی ارزد

دربار کے شعراء — اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمایوں کے دامن دولت سے بہت سے شعراء منسلک تھے، ہم ان میں سے بعض ارباب کمال کا اجمالی ذکر کرتے ہیں،

جنونی۔ مولانا جنونی بدخشاں کے بہت ہی ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھے، ہمایوں نے جب شہزادگی کے زمانہ میں اس جگہ کو تسخیر کیا، تو وہ ہمایوں سے وابستہ ہو گئے، بدخشاں کی

فتح پر ہمایوں کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس میں ذوالفقار شروانی اور سلمان ساوجی کے قصائد کی طرح بہت سی صنعتوں کو ملحوظ رکھا، اس قصیدہ کی تشبیب یہ تھی :-

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسرین لب تو جاں ۔۔۔ ہمی بینم لب تو غنچہ رنگیں شدہ خنداں

نمی گویم خط تو سبزہ و ریحاں خد تو گل ۔۔۔ شود ظاہر قد تو فتنۂ دوراں دم جولاں

ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ صنعت توشیح سے مصرعوں کے مجموعے سے یہ مطلع ہو جاتا ہے،

شہنشاہ دیں پادشاہ زماں ۔۔۔ زبخت ہمایوں شدہ کامراں

اور اگر ہر مصرع کے خط کشیدہ الفاظ کو ترتیب دیا جائے تو یہ مطلع ہو جائے گا،

رخ تو لالہ و نسرین خط تو سبزہ و ریحاں ۔۔۔ لب تو غنچہ رنگیں قد تو فتنۂ دوراں

اور اگر صنعت عکس کے ساتھ یہ شعر پڑھا جائے تو مطلع کی تشکیل اس طرح ہو جائے گی،

خط تو سبزہ و ریحاں رخ تو لالہ و نسرین ۔۔۔ قد تو فتنۂ دوراں لب تو غنچہ رنگیں

اسی طرح قصیدہ میں معما، اظہار مضمر اور تاریخ گوئی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

نادری۔ مولانا نادری سمرقند سے آگرہ آئے، ہمایوں کی قدر دانی سے ان کی غربت امارت میں بدل گئی، ملا عبدالقادر بدایونی کے قول کے مطابق وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ جید علماء کامل فضلاء اور نوادر روزگار میں سے تھے، نظمیں، رباعیاں، اور قصائد کہنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں اس کی شریعت نوازی، علم پروری اور ریاضی دانی کی داد دی ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں :-

المنۃ للہ کہ بجمعیت خاطر ۔۔۔ با عیش نشستند حریفان مخاطر

خاقان معظم شہ جم قدر ہمایوں ۔۔۔ کش ہست قوی دست دل زقدرت قادر

از دانش او دانش اصحاب بصیرت | وز بینش او بینش ارباب بصائر
نهی چو حرام است در احکام شریعت | اقبال نباید بمراعات اوامر
هر نکتهٔ حکمت که لب لعل تو فرمود | مشهور جہاں شد چو حدیث متواتر
مبنی است که شرح کتب فن ریاضی | تصنیف متین تو از ایجاز زوایہ
احصاے کمالات تو کردن نتوانم | کاندر ہمہ فنہا شدہ کامل و ماہر

مولانا نادری کا انتقال ۹۹۶ھ میں ہوا، میر امانی کابلی نے اس مصرع سے تاریخ وفات نکالی

گفتا خرد کہ رفت یکے از سخن وراں[۱]

فارغی۔ مولانا شیخ ابوالواجد فارغی بن شیخ وجیہ الدین ہرات کے رہنے والے تھے، شیخ زین الدین کے رشتہ دار تھے، دونوں عسرت سے تنگ آکر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے جہاں وہ بابر اور ہمایوں کے جود و کرم سے سیراب ہوئے، شیخ زین الدین کا ذکر بابر کے سلسلہ میں آچکا ہے، شیخ فارغی بہت ہی خوش طبع، شیریں زبان اور بذلہ سنج تھے، ہمایوں اور بیرم خان خانخاناں کی شاہانہ اور فیاضانہ توجہ سے آسودہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہوگئے تھے، مگر درویشانہ صفت کے حامل تھے، اس لیے شعروشاعری میں وہی رنگ جھلکتا ہے،

رشتۂ جمعیت اے یاران ہمدم گسلید | در پریشانی پریشا نیست از ہم گسلید
چو تیر خود کشتی از سینہ ام مگذار پیکاں را | مرا دل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

۹۴۰ھ میں بمقام آگرہ انتقال ہوا، اور شیخ زین الدین وفائی کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے،

---

[۱] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۵۷۴، [۲] ایضاً ص ۴۷۶ و صبح گلشن ص ۳۰۶ و ۳۰۵،

طاہر دکنی۔ شاہ طاہر خوندی دکنی عراق کے رہنے والے تھے، اپنے کو شاہ طہماسپ کا عزیز کہتے تھے، ہندوستان آکر ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوئے، علم نجوم کے بھی ماہر تھے، چنانچہ ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کے مطابق انوری کے تتبع میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-

حمل چہر چو آید بہ شبستان حمل | لالہ فانوس برافروزد و نرگس مشعل
کوہ از در دسر بہمن ودی آسودہ شود | شوید از ناصیہ اش ابر بہاری صندل

شاہ طاہر اہل بیت سے تعلق رکھتے تھے، ہمایوں کے دربار کے علماء سے مناظرہ میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی تو اپنے چھوٹے بھائی شاہ جعفر کے پاس دکن چلے گئے، جہاں برہان نظام شاہ اول والی احمد نگر نے ان کی بڑی پذیرائی کی، اور رسالۃ الملک کے عہدہ پر مقرر کیا، برہان نظام شاہ نے شاہ طاہر سے متاثر ہوکر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیا، شاہ طاہر کا شمار دکن کے برگزیدہ بزرگوں میں کیا جاتا ہے، ۹۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، تاریخ وفات "تابع اہل بیت بودہ" سے نکلتی ہے، فن شعر و شاعری میں ان کا کمال بدرجہ اتم تک پہنچ گیا تھا، منقبت، قصائد، اور مثنوی کہنے میں اپنی شاعری کا جوہر دکھاتے تھے[1]

ایوب۔ خواجہ ایوب ماوراء النہر سے ہندوستان آیا، باپ کا نام خواجہ ابوالبرکات فراقی تھا، جو فضیلت اور علمی پایہ کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، وہ سلمان ساوجی کی تقلید میں قصائد کہتے تھے، بابر کے زمانہ میں ہندوستان آئے، اور اس کے خوان کرم سے متمتع رہے، ہمایوں نے بھی ان کی قدردانی کی اور ان کے لڑکے خواجہ ایوب کو ندیم خاص بنایا، خواجہ ایوب میں فن شاعری کے تمام کمالات موجود تھے، مگر وہ اوصاف حمیدہ

---

[1] منتخب التواریخ ج ا ص ۴۸۳۔

حاصل نہ تھا، ہمایوں نے اس کی طبیعت کی کجروی کے سدباب کے لیے شاہی بیگمات میں سے ایک کو اس کے حبالۂ عقد میں بھی دیا، مگر طبیعت اصلاح کی طرف مائل نہ ہوئی، ہمایوں نے بالآخر حج کعبہ کے لیے روانہ کیا، مگر اس سعادت سے بھی وہ محروم رہا، اور راستہ سے لوٹ کر سلطان بہادر گجراتی کا وظیفہ خوار ہو گیا، جس نے اس کی مزاج داری بھی کی، شاعری میں تخلص کبھی ایوب اور کبھی فراقی کرتا تھا، ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

اے شاخ گل کہ ہمچو سہی قد کشیدہٗ　　بر گرد لب خطی ز زمرد کشیدہٗ

قدرت برآمدہ چو الف مد ظطہ　　وز ابروان فراز الف مد کشیدہٗ

بر حرف دیگران زدہٗ قرعۂ قبول　　بر حرف عاشقاں قلم رد کشیدہٗ

تشویش میکشی مکش اے نقشبند چین　　تا یدچو چشم و زلفش اگر صد کشیدہٗ

از دولت وصال فراقی طمع ببر　　جور و جفائے یار چو بے حد کشیدہٗ

کاہی۔ قاسم کاہی عرف میاں کالے، کابل سے ہمایوں کے عہد میں ہندوستان آیا، مختلف علوم و فنون مثلاً تفسیر، کلام، تصوف، ہیئت، موسیقی اور شاعری میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا، ہمایوں کی نظر میں بڑی محبوبیت حاصل کی تھی، چنانچہ اس نے ہمایوں کی شان میں بہت سے قصائد اور قطعات کہے ہیں، ایک قصیدہ میں ہمایوں کے ذوق ہیئت کی بھی ترجمانی کی ہے، فن شاعری میں معما اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل کی تھی، وہ اپنے عہد کے شعراء میں اسلیے ممتاز تھا کہ اس کی شاعری میں سادگی کے ساتھ بڑی موسیقی تھی، ہمایوں کی وفات شیر شاہی قلعہ کے اندر زینے سے گر کر ہوئی تو اس نے یہ قطعہ کہکر تاریخ نکالی،

ہمایوں بادشاہ آں آفتابی　　کہ فیض شامل او عام افتاد

بنائے دولتش چوں یافت رفعت　　اساس عمرش از انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب از بلندی ——— بیاباں در نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم ——— خلل در کار خاص و عام افتاد
پئے تاریخ او کاہی رقم زد ——— ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

یہ قطعہ بہت مقبول ہوا، اکبری دور میں کاہی فتنۂ دینِ الٰہی سے ملوث ہو گیا تھا، اس لیے ملا عبدالقادر بدایونی اس کے مذہبی عقائد کو مطلق پسند نہ کرتے تھے، اور اپنی منتخب التواریخ (جلد سوم ص ۱۷۵) میں اس کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں پھر بھی وہ معترف ہیں کہ شعر و سخن کی وادی میں اس کا کوئی شریک نہ تھا، اور رقمطراز ہیں کہ اس کی دو غزلیں اہل سلوک، اور بزم ملوک میں بڑی مقبول تھیں، ان دونوں غزلوں کا مطلع یہ ہے:-

مرغ تا بر فرق مجنوں پر زدن انگیز کرد ——— آتش سودائے لیلیٰ بر سر او تیز کرد
چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود ——— گر دراں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

اس کا دیوان عام طور سے پسند کیا جاتا تھا، بوستاں کے جواب میں ایک مثنوی گل افشاں بھی لکھی،[1]

امان اللہ - شیخ امان اللہ پانی پتی عالم بھی تھے، صوفی بھی اور شاعر بھی، ہمایوں کے دربار کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا،[2]

جلالی - مولانا جلالی ہندی، فارسی اور ہندی دونوں میں اشعار کہتے تھے،[3]

میر ویسی - ہمایوں کے درباری امراء میں سے تھا، سخن سنج بھی تھا، اور شعراء کا سرپرست بھی، اس کے دولتکدہ پر شعر و سخن کی مجلسیں برابر منعقد ہوتی تھیں،[4]

حیدر - حیدر تونیائی شعر و شاعری کے علاوہ نغمہ و موسیقی کے لیے بھی مشہور تھا،[5]

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۵، [2] ایضاً، [3] ایضاً، [4] ایضاً، [5] منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۸۰۔

ضمیری۔ مولانا ضمیری بلگرامی بھی دربار کے ممتاز شاعر تھے، مثنوی اور قصائد لکھنے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی،

موجی۔ قاسم خاں بدخشی المتخلص بہ موجی ہمایوں کے امراء میں سے تھا، یوسف زلیخا کے تتبع میں ایک مثنوی لکھی جس میں چھ ہزار اشعار تھے[1]

فضلاء | ہمایوں کے دربار کے فضلاء کی تعداد بھی شعراء سے کم نہیں، وہ ان سے برابر اختلاط رکھتا تھا، طبقات اکبری میں ہے:-

درصحبت آں مقدس جہاں ہمہ وقت فضلاء و علماء واکابر بودند وہمہ اندا ول شب تا بصبح بصحبت می گذشت، و نہایت آداب در مجلس آنحضرت مرعی می بود، ہمہ وقت بحث علمی مذکور مجلس بہشت آئیں می گشت، ارباب فضل وہنر را در عہدش رونق تمام پدید آمد (ج ۲ ص ۸۴،۸۵)

ہم اختصار کے ساتھ ان ارباب علم کا ذکر کر کے ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، اس صف میں سب سے پہلے غیاث الدین محمد المعروف بہ **خواندامیر** پر نظر پڑتی ہے، یہ روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند کا نواسہ تھا، باپ خواجہ ہمام الدین محمد، بدخشاں کے والی سلطان محمود کا وزیر تھا، خواندامیر ہرات میں پیدا ہوا، جو اس وقت علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اسی مدینۃ العلم میں خواندامیر نے ہوش سنبھالا، ہرات کے سلطان غازی حسین بن منصور کا دربار شعراء اور علماء کا مرجع تھا، اس کے وزیر میر علی شیر کی علم نوازی اور معارف پروری سے یہ دربار اور بھی جگمگا اٹھا تھا، خواندامیر کی علمی صلاحیت ولیاقت کی شہرت سنکر میر علی شیر نے اس کو دربار کے زمرۂ فضلاء میں شریک ہونے کی دعوت دی، جس کو اس نے قبول کیا، یہاں رہ کر اس نے فن تاریخ نویسی کا گہرا مطالعہ کیا، اور اپنے علمی مشاغل بھی جاری رکھے، میر علی شیر کی علمی صحبتوں میں اس کی ذہنی جلا اچھی طرح ہوئی، اور اس شہریار علم

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۲۵،

کی ہمت افزائی سے اس نے اپنی پہلی کتاب مآثر الملوک لکھی، جس میں ملوک و اولیاء کے اقوال، پند و نصائح کے علاوہ خلفائے بنی امیہ و بنو عباس کے ساتھ ساتھ طاہریوں، سامانیوں اور غزنویوں کی تاریخ بھی ہے، میر علی شیر کے نام سے اس نے اپنی ایک دوسری کتاب خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار معنون کی جو روضۃ الصفا کی تلخیص ہے، میر علی شیر کی سوانح حیات بھی مکارم الاخلاق کے نام سے لکھی، سلطان حسین کے ایک دوسرے وزیر خواجہ کمال الدین محمود کے نام سے دستور الوزراء معنون کی، اس میں آغاز اسلام سے لیکر ۹۱۰ھ تک کے ممتاز وزراء اور سلاطین کے حالات ہیں، یہ کتاب ۹۱۵ھ میں تیار ہوئی، اسی زمانہ میں خواند امیر نے اخبار الاخیار، جواہر الاخبار اور غرائب الاسرار قلمبند کیں، جن میں شاید صوفیانہ مسائل پر مباحث اور اولیائے عظام کے کوائف ہیں، روضۃ الصفا کی تکمیل کے لیے خواند امیر نے اس کی ساتویں جلد ۹۲۹ھ میں ختم کی جس کی اہمیت آج بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے، اسی سال اس نے فن انشاء پر نامۂ نامی تحریر کی، سیاسی انقلابات سے ہرات جب ایران کے حکمراں شاہ اسمٰعیل کے زیر نگیں ہو گیا، تو خواند امیر اس علم دوست بادشاہ کے متوسلین میں سے ہو گیا، خواند امیر اس بادشاہ کے الطاف و اکرام کا معترف ہے، وہ کچھ دنوں جرجان اور غرجستان کے والی مرزا محمد زمان کی فیاضیوں اور زر پاشیوں سے بھی سیراب ہوتا رہا، شاہ اسمٰعیل صفوی کے وزیر کریم الدین حبیب اللہ کی سرپرستی میں اس نے حبیب السیر فی اخبار افراد البشر تین جلدوں میں ترتیب دی جو ابتدائے عالم سے ۹۳۰ھ تک تاریخی واقعات پر مشتمل ہے، اور اب تک اہم تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کتاب کے ختم ہونے سے پہلے حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد خواند امیر کے دن اچھے نہیں رہے، اسی لیے ۹۳۳ھ میں وہ ہرات سے قندھار چلا آیا، قندھار سے آگرہ ۹۳۵ھ میں بابر کے پاس پہنچا، بابر اس کی علمی شہرت سے واقف ہو چکا تھا، اس لیے بڑی گرمجوشی اور عقیدت سے اس کا استقبال کیا، اور اپنا ندیم خاص

بنایا، وہ بنگال کی مہم پر گیا، تو خواندامیر بھی اس کی معیت میں تھا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے بھی اس سے وہی عقیدت قائم رکھی، اور اس سے عزت و احترام سے پیش آتا تھا، تاریخ عالم پر جو اس کو قدرت حاصل تھی، اس سے متاثر ہو کر ہمایوں نے اس کو امیر مورخ کا خطاب دیا، خواندامیر کو بھی ہمایوں سے گہرا لگاؤ اور اخلاص پیدا ہو گیا تھا، جس کا اظہار اس نے مختلف قصائد قطعات اور مثنوی میں بھی کیا ہے، ان قصائد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، ہمایوں کی فرمایش پر اس نے **قانون ہمایونی** لکھی جس میں ہمایوں کے مبدعات اور "اختراعات" کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب ہمایوں کے دور کے تمدن اور مصنوعات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے، اس کے کچھ حصے ابو الفضل نے اپنی تاریخ اکبر نامہ میں بھی نقل کئے ہیں، (دیکھو جلد اول ص ۳۵۹ - ۳۶۰)، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہو گئی ہے، شروع میں جناب محمد ہدایت حسین صاحب کا پر از معلومات مقدمہ ہے، خواندامیر سنہ ۹۴۱ھ میں ہمایوں کے ساتھ بہادر شاہ والی گجرات کے خلاف مہم میں بھی شریک ہوا، وہاں کی آب و ہوا اس کو موافق نہیں آئی، علیل ہو کر دہلی واپس آیا تو ۹۴۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور خواجہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں سپرد خاک کیا گیا، اس کے ایک لڑکے سید عبد اللہ خاں کی تربیت اکبر نے کی، اور اس کی شاہانہ نوازشوں سے وہ منصب ہفت صدی سے بھی سرفراز ہوا،

یوسف بن محمد ہروی ہرات سے آکر اکبر کے دربار سے منسلک ہوا، طبیب بھی تھا اور شاعر بھی، ایک قصیدہ بعنوان قصیدہ فی حفظ صحت لکھ کر بابر کی علالت کے زمانہ میں ۹۳۷ھ میں پیش کیا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے اس کی سرپرستی کی، چنانچہ یوسف نے طب میں ایک کتاب ریاض الادویہ ۹۴۰ھ میں ہمایوں کے لیے تحریر کی، فن طب میں یوسف کی تین اور تالیفا

ہیں جن کے نام جامع الفوائد اور فوائد الاخبار ہیں، فن انشا پر ایک تصنیف بدایع الانشا بھی اسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے[۱]۔

محمد بن اشرف الحسینی الرستمداری بابر اور ہمایوں دونوں کے ساتھ وابستہ رہا، بابر کو ہندوستان کی تسخیر کے سلسلے میں جتنے جواہرات ملے ان کے اقسام پر محمد نے ایک کتاب جواہرنامۂ ہمایونی لکھی، اس میں جواہرات سے متعلق مفید معلومات اور مباحث ہیں[۲]۔

ہمایوں کے عہد میں، اور شاید اسی علم دوست بادشاہ کے لیے مولانا محمد بن علی بن محمد المسکن القاضی السمرقندی نے ایک ضخیم کتاب جواہر العلوم ہمایونی لکھی، یہ مختلف علوم وفنون کی قاموس ہے جو ایک ہزار چھ سو اٹھائیس صفحے پر مشتمل ہے[۳]۔

جوہر۔ ہمایوں کا آفتابچی تھا، خلوت اور جلوت میں برابر بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا، کچھ دنوں کے لیے ہیبت پور کا محاصل اور پھر سرکار پنجاب وملتان کا خزانچی بھی مقرر ہوا، ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۹۵ھ میں **تذکرۃ الواقعات** لکھنی شروع کی جس میں ہمایونی عہد کے سیاسی واقعات ہیں، یہ کتاب تصنع اور تکلف سے پاک ہے، اس لیے ایک مفید تاریخی لٹریچر سمجھا جاتا ہے، میجر چارلس اسٹوارٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے،

ہمایوں کے ایک دوسرے ہم جلیس **بایزید** نے ۹۹۹ھ میں اکبر کی فرمایش سے **تاریخ ہمایوں** لکھی، جس میں سیاسی حالات کے علاوہ ہمایوں کے عہد کے فضلاء وشعراء کا بھی ذکر ہے۔ میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری، (دیکھو مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری ص ۹۵ جلد اول)

۱؎ برٹش میوزیم مخطوطات فارسی ص ۴۸۵ و ۵۲۹، ۲؎ ایضاً ص ۴۹۶ و ۴۹۵، ۳؎ اس کتاب کے کچھ اقتباسات کے لیے "مغل دربار میں فارسی ادب" از عبدالغنی دیکھو،

ہمایوں اور علم ہیئت | ہمایوں علم ہیئت و نجوم سے خاص شغف رکھتا تھا، اور اس فن میں بہت اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی، بدایونی لکھتا ہے،

"در علوم نجوم و ہیئت و سائر علوم غریبہ بے نظیر"[1]

اکبر نامہ میں ہے:۔

"توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت"[2]

طبقات اکبری جلد دوم (ص ۱۰۴) کا مصنف رقمطراز ہے:۔

"و در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود"

ہمایوں نے ہیئت کا فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا، جو ہیئت کے تمام فنون اور رصدبندی میں ماہر تھے، وہ ہمایوں کو اس قدر عزیز تھے کہ ان سے کسی حال میں جدا ہونا گوارا نہ کرتا تھا، چنانچہ جب تخت و تاج کھو کر ہندوستان سے دور عراق و ایران میں غریب الوطن پھر رہا تھا تو اس مصیبت اور پریشان حالی میں بھی علامۂ موصوف سے ہیئت و نجوم کا درس لیتا تھا، اس سفر میں شیخ ابوالقاسم جرجانی بھی ساتھ تھے، یہ دونوں عالم ہمایوں کو قطب شیرازی کی کتاب درۃ التاج کا سبق دینے میں مشغول رہتے، اکبرنامہ میں ہے:۔

"واز ہمیں حدود مولانا نورالدین محمد ترخاں را بجہت طلب شیخ ابوالقاسم جرجانی و مولانا الیاس اردبیلی کہ بفضائل صوری و کمالات معنوی آراستگی داشتند، فرستادند و در کابل آمدہ بشرف ملازمت مشرف شدند واز آمدن ایں دو عزیز بسیار منبسط و منشرح گشتند و مذاکرہ کتاب درۃ التاج درمیان آوردند"[3]

آوارۂ غربت ہونے کے باوجود اس فن سے ہمایوں کی دلچسپی برابر قائم رہی، اور جب کبھی وہ

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۴۶۷، [2] اکبرنامہ ص ۳۶۰، [3] اکبرنامہ ص ۲۲۱،

کسی نئے شہر میں داخل ہوتا تھا ہیئت اور نجوم کے آلات تلاش کرتا تھا، اکبرنامہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے، کہ جب وہ تبریز پہنچا تو آپ ملازم بیگ محمد آختہ بیگی کو کہا کہ یہاں کوئی کرہ تلاش کرو، فارسی میں کرہ گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہیں، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوا، بادشاہ اس عمل بیابانی کو دیکھ کر ہنس پڑا،[۵۱]

ہمایوں کی مہارت فن کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ علماء کی طرح ہیئت و ریاضی کا درس دیتا تھا، نورالدین ترخان نوری سفیدونی نے جو ریاضی، نجوم اور حکمت کے ممتاز عالم تھے، ہمایوں ہی سے درس حاصل کیا تھا، مآثر الامراء میں مولانا مذکور کے حال میں ہے،

مولانا بفضل و کمال و شجاعت و سخاوت اتصاف داشت و بہ ہیئت و ہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود........ و صحبتش با جنت آشیانی (ہمایوں) کوک گشتہ، و از جملہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی گردید......... گاہے پادشاہ از و استفادۂ علوم می کرد، و گاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود[۵۲]،،

ہمایوں نہ صرف خود ان علوم میں مہارت حاصل کرتا رہا، بلکہ ملک کے نجومیوں کی واقفیت میں بھی اضافہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا، اس نے کئی جگہ رصد خانے بنانے کا ارادہ کیا اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیے،[۵۳] سلطان سلیمان خان کے ترکی امیرالبحر کو جو علم ہیئت کا بہت بڑا عالم تھا، کئی مہینے اپنے دربار میں روک رکھا کہ وہ چاند اور سورج کے گرہنوں کا حساب تیار کرے، اور ہندوستان کے نجومیوں کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے نکات پڑھنے میں مدد دے، ترکی امیرالبحر کئی مہینے کام میں مصروف رہا اور نجومی مشاہدات ختم کیے،[۵۴][۵۵]

---

۵۱ اکبرنامہ ج ۱ ص ۲۲۳ ۵۲ مآثر الامراء ج ۳ ص ۳۴۸ ۵۳ اکبرنامہ ج ۱ ص ۳۶۰ ۵۴ ترجمہ مرآۃ الممالک پروفیسر میری ہائیتم ۵۵ بحوالہ معارف ج ۲۲ ص ۵۸

ہمایوں کو اس فن میں اس قدر انہماک تھا کہ اس نے اپنی عزیز جان تک اسی فن کی خدمت میں گنوا دی، پرانی دہلی میں قلعہ کے اندر شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ایک بہت بلند ہشت پہلو عمارت بنوائی تھی، ہمایوں نے اس عمارت کی برجی کو بلندی کے سبب سے رصد خانہ قرار دیا تھا، ایک شام کو ستارۂ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا، بادشاہ ریاضی دانوں کی ایک جماعت کے ساتھ اسی برجی میں بیٹھ کر مباحث میں مصروف تھا، اور زہرہ کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ اذان سن کر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور سخت زخمی ہوا، اور پھر اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا، [1]

بادشاہ کو نجومیات و فلکیات سے جو انس تھا اس کے اثر سے ملک میں بھی علم ہیئت کا ذوق پیدا ہوا اور ملک میں عام طور پر آلات فلکی بننے لگے،

کرے اور اصطرلاب جو عموماً مدارس میں آج نظر آتے ہیں، ان کا ابتدائی رواج دینے والا ہمایوں ہی تھا، اس نے خود ایک خاص قسم کا اصطرلاب ایجاد کیا تھا، جو "اصطرلاب ہمایونی" کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ اس کے عہد کے اکثر اصطرلاب اور کرات اب تک مختلف مقامات میں محفوظ ہیں، [2]

ہمایوں کا سپہ سالار بیرم خان خانخانان فارسی و ترکی کا ایک اچھا شاعر اور صاحب دیوان تھا، [3] اس نے ہمایوں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، اس میں اصطرلاب سے تشبیب کی ہے، جو ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کا بین ثبوت ہے، کہتا ہے :-

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار   آں مدرکہ میانہ شہابش کند گذار

---

[1] اکبر نامہ ص ۳۶۳، [2] دیکھو مضمون "لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" از مولانا سید سلیمان ندوی، معارف جلد ۳۰ نمبر ۲ ص ۸۸، [3] بیرم خاں نے نظری سمرقندی سے شاہنامہ کے طرز پر ایک مثنوی شاہنامہ ہمایونی لکھانے کی کوشش کی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی،

باآنکہ می کشد رہ و خورد رہ ابرہی | آمد بجان ز حلقہ بگوشانِ شہریار
تا در بچشم کوکبۂ آفتاب را | چون ہجۂ لوائے شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیرِ حکم اوست | ہمچو نگین خاتم شاہِ جم اقتدار
بر کف نہادہ خوانِ زری پُر ز اشرفی | تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف | بر درگہش سپہر نہد روئے افتقار[۱]

ہمایوں کے تمام خانگی، ملکی اور سیاسی کاموں میں ہیئت اور نجوم کے اصول کا لحاظ رکھا جاتا تھا، ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بانو سے قرار پائی تو ہمایوں نے خود اصطرلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش معلوم کرکے تاریخ مقرر کی[۲] اکبر جب امرکوٹ کے صحرا میں پیدا ہوا تو ہمایوں نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ماہتاب برج اسد میں ثابت ہے، اس نے اسی وقت پیشنگوئی کی کہ اکبر صاحب اقبال اور دراز عمر ہوگا،[۳] جو مستقبل میں بحقیقت ثابت ہوئی،

ہمایوں اپنے فلکیاتی ذوق کے سبب سعد اور نحس کا اس قدر قائل تھا کہ وہ ملک کے تمام کاموں کو اسی اصول کے ذریعہ سے انجام دینے کی کوشش کرتا تھا جس زمانہ میں کابل کا انتظام اس کے سپرد تھا، اس نے ایک روز ان تین آدمیوں کے نام فال لیے جو ایک مقررہ دن اس کو راہ میں ملے، ان تین آدمیوں کے نام مراد خواجہ، سعادت خواجہ اور دولت خواجہ تھے ہمایوں نے اپنی سلطنت کی اساس انہی ناموں پر رکھی، ممالک محروسہ اور ملازموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا، دولت، سعادت، مراد، کل سپاہیوں کا نام اہل دولت رکھا، کیونکہ انہی کی مساعدت پر دولت و اقبال کا انحصار ہے، حکما، و علما، و مشائخ اور شعرا کو اہل سعادت کہا کیونکہ ان کے

۱؎ بدایونی ج ۳ ص ۱۹۱، ۲؎ ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم ص ۵۳ ۳؎ ایضاً ص ۵۵

ذریعہ سے سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے، بقیہ لوگوں کو اہل مراد سے موسوم کیا،

اسی فلکیاتی اصول پر ہفتہ کے دنوں کو بھی ان جماعتوں سے منسوب کیا، روز شنبہ و پنجشنبہ کو اہل سعادت سے متعلق کیا، ان دونوں دنوں میں وہ علم و عبادت کے ناظموں کے ساتھ وقت گذارتا تھا، اہل سعادت کے ساتھ ان دنوں کے مخصوص کرنے کی یہ وجہ تھی کہ شنبہ زحل کے ساتھ منسوب ہے، اور زحل مشائخ کا قدیم مربی سمجھا جاتا ہے، پنجشنبہ مشتری سے متعلق ہے، وہ علما کا ستارہ ہے، یکشنبہ و سہ شنبہ اہل دولت سے متعلق تھے، ان میں امور سلطنت انجام پاتے تھے، یہ دن اس لیے مقرر کیے گئے تھے کہ یکشنبہ آفتاب سے متعلق ہے، اس کی تربیت کے پرتو سے سلطنت و فرمانروائی ہوتی ہے، سہ شنبہ متعلق ہے مریخ سے اور مریخ سپاہی کا مربی ہے، ہمایوں نے جمعہ کا مبارک دن اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا، بقیہ دو دن اہل مراد کے لیے وقف تھے،

ہمایوں نے دو خرگاہ بنائے تھے، جن کی ساخت خالص ہیئت کے اصول پر تھی، ایک خرگاہ کو آسمان کے برجوں کی طرح بارہ حصوں میں تقسیم کیا تھا، اور ہر برج میں ایک تجرہ آویزاں تھا، جس کے سوراخوں سے "کواکب دولت" کے انوار چمکتے تھے، دوسرا خرگاہ یونانی ہیئت کے نو دن آسمانوں کی پوری نقل تھی، ہر آسمان میں جو ستارے ہیں ان کے نمونے اس میں بنے تھے،

ہمایوں کی سب سے دلچسپ نجومی اختراع بساط نشاط تھی، اس بساط میں فلکی دوائر و کرات عناصر بنائے تھے، پہلا دائرہ جو فلک اطلس سے منسوب تھا سفید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کے لحاظ سے صندلی، پانچواں مریخ کے تعلق سے سرخ، چھٹا نیر اعظم یعنی آفتاب کی مناسبت سے زریں، ساتواں زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھواں عطارد کے لحاظ سے سوسنی، نواں ماہتاب کے تعلق سے سفید، ماہتاب کے دائرہ کے بعد آگ اور ہوا کے کرے بالترتیب

بنے ہوئے تھے، اس کے بعد کرۂ خاک و آب تھا، کرۂ خاک میں ساتوں اقلیموں کے نقشے بنے ہوئے تھے، ہر دائرہ مختلف قسم کی جماعت کے لیے مخصوص تھا، مثلاً امرائے ہندی کو دائرہ زحل میں اور سادات و علماء کو دائرۂ مشتری میں بیٹھنے کا حکم تھا، ہمایوں نے اپنی ذات کے لیے دائرۂ زریں اختیار کیا تھا، اسی طرح نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ ہوتا اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، مثلاً یکشنبہ کو آفتاب کے رنگ کے لحاظ سے زرد لباس اور دوشنبہ کو ماہتاب کے رنگ کی مناسبت سے سبز لباس پہنا جاتا۔[۱]

ہمایوں اور علم ریاضی | نجوم و ہیئت کے لیے علم ریاضی ایک لازمی چیز ہے، اس لیے ہمایوں اس علم میں بھی بڑی اچھی استعداد رکھتا تھا، اس کے عہد کے تمام ممتاز ریاضی دان اس کے حضور میں حاضر رہتے، اکبر نامہ میں ہے:-

"در اقسام خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نہ داشتند"

ایک دوسری جگہ ہے:-

"در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایۂ بلند بود و ہموارہ با ارباب حکمت صحبت می داشتند و مشاہدان علم ریاضی بہ پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند"[۲]

فرشتہ لکھتا ہے:-

"در علم ریاضی کمال مہارت می فرمودند، مدار صحبتش با علما و فضلا بودہ، ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد"[۳]

ہمایوں اور کتبخانہ کا ذوق | ظاہر ہے کہ ہمایوں نے اپنے علمی ذوق کے سبب کتابوں کا ذخیرہ جمع

---

[۱] ان تفصیلات کیلئے دیکھو قانون ہمایونی (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور الیٹ جلد پنجم ص ۱۲۰، ۱۱۶)

[۲] اکبر نامہ حصہ ۱ ص ۳۰۳، [۳] فرشتہ جلد اول مقالہ دوم ص ۲۱۴

کیا ہوگا، چنانچہ جب وہ ہندوستان کے تخت و تاج کا از سر نو مالک ہوا، اور اس کو کچھ اطمینان نصیب ہوا تو دہلی کے شیر شاہی قلعہ میں شیر منڈل کے نام سے جو سہ منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی اس کی تیسری منزل پر اس نے اپنا کتب خانہ قائم کیا، یہ اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام بھی دیتی تھی، یہاں بیٹھکر اہل علم سے اکثر علمی مباحثہ کرتا تھا، شاہی کتبخانہ کا مہتمم نظام المعروف بہ بازبہادر تھا،[۱]

کتابوں سے ہمایوں کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا کتبخانہ اپنے ساتھ رکھتا، چنانچہ جب وہ کھمبایت کا محاصرہ کر رہا تھا تو اس کے ساتھ منجملہ اور کتابوں کے تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نے اپنے کمال فن سے مصور کیا تھا، اس محاصرہ میں ایک جنگلی قبیلہ نے شاہی خیمہ پر شبخون مارا تو لوٹ کے مال میں یہ نادر نسخہ بھی جاتا رہا، لیکن پھر فوراً ہی واپس مل گیا،[۲]

جب ہمایوں بے تخت و تاج عراق، ایران اور افغانستان میں پھر رہا تھا تو اس وقت بھی چیدہ چیدہ کتابیں اس کے ساتھ تھیں، اور اس کے کتب خانہ کا مہتمم اس کے ہمرکاب تھا،[۳]

ہمایوں اور تعلیمی ادارے | ہمایوں کا زمانہ حکومت زیادہ تر طوائف الملوکی اور پریشان حالی میں گذرا، اس لیے اس کو عام طور پر تعلیمی مدارس اور ادارے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی دہلی میں اس نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے،[۴] پھر اسی عہد میں شیخ زین الدین خوافی جو نظم و نثر کے بہت بڑے عالم تھے، آگرہ میں اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا،[۵]

---

[۱] تزک جہانگیری، [۲] اکبرنامہ ج ۱ ص ۱۳۷، [۳] اکبرنامہ دفتر اول، [۴] آئین اکبری، [۵] منتخب التواریخ بدایونی ص ۴۷۱،

اکبر

ہمایوں کی زندگی جس طرح آوارہ گردی اور پریشان حالی میں گذری وہ سب کو معلوم ہے شہزادہ اکبر کو چند سال بھی اپنے بزرگ باپ کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا، اور اکثر ظالم چچا کے پنجے میں گرفتار رہا، اور ابھی تیرہ ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور سلطنت کا بار عظیم اس کے کندھوں پر رکھدیا گیا، اس حالت میں اس کی تعلیم کہاں تک ہوسکتی تا ہم ہمایوں کی علم دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے لڑکے کی تعلیم سے غافل نہ رہے، چنانچہ ان ہنگامہ پرور واقعات کے ہوتے ہوئے بھی وہ اکبر کی تعلیم کی سخت نگرانی رکھتا تھا، وہ جب ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ روز کا ہوا، تو اس نے مکتب کی رسم ادا کی،

ابوالفضل رسم مکتب کی تقریب کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے :۔

"در ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند حضرت شاہنشاہی چہار سال وچہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم وعادت آں آموختہ درسگاہ الٰہی و رموز دان دبستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند و ملازادہ ملا عصام الدین ابراہیم را باین خدمت گرامی شرف اختصاص بخشیدند، اگرچہ در نظر ظاہر بینان بآموزش فرستادند، اما دیدہ وروبینان بارگاہ ظہور آں حضرت را بپایۂ والائے آموزگاری بردند، از غرائب آنکہ حضرت جہانبانی کہ از علوم آسمانی آگاہ بودند، و بدقائق نجوم می رسیدند، باتفاق ستارہ شماران باریک بین

واسطرلاب دانانِ وقت شناس ساعتے خاص برائے افتتاح تعلیم آن حضرت تعین فرمودہ
بودند کہ دواو دار و اعمار ہمہ نتوانند رسید، چون ساعت مختار رسید آن مؤدب بآداب الٰہی بہ لباس
بازی در آمدہ در پردہ احتجاب مختفی شدند، وبآن ہمہ توجہ و اہتمام بادشاہی ہر چند تکاپوئے فرمودند
پے بآن حضرت نبردند، وآگاہ دلان روشن ضمیر ازین سر بدیع دریافتند کہ مقصود ازین آنست
کہ آن خداوند خرد والا کہ مخصوص بہ تعلیم ایزدی ست بعلوم رسمی روزگار مشوب و منسوب نشود
تا در ہنگام ظہور این خدیو نکتہ شناس بر زمانیان ظاہر شود کہ دانشوری این پادشاہ
دانشوران از قسم موہبتی ست، نہ از جنس مکتسبی و باوجود این معنی بر ضمیر اقدس آنحضرت
نقوش حرفی و علوم رسمی چہ از انچہ رقم زدۂ قلم اہل فنون شدہ و چہ از ان نکات اسرار کہ
از مبدء فیاض بے توسط تعلیم و تعلم بر باطن انور رفائیہ گشتہ جلوہ ظہور دارد، و لہذا ارباب حکمیات
واصحاب ریاضت وصاحبان علوم ظاہری و دانایانِ صنائع کلی و جزوی چون در بساط
حضور اقدس میرسند، از نشناسائی خود سر خجالت بگریبان تامل فرو بردہ، حیران می مانند،
القصہ چون چندگاہ بیش آن افادات انتساب بخواندن زبون تر از ناخواندن اشتغال
داشتند اہل ظاہر بعدم کوشش آخون حمل کردہ در تغییر آن اہتمام نمودند، وآن بیچارہ
را معزول ساختہ خدمت او را بمولانا بایزید مقرر ساختند وندانستند کہ کارفرمایان ابداع
اہتمام دارند کہ ضمیر الہام آن نور پرور ایزدی محل انعکاس نقوش مدارسی و مورد انطباع
سواد علوم ظاہری نگردد۔"[1]

ملا عصام الدین ابراہیم اور مولانا بایزید کے علاوہ اکبر کے استادوں میں مولانا میر محمد خان

---

[1] اکبرنامہ ج ا ص ۲۷۱ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، یہ طویل اقتباس اس لیے بھی درج کیا گیا ہے کہ اکبرنامہ کے طرز انشا کا نمونہ پیش نظر ہے۔ آگے چل کر اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر آئے گا۔

نقیب خاں، مولانا عبد القادر، بیرم خان، اور مولانا پیر عبد اللطیف قزوینی کے نام بھی لیے جاتے ہیں،

میر عبد اللطیف قزوینی اکبر کو دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے[1]

اب سوال یہ ہے کہ ہمایوں کی کوشش اور ان مختلف استادوں کی تعلیم کہاں تک بار آور ہوئی، اکبر کے خوشامدی مورخین تو اس کو امی محض بتاتے ہیں، چنانچہ آگے چل کر ابو الفضل اسکو امی بتا کر اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ پروردگار کو ثابت کرنا تھا کہ یہ برگزیدۂ الٰہی علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر ہمارے نامتناہی فیوض کا منبع ہے، پھر لکھتا ہے کہ اس میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اہل عالم پر یہ روشن ہوجائے کہ اکبر کی تمام عقل و دانش خداداد یعنی الہامی ہے، کسبی بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں، ابو الفضل کی یہ ساری توجیہ ظاہر اس لیے ہے کہ وہ اکبر کو پیغمبروں کی صف میں لا کر کھڑا کرنا چاہتا ہے،

لیکن اس کو کون مان سکتا ہے، کہ ہمایوں کی اتنی توجہ اور استادوں کی انتھک کوشش کے باوجود اکبر لکھنا پڑھنا کچھ جانتا ہی نہ تھا، حالانکہ اس کے لیے یکے بعد دیگرے کئی استاد مقرر ہوئے، جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی، وہ فوراً علیحدہ کر دیا گیا، اور دوسرا مقرر ہوا، اس کے باوجود وہ نوشت و خواند سے اتنا نابلد رہا، کہ اپنا نام تک بھی اپنے ہاتھ سے لکھ نہیں سکتا تھا، ابو الفضل آئین اکبری میں "آئین آموزش" کے عنوان سے یہ لکھتا ہے کہ گیتی خداوند کے کہنے سے "حرف آموزی و تعلیم" کا ایک طریقہ نکالا گیا ہے جس سے بچے برسوں کی تعلیم مہینوں میں حاصل کر لیتے ہیں، جو شخص "آئین آموزش" کے اتنے دقیق نکتہ کو اس آسانی سے حل کر لیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیونکر کوئی مان سکتا ہے کہ وہ حرف شناسی سے محروم تھا،

---

[1] منتخب التواریخ، بدایونی، ج ۳، ص ۹۰، [2] رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفر نامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے، اسکے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ "فرودین" موجود ہے، اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے، اور پھر اس کے نیچے شاہجہان کی تحریر ہے، (جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۲۶ء)

بہرحال اکبر کے امی محض ہونے کا دعویٰ شک وشبہہ سے خالی نہیں، لیکن یہ بات تعریف کے قابل ہے کہ اس کم سوادی اور علمی کم مایگی کے باوجود اس کے دل میں علوم وفنون کا شوق اور ان کی قدر دانی کا جوش اتنا تھا کہ جو کسی عالم بادشاہ کو بھی نہیں ہوا، اس کے ذاتی شوق کا یہ عالم تھا کہ فارسی کی مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس کے سامنے پڑھی نہ گئی ہو، اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوسنامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، خسرو اور مولانا جامی کے کلیات، خاقانی اور انوری کے دیوان اور ہر قوم کی تاریخیں اس کے سامنے بلاناغہ پڑھی جاتی تھیں، پڑھنے والے ہر روز جہاں ختم کرتے تھے، وہاں اکبر اپنے ہاتھ سے نشان (شاید صفحہ یا تاریخ کا) بنا دیتا تھا[1]، اور جب کتاب ختم ہو جاتی، تو پڑھنے والے کو جیب خاص سے انعام دیتا، اسی وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا، کہ کوئی تاریخی سرگذشت یا فقہی مسئلہ یا علم وفن اور فلسفہ وحکمت کا نکتہ ایسا نہ تھا جو اس کے علم میں نہ ہو، اور جس پر وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو، دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار اس کو یاد تھے[2]، اس کے علمی مذاق کے متعلق جہانگیر تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :۔

"وبدقائق نظم ونثر چنان می رسید کہ مافوقے برآن متصور نبود" (ص ۵ نولکشور پریس)،

اکبر کا علمی وادبی ذوق اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ وہ خود اشعار بھی کہنے لگا تھا، ابوالفضل لکھتا ہے:

وطبع الہام پذیر آنحضرت بگفتن نظم ہندی وفارسی بغایت موافق افتادہ در دقائق تخیلات شعری نکتہ سنجی وموشگافی می فرمایند،[3]

تاریخ فرشتہ میں ہے

اگرچہ خط سواد کامل نہ داشت، اما گاہے شعر گفتے ودر علم تاریخ وقوفے تمام داشت

---

[1] آئین اکبری ص ۱۰۷، [2] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۷۱، [3] ایضاً، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

وقصص ہندبنکومی دانست[1]

ابوالفضل نے اکبر کے اشعار میں حسب ذیل بیت کو خاص طور سے پسند کیا ہے ،

نیست از زنجیر جنون در گردن مجنون را   عشق دست دوستی در گردنش افگندہ است

ریاض الشعراء (مؤلفہ علی قلی والہ داغستانی) میں بھی اکبر کے کچھ اشعار منقول ہیں، عبد اللہ خاں

اوزبک والیٔ توران کو ایک موقع پر اس نے حسب ذیل مستزاد رباعی لکھ بھیجی :-

عمرم ہمہ در فراق و ہجران بگذشت   با درد و الم

این عمر گرانمایہ چہ ارزان بگذشت   در رنج و ستم

عمر یکہ بشد صرف سمرقند و ہری   با عیش و طرب

افسوس کہ در آگرہ ویران بگذشت   با غصہ و غم

اکبر کی ایک منظوم خط و کتابت کی بھی مثال ملاحظہ ہو، علی قلی خان جس کو خان زمان کا خطاب

ملا تھا، ہمایوں کے ممتاز امراء میں سے تھا، جو نپور کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، اکبر کے عہد میں اس نے علم بغاوت

بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اکبر خود مہم میں شریک ہوا، خان زمان علم پرور ہونے کے

علاوہ خود بھی شاعر تھا، سلطان تخلص کرتا تھا (مآثر الامراء، ج ۱ ص ۶۳۰) اس نے سخت لب و لہجہ میں

اکبر کے پاس یہ اشعار لکھ بھیجے ،

اے سد سکندر زمانہ در تو   یاجوج پود سپاہی لشکر تو

در دور تو آثار قیامت پیداست   دجال تو ئی خواجہ امینا خر تو

اکبر نے اپنے حریف کو اسی انداز اور درشتی سے جواب دیا

اے خان زمان کہ پر بود لشکر تو   شد دولت من باعث کر و فر تو

---

[1] تاریخ فرشتہ

کمتر باشم زقیصر و جال امروز | فرمان اگرچہ افسانم سر تو

خان زماں نے پھر لکھ بھیجا،

تا ہست اثر خالصہ در کشور تو | مشکل کہ من جنگ کند لشکر تو

بگذرز زر و سیم کہ تا نوکر تو | از سر گذرد برائے سیم و زر تو

اکبر کا جواب تھا:۔

با آنکہ بود خاک درم افسر تو | امروز مین فرد نیاید سر تو

از دولت من ہست ترا سیم و زری | ورنہ ز در زر است قدرت لشکر تو

خان زماں شاہی فوج کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، بالآخر اس نے سپر ڈال دی، اور معذرت پیش کی،

اے شاہ زمان منم کمین نوکر تو | وز ترس نمی تو انم آمد بر تو

از دور تو قصد کشتن من داری | نزدیک چسان توانم آمد بر تو

اکبر نے خان زماں کو معاف کر دیا، اور لکھا،

گفتی تو چو راستی خدا یا ور تو | صد رحمت حق بر پدر و مادر تو

تغیر مدہ تو سکہ و خطبۂ من | تا من نکنم آرزوئے کشور تو[1]

تذکرۂ روز روشن میں اکبر کا ذکر شعراء کے زمرہ میں کیا گیا ہے، اور اس میں اس کے حسب ذیل اشعار منقول ہیں[2]

شبنم نگو کہ بر ورق گل فتادہ است | کان قطرہ ہاز دیدۂ بلبل فتادہ است

گریہ کردم زغمت موجب خوشحالی شد | ریختم خون دل از دیدہ دلم خالی شد

---

[1] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ [2] تذکرہ روز روشن مؤلفہ نواب صدیق حسن ص ۶۲۔

قطعہ

دوشینہ بکوے می فروشان — پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنون ز خمار سر گرانم — زر دادم و درد سر خریدم

رُباعی

از بار گنہ خمیدہ پشتم چکنم — نے راہ بمسجد نہ کنشتم چکنم
نے وصف کافر نہ مسلمان چاکم — نے لائق دوزخ نہ بہشتم چکنم

ایضاً

من یاد دلم کہ خون شد از دوری او — من یار غمم ز دست مہجوری او
در آئینہ چرخ نہ قوس قزح است — عکسی است نمایان شد از جوری او

محمد حسین آزاد دربار اکبری میں مذکورۂ بالا اشعار میں سے دو پہلے شعر، قطعہ اور دوسری رباعی کے علاوہ حسب ذیل دو شعر اور نقل کرتے ہیں،

من بنگ[1] نمی خورم مے آرید — من چنگ نمی زنم نے آرید
حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج — یا رب بود کہ کعبہ بیاید بسوے ما

ان اشعار کو نقل کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ

"اشعار جو اس کے (یعنی اکبر کے) نام پر کتابوں میں لکھے ہیں، اسی کے ہیں، کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں نفیس، جدید کی جدید تیار کر دیتے لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں تو اپنی ہی طبیعت کی امنگ ہے، جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے، شاید لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔"[2]

---

[1] ایک جگہ من بنگ کے بجائے من قہوہ لکھی ہے۔ [2] دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص (۱۲۱)

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد بھی دی[۵]، ایک بار محفل نغمہ و سرود میں اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا

مسیحا یار و خضر ش ہم رکاب و ہم عنان عیسے ۔۔۔ فغانی آفتاب من بدین اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرعہ میں برجستہ اصلاح دی،

فغانی شہسوار من بدین اعزاز می آید

ایک موقع پر ملا طالب صفاہانی کی حسب ذیل رباعی پڑھی گئی جس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس، اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا،

همرو و برادرم که دمساز آمد ۔۔۔ او شد به سفر دین ز سفر باز آمد

او رفت بد نبالہ او عمر برفت ۔۔۔ وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اس رباعی کو سنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے یہ مصرعہ اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے،

او رفت و در نقش مرا عمر برفت

اکبر کو علم و فن سے جو خاص طبعی مناسبت تھی، اس کا اندازہ ان صحبتوں سے بھی ہوتا ہے، جو اس کے دربار کا ایک ضروری جزو تھیں، اور جس میں ہر فن کے ارباب کمال جمع ہو کر مختلف مسائل پر بحث و تحقیق کرتے تھے، اور ان میں اکبر خود برابر کا حصہ لیتا تھا، خوش قسمتی سے اس کے دربار میں ایسے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک عہد میں کم نظر آتے ہیں، عام طور پر لوگ اکبری عہد کی عظمت صرف سیاسی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دور علمی حیثیت سے بھی کم درخشاں نہیں، یوں تو ہندوستان کی مغل حکومت کی تاریخ میں علم پروری اور علم و ادب نوازی اس حکومت کی بنیاد کے ساتھ ہی نظر آتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علوم و فنون کا عظیم الشان قصر اس کم سواد

فرمانروا کے عہد میں تکمیل کو پہنچا، آئندہ سطروں میں ہم ان تراجم اور تالیفات کا ذکر کرتے ہیں جو اکبر کی سرپرستی میں ظہور میں آئیں، اور جس کی وجہ سے اس کا عہد سلطنت علمی حیثیت سے جگمگا اٹھا تھا

تراجم | **مہابھارت**، سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر کی خواہش ہوئی کہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہو، اس کام کے لیے پہلے ہندو پنڈتوں کو جمع کیا، جنھوں نے مہابھارت کے نفس موضوع کی تشریح کی، اس کے بعد ترجمہ کا کام نقیب خان کے سپرد کیا، اور اکبر نے خود کئی متواتر راتوں میں نقیب خان کو ترجمہ کی نوعیت کو سمجھایا، ملا عبدالقادر بدایونی بھی جو زبان سنسکرت کے ایک جید عالم تھے، اس کام پر مامور ہوئے، ملا عبدالقادر مہابھارت کو "مزخرفات لاطائل" بتاتے ہیں، اس لیے بطیب خاطر اس کام کو انجام دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن شاہی حکم کی نافرمانی بھی نہیں کر سکتے تھے، چار مہینوں کی کوششوں کے بعد دو باب (ہژدہ فن) کا ترجمہ کر سکے، بقیہ حصوں کو ملا شیری، نقیب خان اور حاجی سلطان تھانیسری[1] نے ختم کیا، شیخ فیضی نے ترجمہ کی زبان کو سلیس اور فصیح بنانے کی کوشش کی لیکن وہ دو باب سے آگے نہ بڑھ سکا، حاجی سلطان تھانیسری نے اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کرنا شروع کیا، اس کام میں مشغول ہی تھا کہ سیاسی اسباب کی بنا پر اس کو دارالسلطنت چھوڑنا اور بھکر جانا پڑا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ حاجی سلطان تھانیسری جب یہ ترجمہ کر رہا تھا تو کسی نے پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو تو جواب دیا کہ "حرفے دہ ہزار سالہ رابزبان حال موافق می سازم" یعنی ہزاروں سال کی پرانی بات کو آج کی بات بنا رہا ہوں، (جلد سوم ص ۱۱۹) ملا شیری مہابھارت کے بارہ میں کہتے تھے کہ یہ افسانہ ایک خواب ہے جو کسی نے بخار کی حالت میں دیکھا تھا، (بدایونی ج ۳ ص ۲۴۹) اکبر نے مہابھارت کے ترجمہ کا نام رزم نامہ رکھا، اور تمام معرکوں کی تصویریں بنا کر اس میں شامل

---

[1] ملا بدایونی حاجی سلطان تھانیسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "علوم نقلیہ را خوب ورزیدہ" آخر وقت میں وہ تھانیسر اور کرنال کا کروڑی مقرر ہوا تھا۔

گیں، ابوالفضل نے اس پر دو جزو کا خطبہ لکھا ہے[1] جس کے آخر میں ۹۹۵ھ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب پانچ سال کی مدت میں ترجمہ ہوئی، یہ ترجمہ اب تک متفرق کتبخانوں میں پایا جاتا ہے[2]،

۲۔ راماین۔ ۹۹۷ھ میں عبدالقادر بدایونی نے شاہی حکم کے بموجب راماین کا ترجمہ کرنا شروع کیا، اور ۹۹۹ھ میں تمام کیا، ترجمہ ایک سو بیس جزو پر مشتمل تھا، کتاب کے تتمہ پر مندرجۂ ذیل شعر لکھکر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا،

ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند   جان سوختہ کردیم بہ جانانکہ رساند

اکبر بہت محظوظ ہوا، اور اس نے خواہش ظاہر کی کہ ملا بدایونی اس کتاب کے آغاز میں کوئی فاضلانہ مقدمہ بھی تحریر کر دیں، لیکن ملا صاحب نے کفر و الحاد کی کتاب پر کچھ لکھنے سے اغماض کیا،[3] اس کتاب کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں (انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۹۷۳، بوڈلین لائبریری نمبر ۱۳۱۵)۔

۳۔ سنگھاسن بتیسی۔ ۹۸۲ھ (۷۵-۱۵۷۴ء) میں ملا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت کی مشہور کتاب سنہاسن دو تریشتی کا فارسی ترجمہ کیا، اس کتاب میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت (مالوہ) کے متعلق بتیس قصے ہیں، اکبر کا حکم پاکر بدایونی نے ایک برہمن کی مدد سے ان قصوں کی فارسی جامہ پہنانا شروع کیا، اور اختتام پر کتاب کا تاریخی نام خرد افزا رکھا، اکبر اس کتاب کو بہت پسند کرتا تھا[4] (بوڈلین لائبریری، کتاب نمبر ۱۳۴۳)

۴۔ حیوٰۃ الحیوان۔ دمیری کی شہرۂ آفاق کتاب حیوٰۃ الحیوان کو شیخ مبارک نے فارسی

---

[1] بدایونی جلد دوم ص ۳۲۱-۳۱۹ [2] فہرست مخطوطات انڈیا آفس و برٹش میوزیم کتب نمبر ۴-۵۶۳۸، بوڈلین لائبریری کتب نمبر ۱۳۰۶-۱۳۰۷، [3] بدایونی ج ۲ ص ۳۶۶ [4] ایضاً ص ۱۸۴،

میں ترجمہ کیا، اکبر کو نقیب خان پڑھ کر سناتا، اور معنی سمجھاتا جاتا تھا، اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے اکبر نے اس کے فارسی ترجمہ کا حکم دیا، جو شیخ مبارک کے ذریعہ سے ۹۸۳ھ میں تمام ہوا[۵۱]،

۵۔ اتھربن۔ اکبر ہندوؤں کے علوم و فنون سے خاص شغف رکھتا تھا، چنانچہ ان کے مذہب کے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ان کی مقدس کتابوں کو زبان فارسی میں لانا چاہتا تھا، اتھربن کا فارسی ترجمہ اسی خیال سے اس نے کرایا، اول اول یہ کام ملا عبد القادر بدایونی کے ذمہ کیا گیا، ایک نو مسلم برہمن بھاون ان کو مطلب سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں لکھتے جاتے تھے، لیکن اس کی عبارت بہت ہی مغلق تھی، اس لیے وہ یہ کام انجام دینے سے قاصر رہے، چنانچہ فیضی سے فرمایش کی گئی، پھر شیخ ابراہیم سرہندی کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی، گو شیخ ابراہیم نے یہ خدمت انجام دی، مگر ترجمہ اکبر کے خاطر خواہ نہیں ہوا[۵۲]،

۶۔ انجیل۔ نصرانی مبلغین کو شاہی دربار میں کافی رسوخ حاصل ہو گیا تھا، اکبر نے ان سے دین مسیحی کی جزئیات اور تفصیلات سے واقفیت حاصل کی، اور شہزادہ مراد کو اس کی تعلیم بھی دلائی، اسی سلسلہ میں انجیل کے فارسی ترجمہ کی بھی فرمایش کی، اس کام کے لیے ابو الفضل کو مامور کیا، جس نے ۹۸۶ھ میں اس کو انجام دیا[۵۳]، انہی اسباب پر بعض خوش فہم پادریوں کا خیال ہے کہ اکبر نے دین مسیحی قبول کر لیا تھا،

۷۔ تزک بابری۔ بابر نے اپنے خیالات اور واقعات ترکی میں قلمبند کئے تھے، اور تزک بابری نام رکھا تھا، اکبر کی فرمائش سے خان خانان عبد الرحیم نے اس کا فارسی ترجمہ ۹۹۸ھ میں کیا، جس کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور صاف ہے۔

۸۔ لیلاوتی۔ فن ریاضی کی ایک مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ فیضی نے کیا،

---

[۵۱] بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲، [۵۲] ایضاً ص ۲۱۲، [۵۳] ایضاً ص ۲۶۰

۹۔ **تاجک**۔ علوم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے، مکمل خان گجراتی نے اس کو فارسی کا قالب پہنایا،

۱۰۔ **ہری بنس**۔ کرشن جی کی زندگی کے حالات ہیں، مولانا شیری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا،

۱۱۔ **معجم البلدان**۔ شہاب الدین عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ حموی رومی بغدادی (متوفی ۶۲۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب معجم البلدان کا فارسی ترجمہ ملا احمد ٹھٹھ، قاسم بیگ، شیخ منور اور دوسرے فضلائے روزگار نے مل کر کیا،

۱۲۔ **تاریخ کشمیر**۔ راج ترنگنی مصنفہ کلہانا، سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں بزبان سنسکرت لکھی گئی، اکبر نے کشمیر کے سفر میں اس کتاب کو دیکھا، اس کی خواہش ہوئی کہ اس کا فارسی ترجمہ ہو، چنانچہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کام کو انجام دیا، ابو الفضل کا بیان ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق چار ہزار برس کا حال لکھا ہے[۵۱]، اس کتاب کا فارسی ترجمہ چھپ گیا ہے[۵۲]، اس ترجمہ کا انتخاب ملا عبد القادر بدایونی نے بھی سلیس زبان میں کیا، جو شاہی کتبخانہ میں داخل ہوا،[۵۳]

۱۳۔ **کلیلہ دمنہ**۔ قصہ کے طور پر حکمت عملی کی ایک مشہور سنسکرت کتاب ہے، ملا حسین واعظ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا، لیکن سخت الفاظ و استعارات سے یہ ترجمہ اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہو گیا تھا، کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا، اکبر نے ابو الفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھکر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ اس کے پند و نصائح آسانی سے سمجھ میں آئیں، ۹۹۶ھ میں ابو الفضل نے اس کام کو انجام دیا، کتاب کا نام عیار دانش رکھا گیا،[۵۴] کتاب کے اختتام پر ابو الفضل نے ایک خاتمہ لکھا ہے، جس میں بعض نادر معانی اور نکات بیان کئے گئے ہیں، (انڈیا آفس لائبریری، کتب نمبر ۷۷۷ - ۷۷۶، بوڈلین لائبریری نمبر ۴۴ - ۳۴۸)

---

۵۱ آئین اکبری ص ۷۶، ۵۲ انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۲۰۱، ۵۳ بدایونی جلد دوم ص ۳۷۴، ۵۴ آئین اکبری ص ۷۷،

١٤- نل دمن۔ یہ عشق و محبت کا ایک جگر گداز قصہ ہے۔ ۱۰۰۳ھ میں ملک الشعرا فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں اس کو نظم کیا، اس میں چار ہزار دو سو اشعار ہیں، اور قابل تعجب یہ امر ہے کہ صرف پانچ مہینے کی مدت میں یہ عظیم الشان کارنامہ انجام پذیر ہوا، اس کے کمال و خوبی کی داد ملا عبدالقادر جو فیضی کو ہمیشہ سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس طرح دیتے ہیں:

"والحق مثنوی ست کہ دریں سی صد سال مثل آن بعد از میر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نگفتہ باشد۔"[1]

١٥- جامع رشیدی۔ ۹۹۳ھ میں عبدالقادر بدایونی نے عربی کی ضخیم کتاب جامع رشیدی کا فارسی ترجمہ کیا، جو خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔[2]

١٦- بحر الاسمار۔ ہندی افسانہ کی ایک کتاب تھی، سلطان زین العابدین نے اس کا تھوڑا سا ترجمہ کرایا تھا، نامکمل تھی، ابوالفضل کی فرمایش سے ملا عبدالقادر نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا، چنانچہ ۵ مہینے میں ترجمہ کا کام ختم کیا، جو ساٹھ جز میں تھا، اکبر نے خوش ہو کر دس ہزار ٹنکہ اور ایک گھوڑا انعام میں دیا۔[3]

١٧- اکبر نے شہرزوری کی عربی تالیف تاریخ الحکما کا بھی فارسی ترجمہ مقصود علی تبریزی سے شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لیے کرایا، اس کا نام نزہۃ الارواح و نزہۃ الافراح رکھا گیا۔

اکبر نے نہ صرف سنسکرت کی کتابیں فارسی میں منتقل کرائیں بلکہ عربی و فارسی کی کتابوں کو سنسکرت کا قالب پہنایا، چنانچہ زیچ مرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا، اس کے ترجمہ میں میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر، مہیش مہانند شریک تھے۔[4]

تصنیفات | تاریخ الفی اکبر چاہتا تھا کہ اسلامی عہد کے ابتدائی دور سے اس کے زمانہ تک کی

---

١ بدایونی ج ٣ ص ٣٩٦ ٢ ایضاً ص ٣٤٣ ٣ عبدالقادر بدایونی ج ٢ ص ٤٠١ ٤ آئین اکبری، ص ١١٥،

کوئی مفصل اور مکمل تاریخ ہو، اس کی خواہش کے مطابق نقیب خان، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبد القادر بدایونی، مولانا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خان نے ملکر اس کام کو انجام دیا، یہ کتاب چار جلدوں میں ختم ہوئی، ملا عبد القادر بدایونی تین جلدوں کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چار جلدیں موجود ہیں[1]، تیسری جلد میں ۹۹۷ھ تک کی تاریخ ہے، اور ۱۰۱۵ھ میں ختم کی گئی، پروفیسر ڈاؤسن کا خیال ہے کہ ان چاروں جلدوں کے علاوہ دو اور جلدیں ہونی چاہئیں[2]، اس کتاب کی تدوین اور ترتیب میں مختلف اہل علم نے حصہ لیا، اس کا ذکر ملا عبد القادر بدایونی اس طرح کرتے ہیں :-

اسی سال یہ حکم ہوا کہ ہجرت سے چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے، اور لوگ ہر جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں، اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو ان تمام سلاطین کے حالات پر حاوی ہو، جو ابتدا سے اب تک اسلام میں گذرے ہیں، جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ ایسی تاریخ لکھوائی جائے جو دوسری تمام تاریخوں کی ناسخ ہو، اس تاریخ کا بادشاہ نے الفی نام رکھا اور یہ بھی حکم دیا کہ سنہ کے ذکر میں ہجرت کے بجائے رحلت لکھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وفات سے آج تک کے واقعات کے لکھنے کے لیے سات آدمیوں کو حکم ہوا، پہلے سال کے واقعات کو نقیب خان لکھیں اور دوسرے کو شاہ فتح اللہ، اور تیسرے کو حکیم ہمام، چوتھے کو حکیم علی، پانچویں کو حاجی ابراہیم سرہندی، چھٹے کو مرزا نظام الدین احمد اور ساتویں کو فقیر قلمبند کرے، اسی طرح ۳۵ سال کی تاریخ مرتب ہو گئی، ایک رات کو ساتویں سال کے متعلق جب کہ فقیر خلیفہ ثانی کے حالات لکھ رہا تھا اور قصر الامارۃ کی بنا و انہدام

۱؎ انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۱۰۱م۔ ۲؎ ایلیٹ ج ۵، ص ۱۵۰،

ام کلثوم بنت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ، اور پانچوں وقت کی نماز
کی تعیین، اور شہر نصیبین کی فتح، اور بڑے بڑے مرغ کے مانند بچھوؤں کے معاملے تک پہنچا
تو سخت مباحثہ ہوا، مرزا جعفر آصف خان ثالث کی بری طرح ڈگ گئی، برخلاف شیخ ابوالفضل
اور غازی خان بدخشی نے صحیح توجیہات کیں اور جب نقیر سے پوچھا کہ ان واقعات کو کیونکر
لکھا تو میں نے کہا کہ جو کچھ کتابوں میں دیکھا، لکھ دیا، میں خود ان واقعات کا موجد نہیں
ہوں، اسی وقت کتاب روضۃ الاحباب اور سیر کی دوسری کتابوں کو خزانہ سے طلب
کر کے نقیب خان کو حکم دیا کہ ان واقعات کی تحقیق کریں، اس نے واقعہ کے مطابق
صحیح نقل کر دیا اور مجھکو ان بے محل اعتراضات سے خدا کے فضل سے رہائی ہوئی، ۳۶ سال
کے متعلق حکم ہوا کہ اب ملا احمد ٹھٹھہ تنہا تاریخ الفی لکھیں اور یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش
سے ہوا، اور انھوں نے تعصب کی وجہ سے اپنے اعتقاد کے مطابق جو کچھ چاہا لکھ دیا،
جیسا کہ ظاہر ہے چنگیز خان کے زمانہ تک کے تمام واقعات کو دو جلدوں میں تمام کیا،
یہانتک کہ مرزا فولاد برلاس نے ایک رات اس کو بادشاہ کے طلب کرنے کے بہانہ
سے گھر سے نکالا اور لاہور کی گلی میں اس غلو کی وجہ سے جو وہ مذہب میں رکھتا تھا،
اور اس تکلیف کی وجہ سے جو اس کو اس سے ہوئی تھی، قتل کر دیا اور خود اس کے
قصاص میں قتل ہوا، بقیہ احوال کو حکم کے موافق آصف خان نے نوسوستانوے سال (۹۹۷)
تک لکھا اور سنہ ایکہزار میں فقیر کو لاہور میں حکم دیا کہ اس تاریخ کو ابتدا سے مقابلہ اور
۲ تصحیح کروں، اور وہ سنہ جو آگے پیچھے لکھے گئے ہیں ان کو مرتب کروں، ایک سال
تک اس خدمت میں مشغول رہ کر پہلی دو جلدوں کا مقابلہ کیا، اور تیسری جلد کو آصف
خان کے حوالہ کیا، [له]

ابوالفضل نے آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا۔[۵۱] اس تالیف کی خوبی کو ایک انگریز مورخ اس طرح بیان کرتا ہے:-

"مولفین اس تالیف کی تیاری میں تمام بہترین ذرائع تصرف میں لائے ہیں کیونکہ عربی اور فارسی کی ان تمام مشہور اور مستند تاریخوں کے حوالے جن سے آج موجودہ یورپین اہل علم فیض حاصل کر رہے ہیں، اس تالیف میں مذکور ہیں، انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ مستند مواد کا انتخاب کیا ہے، اور ان خرافات کو جو اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں، نظر انداز کر دیا ہے۔"[۵۲]

اکبر نامہ۔ تیموریوں کے دربار میں تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کا ایک باضابطہ محکمہ قائم تھا، اکبر نامہ اور آئین اکبری اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں، اکبر نامہ ابوالفضل کی محنت و کاوش اور انشاء کا شاہکار ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل واقعات ہیں، آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہیے، اکبر نامہ کے استناد کو بعض مورخین اس لیے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ یہ اکبر کے ایک درباری مورخ کی نگارش و تحریر ہے، جس میں حد سے زیادہ خوشامد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے،

الفنسٹن لکھتا ہے کہ

"اکبر نامہ کی سند یورپ میں وقعت کی نظر سے دیکھی نہیں جاتی .... کیونکہ ابوالفضل گو وہ ایک وسیع النظر اور غیر معمولی ذہن کا آدمی ہے پھر بھی وہ ایک وفادار درباری ہے جو اپنے آقا کی نیکیوں کو ہمیشہ اچھالتا ہے، اس کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے،

---

[۵۱] آئین اکبری ص ۷۷، [۵۲] ایلیٹ ج ۵ ص ۱۵۶، انڈیا آفس کیٹلاگ نمبر ۱۱۸ - ۱۱۰۔

اور اس کے اور اس کے ہوا خواہوں کے رتبہ کو ہمیشہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے،
اس کے سنہ و تاریخ اور واقعات کے عمومی بیانات قابل قدر ہیں، لیکن اس کتاب
کو پڑھتے وقت اس کی علانیہ طرفداری سے اپنے کو اتنا محفوظ رکھنا نہیں پڑتا، جتنا کہ
وہ اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کر کے ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ حاصل کرنا چاہتا
ہے، اور پھر بعض موقع پر بے جا اور غیر ایماندارانہ طریقہ پر ایک فقرہ کہہ کر کسی سے بدظن کر دیتا
ہے، حالانکہ وہ شخص بالکل معصوم اور قابل معافی ہوتا ہے، اس کے بیانات گنجلک، غیر موثر
عامیانہ خیالات اور دعائیہ فقروں سے بریز، اور عموماً اپنے ممدوح کی مدح سرائی پر ختم
ہوتے ہیں، وہ اکثر واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے، یا اپنے مخصوص انداز سے غلط پیرایہ
میں بیان کر جاتا ہے، اور تعریف و توصیف، فتح و کامرانی کے واقعات کا تذکرہ اس
غلو سے کرتا ہے کہ ناظرین نہ صرف کتاب سے بلکہ ممدوح سے بھی کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں،
اس بے معنی تعریف و توصیف کے ڈھیر میں اکبر کے حقیقی اوصاف گم ہو جاتے ہیں،
اور پھر دوسرے مورخوں سے اس کے افعال کی نوعیت کا، اس کی مشکلات اور ان
ذرائع کا جن سے وہ ان مشکلات کو حل کرتا ہے، اصلی حال معلوم ہوتا ہے، کتاب کا
خوشامدانہ انداز (جیسے ایسے آدمی نے لکھا، جو اکبر کی طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف
تھا، اور پھر اس کے معائنہ کے لیے پیش کیا) اس (اکبر) کی نخوت و کبریائی کا پتہ دیتا ہے
جو حقیقتہً اس کی پسندیدہ سیرت کا تنہا داغ ہے"

مگر اس کا جواب ایک دوسرا یورپین مورخ اس طرح دیتا ہے:-

"ابوالفضل پر یورپین مصنفین خوشامد پسندی کا الزام عائد کرتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی کہ اس نے قصداً بعض واقعات کو چھپایا ہے، جس سے اس کے آقا کی شہرت کو کافی

نقصان پہنچاہے، مگر اکبر نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو الزام بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، اگر اس کی تصنیفات کا ہم مشرق کی دوسری تاریخوں سے مقابلہ کریں، تو پتہ چلے گا کہ وہ تعریف کرتا ہے، لیکن کم، اور خاص انداز کمال سے جو کوئی دوسرا ہندوستانی مورخ نہیں کر سکتا ہے، ملکی مورخوں میں سے کوئی اس پر خوشامد کا الزام عائد نہیں کرتا، اور اگر ہم یہ ذہن نشین کر لیں کہ مشرق کی تمام کتابیں حکمراں کی رائے سے متفق اور متبع ہونا ضروری قرار دیتی ہیں، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، تو پھر ابوالفضل قابل معافی ہے، وہ اس لیے تعریف کرتا ہے کہ اس نے حقیقتہً ایک سچا ہیرو پا لیا ہے۔"[۵]

اسی بات کو محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اجالا ہو گیا ہے، وہ اس کی تصنیفات پڑھ کر یہ لکھتے ہیں، کہ ابوالفضل ایشیائی انشا پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا، اس نے اکبرنامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے، اس نے خوش بیانی اور پادہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں، اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ممدوح اور مادح دونوں سے نفرت ہوتی ہے، اور دونوں کی ذاتی و صفات پر بٹہ لگتا ہے، البتہ بڑا علامہ، عاقل، دانا، مدبر تھا، دنیا کے کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت ہے، وہ اس میں ضرور تھی، آزاد کہتا ہے کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے، لیکن وہ مجبور تھا، کیونکہ فارسی کا ڈھنگ جو صدیوں سے یہی چلا آتا تھا، اس کی ایجاد دوں نے بہت اصلاح کی ہے، اور خرابیوں کو سنبھالا ہے، باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں، اور رموز سخن کے تاڑنے والے

۵۔ بلاخ من تمہید آئین اکبری۔

ہیں، اور کلام کے انداز اور ادا کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ میں کہا، کوئی بات اٹھا نہیں رکھی، اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے، اور انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھ دیا ہے، کہ اسی کا کام تھا، یہ بھی اسی کا کام تھا کہ سب کچھ کہہ دیا، اور جن سے نہ کہنا تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور ابتک بھی نہیں سمجھتے، خوشامد کی بات ہم نہیں مانتے، ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں، کونسا مورخ ہے کہ خوشامد، شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو، وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال وفادار نوکر تھا، اسی کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت و آبرو بچی، اسی کی قدر دانی سے رکن سلطنت ہو گیا، اسی کی پرورش سے تصنیفات ہیں، اور انھوں نے بلکہ خود اس نے صدہا سال عمر پائی، خوشامد کیا چیز ہے؟ اس کا دل تو عبادت کرتا ہوگا، اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی، اس نے بہت سا ادب ظاہر کیا، شکریہ ادا کیا، لوگوں نے خوشامد نام رکھا۔"[1]

مؤلف مآثر الامرا ابوالفضل کے انشا اور اکبر نامہ کے متعلق لکھتا ہے :-

"تمام چیزوں سے قطع نظر کرکے شیخ نے فن انشا میں عجیب سحر نگاری سے کام لیا ہے، باوجودیکہ وہ انشا پردازی کے تمام مصنوعی تکلفات سے پاک ہے، باایں ہمہ مفرد الفاظ کی نشست، ان کی متانت، حسن ترکیب وغیرہ کا ایک ایسا حصہ اس میں آگیا ہے کہ دوسرے لوگ بمشکل اس کی تقلید کر سکتے ہیں، اور تاریخ اکبری سے اسکی شہادت مل سکتی ہے چونکہ اس نے یہ التزام کر لیا ہے کہ (اس میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ آئیں) اس لیے لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ نے خمسۂ نظامی کی نثر کر دی ہے، اس فن میں اس کی مہارت کا کمال یہ ہے کہ بہت سے مطالب کو جو بداہتہً باطل تھے، بادشاہ کی مدا حی کے لیے بظاہر چند ایسی تمہیدوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب تک غور نہ کیا جائے اصل مقصد معلوم نہیں ہو سکتا۔

[1] دربار اکبری، مطبع رفاہ عام لاہور، ص ۵۰۰۔

آئین اکبری - اکبر نامہ ہی کے مختلف حصے ہیں، اس کی خوبیاں جتنی بھی زیادہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی، پھر بھی قلم قاصر رہے گا، ابوالفضل نے اسکو جس محنت کاوش، امعان نظر اور دیانتداری سے لکھا ہے وہ ہر زبان کے لیے ایک قابل فخر علمی کارنامہ ہو سکتا ہے، اس کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہیے، اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شاہان مغلیہ کے عہد زرین کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اتنی واضح اور روشن نظر نہ آتیں جتنی کہ آج نظر آ رہی ہیں، اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں جب برطانوی نظام حکومت قائم ہوا تو اس سلسلہ میں یہ کتاب بے حد معاون ہوئی،

ان تاریخوں کے علاوہ نثر و نظم کی بہت سی کتابیں اکبر کی فرمایش پر لکھی گئیں، ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی نے نظامی کے خمسہ کی زمین میں پانچ مثنویاں لکھیں، خسرو شیریں کے مقابل میں سلیمان و بلقیس اور لیلی مجنوں کے طرز پر نل دمن لکھی، ان دونوں میں علحدہ علحدہ چار ہزار اشعار تھے، ہفت پیکر کے وزن پر ہفت کشور اور سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ لکھی، جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل تھیں، مخزن اسرار کے مقابلہ میں مرکز ادوار لکھی جس میں تین ہزار ابیات تھیں[1]، فیضی نے کلام مجید کی ایک بے نقط تفسیر سواطع الالہام بھی لکھی جس کے صلہ میں اکبر نے دس ہزار روپئے دیے، اس نے اخلاقیات پر ایک بے نقط کتاب موارد الکلام بھی تالیف کی تھی[2]،

ارباب کمال | اس جماعت میں سب سے پہلے ہماری نظر ابوالفیض فیضی فیاضی پر پڑتی ہے جو شیخ مبارک کا خلف اکبر تھا، اس نے علم و فن کی شہرت سے بیس برس کی عمر میں اتنی ترقی کی کہ دربار اکبری ...

---

[1] مآثر الامراء ج ۳ ص ۵۸۶، [2] ایضاً ص ۵۸۵،

پہنچا دیا، جہاں وہ چہار صدی منصب پر فائز ہوا، اور جب تیس برس کا ہوا تو ملک الشعراء کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا، عربی، فارسی اور سنسکرت کا جید عالم تھا، اس نے ایک سے ایک کتابیں مختلف زبانوں میں تالیف کیں، اس کی متعدد تصانیف کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کا علمی شغف اس قدر بڑھا تھا کہ جب وہ مرا تو اپنے کتب خانہ میں ۴۳۰۰ کتابیں چھوڑیں، جو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں، شاعری میں یکتائے روزگار تھا، پہلے فیضی پھر فیاضی تخلص کرتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

زین پیش کہ سکہ ام سخن بود
فیضی رقم نگین من بود

اکنون کہ شدم بعشق مرتاض
فیاضیم از محیط فیاض

فیضی کے قصائد، غزلیں، اور مثنویاں فارسی کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں، اس کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے، اس کے مجموعہ کا نام طباشیر الصبح ہے، فن طب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، بو علی سینا کی کتاب القانون کو پڑھانے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اکبر کا محبوب ترین دوست تھا، اس کو ہمیشہ پاس رکھتا تھا، اور اس کی ہمہ گیر قابلیت سے برابر فیضیاب ہوتا رہتا تھا، اکبر کے لڑکوں کی تعلیم اسی کے ذمہ تھی، شہزادہ دانیال کو تھوڑے ہی دنوں میں ضروری مراتب سکھا دیئے تھے، دانیال نے برج بھا کا اسی سے سیکھی، ۲۸ھ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لیے شہزادہ دانیال کو اجمیر بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا، ۹۹۱ھ میں آگرہ کالپی اور کالنجر کی صدارت اس کو تفویض کی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں کے خلاف اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا، ۹۹۶ھ میں اکبر نے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا، ۹۹۷ھ میں اکبر کشمیر گیا تو فیضی بھی اس کی معیت میں تھا، شاہی جلو میں کشمیر کی حسین وادیوں کو دیکھ کر مست ہو گیا، اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر — کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

۹۹۹ھ میں اکبر نے خاندیس کے فرمانروا کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہاں سے احمد نگر برہان نظام شاہ کے پاس سفیر ہی کی حیثیت سے پہنچا، یہاں سے اکبر کے پاس جو عرضداشت لکھکر بھیجی، وہ مختلف قسم کے معلومات سے پر تھی، اس کو سیاسی کاموں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ اکبر کے قریب رہ کر علمی مشاغل میں زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا، شروع سے اخیر تک اکبر کے ساتھ اس کو خاص قلبی لگاؤ تھا، شاہ عباس صفوی نے اکبر کے پاس قیمتی تحائف لے کر اپنے ایک ایلچی کو بھیجا، تو مؤخر الذکر نے ایک مکتوب پڑھا جس کے سرورق پر یہ رباعی تھی،

زنگی بسپاہ و خیل و لشکر نازد — رومی بسنان و تیغ و خنجر نازد

اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد — عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جب یہ رباعی پڑھی گئی تو دربار کا ہر شخص چونک اٹھا، اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا، فیضی اپنے محبوب شاہی آقا کی سبکی برداشت نہ کرسکا اور فی البدیہہ یہ رباعی لکھکر پڑھی

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد — دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد — کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اس کو سنکر دربار میں مسرت و افتخار کی ایک لہر دوڑ گئی،[1] فیضی نے ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی، جب بستر مرگ پر تھا تو ایک رات اکبر کو خبر ہوئی کہ وہ عالم نزع میں ہے آدھی رات گزر چکی تھی، مگر اکبر اپنے محبوب دوست کے گھر پر اسی وقت شاہی حکیم لیکر پہنچا، اضطراب میں فیضی کا سر پکڑ کر بولا "شیخ جیو، بولو، حکیم علی کو ساتھ لایا ہوں، بولتے کیوں

[1] بیاض مرزا اسد بیگ ترکمان بحوالہ ہسٹری آف پرشین لٹریچر اینڈ لینگویج از عبدالغنی جلد سوم ص ۶۴،

نہیں ہو، مگر فیضی کی زبان بند ہو چکی تھی، اکبر نے پھر جھنجھوڑا لیکن اس مرتبہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی، غایت اضطراب اور صدمہ میں اکبر نے سر سے دستار اتار کر زمین پر پھینک دی۔[1]

فیضی کی لیاقت، قابلیت، دقتِ نظر اور جودتِ طبع کے تمام اہل قلم معترف ہیں، ملا عبدالقادر بدایونی اس کو عقیدے کے لحاظ سے بہت ہی سخت اور برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، مگر جہاں اس کی علمی لیاقت کا ذکر آتا ہے اس کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیتے ہیں، اس کی مثنوی نل و من کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کی کتاب تین سو سال کے اندر نہیں لکھی گئی، ایک جگہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا، عدیل در روزگار نداشت"[2]

مصنف مآثر الامرا، اس کی قابلیت کے متعلق یوں رقمطراز ہے :۔

"بدقت طبع و جودتِ ذہن از جمیع علوم بخشی وافر برداشتہ، در حکمت و عربیت بیشتر تتبع نمودہ و بہ تشنگی دانش فراپیش گرفتہ رنجوران تہی دست را چارہ می کرد"[3]

موجودہ دور کے ارباب کمال بھی اس کے کمال کے معترف ہیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے، جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، مرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں اور مقطع میں کہتے ہیں"

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت ۔۔۔ دردیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

۔۔۔ فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے، جس کا وہ موجد تھا۔[4]

---

[1] بدایونی جلد اول ص۳۴۴، و مآثر الامرا جلد ۲ ص۵۸۴ [2] شعر العجم جلد سوم، [3] بدایونی جلد ۳ ص۲۹۹، [4] مآثر الامرا، ص۵۸۸

اور خاتم بھی، جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ پر ہے لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں نظریہ عشقیہ فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔"[1]

محمد حسین آزاد گوہر افشاں ہیں :-

"انشا پردازی فیضی کے قلم کو سجدہ کرتی ہے، اس کے لطیف استعارے، رنگین تشبیہیں، بلند مضامین، نازک خیالات، فصیح زبان، لفظوں کی عمدہ تراشیں، دلکش ترکیبیں، ادائے مطالب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں"[2]

فیضی کے بعد یکایک اس کے چھوٹے بھائی علامی فہامی شیخ ابوالفضل پر نظر پڑتی ہے۔ ابوالفضل نے ۱۵ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون کی تعلیم پاکر فراغت حاصل کر لی تھی، ۱۷ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھکر اکبر کی خدمت میں گذرانی، فیضی شاہی بارگاہ سے منسلک ہو چکا تھا، اس کے ذریعہ ابوالفضل کی لیاقت اور ذہانت اکبر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، چنانچہ تخت نشینی کے نویں سال ابوالفضل شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا، پھر تو شاہی جود و کرم کی بارش اتنی ہوئی کہ وہ چار ہزاری منصب پر فائز ہوا، اور وزارت عظمیٰ پر مامور کیا گیا، وہ ایک کامیاب سیاست داں، بیدار مغز مدبر اور ہوشیار سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک بے مثل ادیب، مورخ اور شاعر تھا، اور علامی کے ممتاز لقب سے ہمیشہ یاد کیا جاتا تھا، اس کی قابلیت اور لیاقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تسلیم کی گئی۔ ۔۔۔ مآثر الامراء لکھتا ہے کہ

۱؎ شعر العجم حصہ سوم ص۴۲، ۲؎ دربار اکبری ص۲۳۰،

"بجودتِ طبع و رسائی فہم و علو فطرت و طلاقتِ لسان در کمتر زمانے یگانہ و بے ہمتائی وقت گردید"[۵۱]

اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز جو فارسی کا بھی مسلم الثبوت استاد تھا لکھتا ہے کہ

"شیخ کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی، یہ نعمت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا، ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے، بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں، یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں، اس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصنوعی قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں، وہ انشا پردازی کا خدا ہے، اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے، ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو"[۵۲]

ایک انگریز مورخ اس کے انشاء کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:-

"ابوالفضل کے طرزِ انشا پر کسی قسم کی رائے پیش کرنا بے سود ہے، عبداللہ شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ "وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے" ہندوستان میں ہر جگہ وہ ایک زبردست منشی تسلیم کیا گیا ہے،

---

۵۱ مآثر الامراء حصہ دوم صفحہ ۶۱۰، ۵۲ دربار اکبری صفحہ ۴۹۳۔

اس کے مکتوبات تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، اگرچہ ایک مبتدی ان کو پڑھنے میں مشکلوں اور پیچیدگیوں سے گھبرا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ انشاء کے مکمل نمونے ہیں، ابوالفضل کی کتابوں سے لطف اٹھانے کے لیے نہ صرف فارسی زبان پر کافی عبور بلکہ خود ابوالفضل کے طرز انشا پر کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اس کا طرز بے مثل ہے اور گو اس کی تحریر ہر جگہ پڑھی جاتی ہے لیکن اس کا اتباع نہ کیا گیا ہے، اور نہ کیا جا سکتا ہے[۵]"

ابوالفضل کے مختلف تراجم، اور تاریخی شاہکار اکبر نامہ اور آئین اکبری کا ذکر آ چکا ہے۔ انکے علاوہ انشاء ابوالفضل کشکول، اور جامع اللغات بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں، انشاء ابوالفضل اس کے خطوط کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ اب تک مختلف مدرسوں میں فارسی کے درس میں شامل ہے کشکول میں ابوالفضل کے انتخاب کردہ نثر و نظم کے وہ نمونے ہیں جو اس نے یادداشت کے طور پر وقتاً فوقتاً لکھ لیے تھے، جامع اللغات میں وہ الفاظ مع معانی کے درج ہیں، جو ابوالفضل نے شاید طالب علمی کے زمانہ میں لکھے تھے،

ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے بندھیل کھنڈ کے ایک زمیندار بیر سنگھ کے ہاتھوں سنہ ۱۰۱۱ھ میں قتل ہوا، جب اس حادثہ کی خبر شاہی دربار میں پہنچی تو کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس سانحہ کی خبر اکبر تک پہنچائے، آخر کار ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہنکر دست بستہ اکبر کے حضور میں آیا، چغتائی خاندان کے جب کسی شہزادہ کے انتقال کی خبر آتی تو اس کا وکیل باپ تک اسی طرح خبر پہنچاتا تھا، ابوالفضل کے وکیل کو جب اکبر نے دیکھا تو متحیر ہو گیا، خبر جانکاہ سنکر فرط غم سے نڈھال ہو گیا اور بولا

"اگر شاہزادہ را داعیہ پادشاہی بود مرا کشتے و شیخ را نگاہ داشتے"

---

۵ باہا خ من، تمہید آئین اکبری،

اور پھر یہ شعر پڑھا:-

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ [1]

فیضی اور ابوالفضل کے سلسلہ میں ان کے باپ شیخ مبارک ناگوری کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ خاندان ناگور (نزد اجمیر) کا رہنے والا تھا، شیخ مبارک ناگوری نے گجرات میں خطیب ابوالفضل اور مولانا عماد طارمی سے علوم و فنون حاصل کیے تحصیل تعلیم کے بعد علوم دینیہ کا درس دینے کے لیے آگرہ میں قیام کیا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ ناگوری کی ابتدائی زندگی ریاضت، مجاہدہ، صلاح تقویٰ، توکل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پابندی کے لیے مشہور تھی، استغنار کا یہ حال تھا کہ بادشاہوں کے دربار میں جانے سے ہمیشہ پرہیز کیا، اور زیادہ تر اوقات ریاضت یا علمی مشاغل میں بسر کیے، شاطبی شروع سے آخر تک یاد تھی، کلام پاک کو دس قرأت کے ساتھ حفظ کیا، کلام پاک کی ایک تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العیون کے نام سے لکھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے شیخ ناگوری سے آگرہ میں کئی سال تک تعلیم حاصل کی، وہ رقمطراز ہیں کہ

"ملائے بایں ہمہ جامعیت بنظر نیامدہ"

مگر جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ شیخ مبارک عمر کے آخری حصہ میں حب دنیا و حب جاہ کی خاطر جب اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو صراط مستقیم سے ہٹ کر محضر نامہ ترتیب دیا جس کے بعد دین الٰہی کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔[2]

دربار اکبری کے علم و ادب کے گلدستہ کا گل سرسبد عبدالرحیم خانخانان بن بیرم خان تھا، یہ صاحب قلم اور صاحب سیف دونوں تھا،

---

[1] مآثر الامراء، جلد دوم ص ۶۱۷، [2] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۷۵ - ۱۰۳

بیرم خان کے تعلقات شاہی دربار سے آخر میں خواہ کیسے ہی ہو گئے ہوں، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت تھی کہ وہ ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانیوں میں سے تھا، اس نے اکبر کی دستگیری اور پشت پناہی اس وقت کی جب وہ مشکلوں میں گھر کر بے پناہ ہو رہا تھا، احسان شناس اکبر نے بیرم خان کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے عبد الرحیم کو اپنی تربیت خاص میں لیا، اور اس کی پرورش اور تعلیم اپنی نگرانی میں کی، جب سن شعور کو پہنچا تو خان مرزا کے خطاب سے سرفراز کیا، تھوڑے دنوں میں وہ سپہ سالار بنکر خانخاناں ہوا[۱]، ہم کو اس وقت اس کی شجاعت، تدبر، فتوحات اور جنگی معرکوں سے کسی قسم کی بحث نہیں، بلکہ ہم کو اس کے تبحر علمی، کمال انشا پردازی، علم دوستی اور ادب پروری پر کچھ روشنی ڈالنا ہے،

علمی حیثیت سے خانخاناں کا درجہ نہایت ہی ممتاز اور بلند تھا، دنیا کی اکثر مروج زبانوں پر مہارت تامہ رکھتا تھا، فارسی اس کی مادری زبان تھی، اس کی فارسی نثر اپنی سادگی، شستگی اور برجستگی کے لحاظ سے اب بھی بہت مقبول ہے، تزک بابری کا فارسی ترجمہ جو اس کے قلم کا رہین منت ہے، اب تک انشا کے لحاظ سے بے مثل چیز سمجھی جاتی ہے، اور ارباب ذوق اس کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس نے اپنے فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مگر وہ اب نایاب ہے، مآثر رحیمی میں جس کو خانخاناں کی زندگی میں عبد الباقی نہاوندی نے لکھا ہے، اس کے فارسی کلام کے کثرت سے نمونے درج ہیں،

خانخاناں کی سخن سنجی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ اپنے مشہور ہمعصر شعرا نظیری، عرفی، شکیبی، اور فیضی کے مقابلہ میں غزلیں کہتا اور بعض اوقات سب میں ممتاز رہتا تھا، اس کے

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو مآثر الامرا حصہ دوم صفحہ ۶۹۳،

دربار میں برابر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے، ایک بار طرح تھی، چنداست پنداست، فرزنداست، تمام شعرائے اکبری نے اس زمین پر اپنا اپنا اشہب قلم دوڑایا، مگر میدان خانخاناں کے ہاتھ رہا، حتی کہ نظیری بھی اس کے کلام کی صفائی، شستگی، دلآویزی اور سوز و گداز میں اس سے بازی لے جا سکا۔[۵۱] ہمارے ناظرین بھی اس غزل سے لطف اٹھائیں،

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست ۔۔۔ جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند ست

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست ۔۔۔ نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست

نہ دام دانم و نہ دانہ این قدر دانم ۔۔۔ کہ پای تا بسرش ہر چہ ہست در بند ست

مرا فروخت محبت ولے ندانستم ۔۔۔ کہ مشتری چہ کس ست و بہای من چند ست

ادای حق محبت عنایتیست از دوست ۔۔۔ وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسند ست

ازان خوشم بہ سخنہای دلکش تو رحیم ۔۔۔ کہ اندکے بہ ادا ہای عشق مانند ست

خانخاناں عربی میں بھی اعلیٰ لیاقت رکھتا تھا، نہایت دقیق مغلق اور مشکل عربی عبارت کے معنی نہایت آسانی سے بیان کر دیتا تھا، ایک بار شریف مکہ نے اکبر کو خط لکھا، عبارت اس قدر مشکل تھی کہ ابو الفضل اور فتح اللہ شیرازی کو مفہوم سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہوئی، خانخاناں نے اسے فوراً لیا، خط کی عبارت پڑھتا اور برجستہ ترجمہ کرتا جاتا تھا، جس کی داد تمام اہل دربار نے دی۔[۵۲]

ترکی خانخاناں کی مادری زبان سمجھنا چاہیے، اس زبان میں اس کی لیاقت مسلم تھی، ہندی زبان کا پرگو شاعر تھا، اور سب سے زیادہ اسی زبان میں شاعری کی، مآثر رحیمی میں ہے:-

---

[۵۱] شعر العجم جلد سوم ص۱۵ ۔ [۵۲] مآثر رحیمی، جلد دوم ص۶۰۸

"در زبان ہندی ید بیضا نمودہ اند، چنداں اشعار متین و ابیات دلنشین کہ ایشان در آن زبان دارند ہیچ یک از فحول شعراے آن زبان را نیست، دست از ثبت نمودن آنہا باز داشتہ باشعاری کہ بزبان فارسی فرمودہ اند اکتفا نمودہ و تحمل و انعام و احسانے کہ بشعراے فارسی نمودہ با ایران بہندی زبانان نمودہ باشند، و چندان اشعار کہ آن جماعہ در مدح ایشان گفتہ اند فارسی گویان عشر عشیر نگفتہ اند۔"[1]

یہی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے کہ اکبر کو سلاطین یورپ سے برابر مراسلت کرنی ہوتی تھی، اس لیے خانخانان کو یورپین زبانوں کے سیکھنے کا حکم دیا، جن کو اس نے سیکھا، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن کن زبانوں سے اس نے واقفیت حاصل کی تھی، بہرحال وہ بہت سی زبانوں پر مہارت رکھتا تھا، ماثر الامراء میں ہے:-

"خانخانان در قابلیت و استعداد یکتاے روزگار بود، و او عربی و فارسی و ترکی و ہندی روان داشت، شعر خوب می فہمید و می گفت، رحیم تخلص می کرد، گویند کہ با کثر زبانہا کہ در عالم رائج است حرف می زد۔"[2]

خانخانان نے اپنے علمی ذوق کے نشو و نما کے لیے ایک بے نظیر کتبخانہ قائم کیا تھا، جسمیں زمانہ کے مشہور شعراء نے اپنے دیوان خود لکھکر داخل کئے تھے، دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی دار الحکمت کے تربیت یافتہ تھے، عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری، محتشم کاشی، رسمی، نوعی شیرازی، ثنائی خراسانی، کفوی، اور معزی وغیرہ جیسے بلند پایہ شعراء اس کی زریں تیغ سے ہمیشہ فیضیاب ہوا کرتے تھے، اس کی علم پروری اور فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی نے

---

[1] ماثر رحیمی ج ۲ ص ۵۶۳، ہندی میں اس کی تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں: (۱) دوہاولی (۲) نگر شوبھا (۳) بروے نایکہ بھید (۴) بروے (۵) شرنگار سورٹھا (۶) مدناشٹک (۷) رحیم کا دیہ (۸) کھیٹ کوتک (۹) پنچ ادھیائی، رسالہ ہندوستانی جنوری ۱۹۳۱ء الہ آباد

[2] ماثر الامراء ج ۲ ص ۷۰۹

کو سونے میں تلوا دیا،[1] نظیری نے ایک بار کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے، خانخاناں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر جمع کر کے دکھایا، پھر وہ ڈھیر اسکے گھر بھجوا دیا،[2] کہا جاتا ہے کہ ایک ہندی شاعر گنگ کو می کو اس نے ایک بار چھتیس لاکھ روپے انعام میں دیے، اس کی یہ غیر معمولی فیاضی باپ سے بھی وراثت میں ملی تھی، خانخاناں بیرم خان کو ہاشمی قندھاری کی ایک غزل بہت پسند آگئی۔ اسنے ہاشمی کو ایک لاکھ ٹنکہ دے کر یہ غزل اپنی طرف منسوب کر لی،[3]

خانخاناں عبد الرحیم ہی کی طرح اکبری دربار کے ایک دوسرے عظیم المرتبت امیر **حکیم ابو الفتح گیلانی** نے بقول مولانا شبلی نعمانی مرحوم شاعری کی ایک اکیڈمی لبیت العلما قائم کر رکھی تھی، اکبر کے مزاج میں حکیم ابو الفتح گیلانی کو وہی دخل تھا، جو جعفر برمکی کو ہارون رشید کے مزاج میں تھا، حکیم ابو الفتح نے آقا کی تقلید میں اپنے یہاں بھی علم وفن کی بزم اسی شاہانہ انداز میں گرم رکھی، اور اسی کی بدولت شعرا نے ایشان بڑی ترقی کی، مولانا شبلی شعر العجم میں ابو الفتح کے مجموعہ مکاتیب چہار باغ سے ایک خط نقل کرتے ہیں جو اس نے خانخاناں کو لکھا تھا،

قصائد کہ یاران آن جا گفتہ بودند، بشعراے ایں جا فرسودہ شد، بنام نامی شما ہر گاہ باتمام می رسید، بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد، ملا عرفی، وملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند

[1] خزانہ عامرہ تذکرہ نویسی، [2] مآثر الامراء حصہ دوم ص[؟] [3] بیاض (۲) (قلمی) نسخہ دار المصنفین، وہ غزل ملاحظہ ہو:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ ۔۔۔ در دست دل ز غم از پا فتادۂ
دیوانۂ در کمر کوہ گشتۂ ۔۔۔ بے اختیار سر بہ بیابان نہادۂ
گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ ۔۔۔ گہ چون فتیلہ با دل ہر آتش فتادۂ
بیرم ز فکر اندک وبسیار فارغیم ۔۔۔ ہر گونہ گفتہ ایم کمی یا زیادۂ

مآثر رحیمی کے مولف کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اکثر شعرا خصوصاً خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا قلی میلی، فیضی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی، مرزا نور الدین محمد قراری وغیرہ نے ابوالفتح گیلانی ہی کے یہاں تربیت پائی، اور یہ حکیم ہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا، کہ ان شعرا نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعت ایہام، استعارات، تشبیہات، فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی ترکیبوں میں طرح طرح کی جدت پیدا کی، جو اس زمانہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے[1]، حکیم ابوالفتح کی کچھ تصانیف بھی تھیں، فلسفہ و حکمت میں فتاحی اور قیاسیہ اور انشا میں چار باغ اس کی طرف منسوب ہے[2]،

ان ارباب کمال میں ملا عبد القادر بدایونی کا درجہ علمی حیثیت سے کم ممتاز نہیں تھا، ملا صاحب ۹۸۱ھ میں شاہی دربار میں ملازم ہوئے[3] عربی، فارسی، سنسکرت، تفسیر اور تاریخ کے جلیل القدر عالم تھے، اس لیے تصنیف تالیف اور ترجمے کے کام پر مامور ہوئے، علاوہ تنخواہ کے وقتاً فوقتاً انعامات و اکرامات سے مالامال ہوتے رہے، آواز بڑی شیریں اور دلکش پائی تھی، اس لیے شروع میں شاہی امام بھی مقرر ہوئے، ان کے مختلف تراجم اور تاریخ الفی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ اور بھی تالیفات ہیں، نجات الرشید[4]، کتاب الاحادیث[5] اور منتخب التواریخ،

ملا صاحب کی تمام تصانیف میں منتخب التواریخ نے بڑی شہرت حاصل کی ہے، یہ تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں اکبر کے قبل سلاطین ہند کے واقعات ہیں، دوسرے میں اکبر کے حالات ہیں، تیسرے میں علما، فقرا، اور شعرا کا ذکر ہے، البتہ اس تاریخ

---

[1] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۵۴۴، و شعر العجم حصہ ۳ ص ۱۲، [2] بدایونی ج ۲ ص ۱۶۷، [3] ایضاً ص ۱۷۳، [4] اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ میں موجود ہے [5] ایضاً ج ۱ ص ۶،

کے بارے میں لکھتا ہے :-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جن کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا، لیکن اس کیلئے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہمعصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف نامانوس الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو وذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، اور پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے، لیکن ہمیں اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں، بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں۔"[1]

محمد حسین آزاد نے ملا صاحب سے اس لیے خوش نظر نہیں آتے ہیں کہ وہ ان کے ممدوحین کو اچھے الفاظ سے نہیں یاد کرتے ہیں، اس کتاب کی سب سے "بڑی خوبی" یہ بتائی ہے کہ ملا صاحب نے اس تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔[2]

اس کتاب کی صاف گوئی اور حق پسندی کے سبب جہانگیر نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کر دی تھی، بات یہ تھی کہ ملا صاحب بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو خلاف شرع و مذہب سمجھ لیتے تھے، پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے، اکبر کے مذہبی خیالات کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے، اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کا باعث ہوئے تھے، ان کو کاذب، ملحد، کافر، ملعون، بے دین، زندیق، بدبخت کے الفاظ سے

[1] الیٹ ج ۵ ص ۴۷۹ ، [2] دربار اکبری ص ۱۱۹

یاد کرتے، اور ان تمام خیالات کو اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی ذلت بلکہ جان و مال کے نقصانات کا سبب قرار دیتے ہیں، اسی لیے فیضی اور ابوالفضل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، مگر باوجود ان کے سخت عقائد کے ان کے علمی تبحر کو سب تسلیم کرتے تھے، عظیم الشان علمی کاموں کے لیے شاہی دربار سے ہمیشہ ملک الشعرا فیضی یا علامہ ابوالفضل، یا ملا عبدالقادر منتخب کیے جاتے تھے، اکثر تینوں یا ملا صاحب ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر علمی کارنامے انجام دیتے تھے، فیضی ملا صاحب کی قابلیت کا بہت معترف تھا، کچھ دنوں اکبر نے ملا صاحب کی طرف سے بے التفاتی برتی تھی، اس پر فیضی نے بارگاہ شاہی میں ایک عریضہ لکھا، جس میں اکبر سے خطا پوشی اور عطا پاشی کی درخواست کی، پہلے ملا عبدالقادر کی لیاقت و قابلیت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:-

"شکستہ نوازا، ملا عبدالقادر اہلیت تمام دارد و علوم رسمی آنچہ ملایان ہندوستان می خوانند خواندہ پیش خدمت ابوی کسب فضیلت کردہ و قریب بیست و ہفت سال میشود کہ بندہ او را می دانم و بافضیلت علمی طبع نظم و سلیقہ انشاے عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب یاد داشت، بہرہ وافی و وقوف در نغمہ ولایت و ہندی خبرے از شطرنج صغیر و کبیر دارد و مشق بین بقدری کردہ باوجود بہرہ مند بودن از ہمہ فضائل بہ بے طمعی و قناعت و کم تردد نمودن و راستی و درستی و ادب و نامرادی و شائستگی و گذشتگی و بے تعینی و ترک اکثر رسوم تقلید و درستی اخلاص و عقیدت درگاہ بادشاہی موصوف است"

پھر اس کی سفارش ان الفاظ میں کرتا ہے:-

چوں درگاہ راستان است دریں وقت کہ بے طاقتی زور آوردہ بندہ خود را

حاضر پایۂ سریر والا و التماس احوال او بعرض رسانید اگر در یں وقت بعرض نمی رسانید نوعی از ناراستی و بے حقیقی بود حق سبحانہ بندہائے درگاہ را در سایہ فلک پایۂ حضرت پادشاہ براہ راستی و حق گذاری و حقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید و آں حضرت را بر کل عالم و عالمیاں سایہ گستر و شکستہ پرور و عطاپاش و خطا پوش بہزاران ہزار دولت و اقبال و عظمت و جلال دیر گاہ داراد بعزت پاکاں درگاہ الٰہی و روشن دلان سحر خیز صبح گاہی آمین آمین[1]"

بعد کے اہل علم نے بھی ملا صاحب کی تعریف بجا طور پر کی ہے، بختاور خان عالمگیری مراۃ العالم میں لکھتا ہے:-

"ملا عبدالقادر بدایونی جامع معقول و منقول بود و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقہ انشائے عربی و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمہ ولایتی و ہندی بمرتبہ کمال داشت و قادری تخلص بود"[2]

علم و ہنر کے آسمان کا ایک دوسرا درخشندہ ستارہ خواجہ نظام الدین احمد تھا، خواجہ نظام دربار اکبری کے پنجہزاری امراء میں تھا، جو اس عہد کی بڑی معراج تھی، گجرات میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھا، صاحب ثروت و عزت ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھا، ۱۰۰۲ھ میں طبقات اکبری لکھی جس نے اس کو حیات جاوداں بخشی، یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کی بہت ہی جامع تاریخ ہے، مصنف نے اپنی معلومات ان تمام مستند ماخذوں سے حاصل کئے ہیں، جو اس وقت ممکن صورت سے دستیاب ہو سکتے تھے، کتاب کے آغاز میں اپنے ماخذوں کے جو نام گنائے ہیں ان کی تعداد تیس ہے، اسی لیے یہ کتاب ہمیشہ

---

[1] بدایونی جلد ۳ ص ۵-۳۰۴ [2] منتخب اللباب خافی خان جلد ۱ ص ۲۴۳،

مستند تاریخوں میں شمار کی گئی ہے، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ اسی کی مدد سے تیار کی، تاریخ سلاطین افغانان کے مصنف نے تو بعض بعض حصے خصوصاً ہمایوں کے حالات لفظ بلفظ اسی سے نقل کر لیے ہیں، فرشتہ نے اس کو ایک مکمل تاریخ بتایا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، مآثر الامرا میں ہے،

چونکہ مصنف نے واقعات کی تنقیح میں باریک بینی، جزئیات کے استقصا، اور معلومات کے جمع کرنے میں پوری کوشش کی ہے، اور میر معصوم بھکری وغیرہ جیسے اہل کمال اس تالیف میں شریک تھے، اس لیے وہ نہایت معتبر ہے، اور وہ پہلی تاریخ ہے جو ہندوستان کے تمام اسلامی بادشاہوں کے حالات کی جامع ہے، اور تاریخ فرشتہ کے مصنف اور دوسرے تتبع کرنے والوں کا جنھوں نے ان کے حالات کا اخذ کیا ہے، مرغوب ماخذ یہی کتاب ہے[1]

منتخب اللباب حصۂ اول میں ہے،

نظام الدین ہروی محمد اکبر بادشاہ کا بخشی تھا، اس نے ایک تاریخ لکھی جس میں صوبہ دکن کے اکیس بادشاہوں کے حالات تھے، اس کا نام تاریخ نظامی رکھا، اس میں ۱۰۰۲ھ تک اکبر بادشاہ کا ذکر کیا ہے، اکثر سلاطین دکن کے حالات میں اس کا بیان اعتماد کے لائق نہیں ہے، محمد قاسم فرشتہ کے علاوہ جس مورخ نے بھی سلاطین دکن کا حال لکھا ہے، اس کا بیان قابل اعتبار نہیں، لیکن چونکہ نظام الدین نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں عمر صرف کر دی تھی، اس لیے اس بادشاہ کی سلطنت کے حالات میں وہ قابل وثوق ہے[2]

یورپین مورخین میں یہ کتاب بہت مقبول ہے، ارسکن کا خیال ہے کہ اس زمانہ کا بہترین

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۲۶۳ [2] خافی حصہ اول ص ۲۳۶،

مورخ نظام الدین تھا، کرنل لیس کو افسوس ہے کہ اس کتاب کو اتنی مقبولیت نہیں ہوئی جتنی چاہیے تھی، ایلیٹ لکھتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت ہی مشہور کتاب ہے، جو جدید طرز پر لکھی گئی ہے[1]۔

خواجہ نظام الدین کا انتقال ہوا تو ملا عبد القادر بدایونی نے اس طرح ماتم کیا جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے،

وہ تپ محرقہ میں ۴۵ سال کی عمر میں جان بحق ہوا، اور نام نیک کے سوا اپنے ساتھ کچھ نہیں لے گیا، دوست و احباب نے جو اس کے حسن و اخلاق کو دیکھ کر بڑی امیدیں رکھتے تھے، اشک حسرت بہائے اور سینے پر نا امیدی کے پتھر رکھے، اس حقیر کو بھی اس سے بڑا دینی اخلاص تھا، اور کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہ تھی، مجبوراً صبر و تحمل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پایا، اور یہی پرہیزگاروں کا شیوہ ہے، مگر اس واقعہ کو سب سے بڑی مصیبت سمجھ کر اس سے پوری عبرت حاصل کی، اور پھر کسی انسان سے محبت نہیں کی، اور گمنامی کے گوشہ میں بیٹھ رہا[2]،

بدایونی نے وفات کی تاریخ کہی، ع گوہرے بہا ز دنیا رفت[3]،

فضلاء اکبر کے دربار کے فضلاء کی فہرست اتنی طویل ہے، کہ اگر ہم ان کو تفصیل سے بیان کرنا شروع کریں تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی، ملا عبد القادر بدایونی نے اس عہد کے مشائخ، فضلاء، اطباء اور شعراء کا ذکر ایک مستقل جلد میں کیا ہے، جو ۴۰۹ صفحوں پر مشتمل ہے، ہم ان میں سے بعض ارباب علم و اصحاب فن کو ناظرین سے روشناس کرکے ان کی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے؛

---

[1] ایلیٹ ج ۵ ص ۱۷۸، [2] بدایونی ج ۲ ص ۳۹۶، [3] ایضاً

میر فتح اللہ شیرازی۔ کبھی میر، کبھی امیر، اور کبھی شاہ ان کے نام کا جزو تھا، شیراز سے بیجاپور آئے، اور ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے علی عادل شاہ کے معلم مقرر ہوئے، ان کے فضل و کمال کی شہرت پورے ہندوستان میں گونجی، فیضی دکن پہنچا تو ان سے ملا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار سے متوسل ہوئے، بیجاپور سے اکبر کے دار السلطنت کے قریب پہونچے، تو اکبر نے خانخاناں عبد الرحیم اور ابو الفتح گیلانی کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا، اور خود ان سے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ پیش آیا، صدارت کے منصب پر سرفراز کرکے پرگنہ بسادر، بیسدا ور محلی جاگیر میں عطا کئے، ترقی کرکے سہ ہزاری منصب پر بھی فائز ہوئے، تفسیر، کلام، حدیث، حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل اور حساب میں ان کی علم دانی کا پایہ بہت بلند تھا، اپنے نجوم و رمل کے کمالات سے اکبر کے زائچہ کی تصحیح کی، اکبر کی فرمائش سے ایک نئے سنہ کی داغ بیل ڈالی جس کا نام سنہ الٰہی اکبر شاہی قرار پایا، ۹۹۳ھ میں امین الملک بنائے گئے، اور راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ امور سلطنت کے انصرام میں مصروف ہوئے، دفتر مال و دیوانی کی بہت سی اصطلاحات ان ہی کی وجہ سے رائج ہوئیں، اسی سال اکبر نے ان کو عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کرکے خان اعظم کے ساتھ دکن بھیجا، تاکہ اس صوبہ کو سلطنت تیموریہ کے زیر نگیں کرنے میں معاون ہوں، یہ مہم ناکام رہی، اکبر جب ۹۹۳ھ میں کشمیر پر حملہ آور ہوا تو شاہ فتح اللہ بھی اس کی معیت میں تھے، اور یہ برابر مجلس مشورت میں شریک ہوتے تھے، ۹۹۷ھ میں اکبر کابل سے کشمیر جا رہا تھا، تو شاہ صاحب بھی شاہی جلو میں تھے، راستے میں یکایک تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کردی، اکبر ان کی موت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا اور بار بار کہتا تھا کہ

"میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود"

فیضی نے ان کی موت پر ایک غمناک مرثیہ کہا جس میں ۱۰۴ اشعار تھے، وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے انجنیر اور موجد بھی تھے، ایک ایسی چکی بنائی تھی جو خود بخود ہوا سے حرکت کرتی تھی، ایک آئینہ بھی ایجاد کیا تھا جو نزدیک اور دور کے عجیب وغریب تماشے دکھاتا تھا، ایک قلعہ شکن توپ بنائی تھی جو چوڑیوں کی طرح الگ الگ ہو جاتی تھی، ایک ایسی بندوق بھی تیار کی تھی جو ایک ہی بار بارہ گولیاں چلاتی تھی، معاصر اہل علم ان کے علمی پایہ کے معترف تھے، طبقات اکبری میں نظام الدین احمد لکھتا ہے:-

امیر فتح اللہ (یان کہ در جمیع علوم عقلی و نقلی در ایران و ہندیل در ربع مسکون قرین خود ندانستند) از نیر نجات و طلسمات ماہر بود،

ان کے نام سے یہ تصانیف منسوب ہیں (۱) تفسیر منہاج الصادقین فی الزام المخالفین (۲) خلاصۃ المنہج (۳) اقبال نامۂ اکبری (۴) حالات کشمیر (۵) زیج جدید، تاریخ الفی کی تدوین میں بھی شریک رہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے[1]،

مولانا عبداللہ سلطانپوری، سلطان پور مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، اپنے عہد کے جید علماء میں سے تھے، عربی، اصول، فقہ، تاریخ اور علوم منقولات میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں عصمۃ انبیاء، شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شرح ملا مشہور تھیں، تیموریوں سے پہلے سلاطین افغانان بھی ان کے بڑے قدردان تھے، شیر شاہ نے ان کو صدر الاسلام کا خطاب بخشا تھا، سلیم شاہ نے اپنے تخت پر ساتھ بٹھا کر ان کی خدمت میں بیس ہزار روپے کی ایک مروارید کی تسبیح پیش کی تھی، ہمایوں نے از راہ قدردانی ان کو مخدوم الملک

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اکبر نامہ ج ۱ ص ۳۳ و ج ۲ ص ۴۴۰، ۵۰۰، ۱۰۴، ۳۹۱، منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۷۰ - ۳۱۸ - ۳۱۶ - ۳۱۵، مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۰۱ - ۱۰۴ و معارف نمبر ۵ ج ۱۴،

اور شیخ الاسلام کے القاب عطا کئے تھے، وہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے، اور بہر حال میں شریعت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، بیرم خاں نے ایک لاکھ روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی، اکبر کے زمانہ میں شاہی دیوان خانہ کے وکیل تھے، اور جب ۹۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے ذاتی خزانہ سے تین کروڑ روپے نکلے[1]، اکبر کی حمایت میں جو محضر نامہ ترتیب دیا گیا تھا، اس پر طوعاً و کرہاً انھوں نے بھی اپنا دستخط ثبت کیا تھا، محضر نامہ کی تدوین کے بعد ان کے اور اکبر کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔

مولانا میر سید محمد میر عدل۔ امروہہ کے رہنے والے تھے، علم حدیث میں مولانا میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، اپنے علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کے لیے بھی مشہور ہوئے، اکبر نے اپنے دربار سے منسلک کر کے ان کو میر عدل کے عہدہ پر مامور کیا، اور جب تک وہ اس عہدہ پر رہے ملک سے خیانت اور الحاد کا انسداد کرتے رہے، ۹۸۴ھ میں بھکر کی حکومت ان کو تفویض کی گئی، ۹۸۵ھ میں جوار رحمت حق سے پیوست ہوئے[2]،

شیخ عبد النبی۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے اور حضرت شیخ احمد کے لڑکے تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں علم حدیث کی تعلیم حاصل کی، ہندوستان واپس آئے تو اپنے تقویٰ طہارت، نزاہت اور عبادت کے لیے مشہور ہوئے، اکبر نے متاثر ہو کر ان کو عہدۂ صدر الصدور پر فائز کیا، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ کسی سلطنت میں منصب صدارت کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ شیخ عبد النبی کے زمانہ میں ہوئی،

"چوں بمنصب صدارت رسید جہان جہان زمین مدد معاش و وظائف و اوقاف بخلاق بخشید، چنانچہ در زمان ہیچ پادشاہی ایں چنیں صدری باستقلال نگشتہ و عشر عشیر

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۷۰، ۷۱، مآثر الامراء ج ۳ ص ۲۵۲، ۲۵۳، وتذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳ [2] ایضاً ص ۷۶ و ۷۷،

ایں اوقاف کہ او داوہ نداوہ"

اکبر کو شیخ عبد النبی سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، ان کے گھر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے اس کی مذہبی خود رفتگی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسجد میں خود اذان دیتا، اور ثواب کی خاطر مسجد میں جھاڑو بھی دیتا تھا، ایک دفعہ اس نے سالگرہ کی تقریب میں کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبد النبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ سر دربار لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر ماں سے شکایت کی کہ شیخ خلوت میں منع کرتے تو کوئی ہرج نہ تھا، دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا "بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اخروی کا باعث ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال ملّا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی، اور سعادتمند بادشاہ نے اس کو برداشت کیا"[1] مگر بعض مقربان بارگاہ نے اکبر کو شیخ کی مذہبی متحجرانہ کے خلاف ابھارا تو اس کی یہ عقیدت کدورت میں تبدیل ہوگئی، جب محضر نامہ کا فتنہ اٹھا تو شیخ عبد النبی نے بجبر و اکراہ اس پر دستخط کیا، اکبر کی ناگواری اور بھی بڑھی، اور اس نے شیخ کو حج بیت اللہ کے لیے جانے پر مجبور کیا، اور خواہش کی کہ وہ وہاں سے واپس نہ آئیں، مگر شیخ کچھ دنوں کے بعد حج سے واپس آگئے، جس سے اکبر کی کدورت میں اور بھی اضافہ ہوگیا، اکبر نے ان کو قید کر دیا اور وہ قیدخانہ ہی میں ۹۹۱ھ میں عالم بقا کو سدھارے، ان کی ایک تالیف وظائف النبی صلعم کا قلمی نسخہ دار المصنفین (اعظم گڑھ) میں ہے، سماع کے انکار میں بھی ایک رسالہ لکھا، امام قفال مروزی شافعی نے امام ابوحنیفہ کے خلاف جو طنز کیا ہے اس کے رد میں بھی ایک رسالہ تحریر کیا[2]،

مشہور شیعی عالم قاضی نور اللہ شوستری (مؤلف مجالس المومنین) بھی دربار سے

[1] مآثر الامرا جلد دوم ص۵۶۵، [2] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۸۲-۹۰-۸۹ و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۴،

وابستہ تھے، وہ اپنے علم، حلم، نیک نفسی، زہد، تقویٰ، اور جود و سخا کے لیے مشہور تھے، اکبر نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کیا، جہاں ان کی دیانت اور عدل پروری کا ہر شخص معترف تھا،

شاہی دربار کے بہت سے اطبا ایسے بھی تھے جو نہ صرف اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ مختلف علوم پر بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، حکیم ابو الفتح گیلانی کا ذکر پہلے آچکا ہے، حکیم الملک شمس الدین اپنے زمانہ کا جالینوس تھا، علم منقولات میں بھی اس کی لیاقت مسلم الثبوت تھی، حکیم عین الملک شیرازی علم کحل کا بڑا ماہر تھا، شعر و شاعری سے بھی اسکو دلچسپی تھی، تخلص دوائی رکھتا تھا، حکیم مصری کو علم عروض و تکسیر و موسیقی میں بڑی مہارت تھی، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا، حکیم علی گیلانی حکیم الملک کا بھانجہ تھا، اپنے خالو شاہ فتح اللہ شیرازی سے طب کی تعلیم پائی، اور شیخ عبدالنبی سے علوم منقولات حاصل کیے، جہانگیر اس کی عربی دانی کا بہت معترف تھا، اس نے قانون کی ایک شرح بھی لکھی، حکیم ہمام حکیم ابو الفتح گیلانی کا بھائی تھا، اس کا اصل نام ہمایوں تھا، اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا تو ہمایوں کے نام کے احترام کی خاطر نہایت خاکساری میں اپنے کو ہمایوں قلی کہنے لگا، مگر اکبر نے اس کا نام ہمام رکھا، جس کے معنی بلند مرتبہ سردار کے ہیں، اکبر اس کو بہت عزیز رکھتا تھا، اور گو شش صدی منصبدار رہا لیکن دربار کا بہت ہی با اثر درباری اور امیر تھا، تاریخ الفی کی تدوین میں حکیم علی اور حکیم ہمام بھی شریک تھے، وہ توران شاہی سفیر بنا کر بھیجا گیا، وفات کے بعد بہت بڑی دولت چھوڑی، حکیم احمد ٹھٹھوی، حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم مظفر اردستانی، شیخ بینا، اور حکیم مسیح الملک شیرازی بھی ذی علم فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، (دیکھو منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۱۷۰ - ۱۹۱ و طبقات اکبری جلد ۲ ص ۴۸۰ و ۴۸۱)

ہم طوالت کے خیال سے تمام علما و فضلا کا ذکر کرنے سے قاصر ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں دانش اندوزان جاوید دولت کے عنوان سے ان کی پانچ

قسمیں کی ہیں،

(۱) **خداوند تین** - جس میں شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن امن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبد العزیز، شیخ اللہدیہ، شیخ عبد الغفور وغیرہ تھے،

(۲) **خداوند باطن**، شیخ رکن الدین محمود کانگر، شیخ امان اللہ، خواجہ یحیٰ الشہید، شیخ موسیٰ، شیخ علاء الدین مجذوب، شیخ سلیم چشتی، شیخ محمد غوث گوالیاری وغیرہ،

(۳) **دانندہ معقول ومنقول**، میر شیخ اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشکندی، مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین حکیم مصری، مولانا صادق وغیرہ،

(۴) **شناسای عقلی کلام**، مولانا پیر محمد، مولانا عبد الباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نور الدین ترخان وغیرہ،

(۵) **پزشکان**، حکیم مصری، حکیم الملک، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم علی گیلانی، حکیم ارسطو، حکیم مسیح الملک، حکیم لطف اللہ، حکیم ہمام، حکیم شفائی، شیخ بینا وغیرہ،

خوانای نقلی مقال، میاں حاتم، مولانا عبد القادر، مخدوم الملک، میر عبد اللطیف میر نور اللہ، شیخ عبد النبی صدر جہاں، شیخ منو وغیرہ،

ان کے علاوہ اس عہد میں بہت سے اور صلحا و علما بھی تھے، مثلاً شیخ عبد الحق دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤد جہنی وال وغیرہ، جن کے فیوض و برکات سے عوام و خواص متمتع ہوتے رہے، مگر پھر بھی علمائے سو کی فتنہ سامانیوں سے اس دور میں ضلالت و گمراہی اتنی بڑھی کہ افق اسلام پر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا ظہور ہوا اور اس مجدد اعظم نے ہندوستان کے ظلمت کدہ کی تیرگی و تاریکی کو اسلام کی ضیا پاشی سے ایک بار پھر منور کر دیا۔

شعراء | اکبر کی فیاضیاں اور زرپاشیاں سنکر ہر جگہ سے شعراء ہندوستان میں امنڈ آئے تھے، ملا بدایونی نے اس عہد کے ایک سو چھ[۱۰۶] شعراء کے حالات لکھے ہیں، اور ان کے کلام کے نمونے درج کئے ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں پچتر اور خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں اکاسی ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دربار میں پہنچکر تقرب حاصل کیا، اکبر نہ صرف ان پر سیم وزر کی بارش کرتا، بلکہ ان کی ہمت افزائی اور ان کے ذوق سخن کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی مامور ہوا، غزالی عراق سے ہندوستان آیا، تو اکبر کے درباری امیر خان زمان حاکم جون پور نے ایک ہزار روپے زاد راہ بھیج کر اس کو اپنے دربار میں بلایا، یہاں ایک مثنوی نقش بدیع لکھکر خان زمان کی خدمت میں پیش کی، جس میں ایک ہزار شعر تھے، سخن سنج اور سخن فہم خان زمان کو یہ مثنوی اس قدر پسند آئی کہ فی شعر ایک اشرفی انعام دیا[۱]، خان زمان کی وفات کے بعد غزالی اکبر کے دربار سے منسلک ہوگیا، ابوالفضل نے اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:-

"یہ بلند فہمی و شیوا زبانی طرازِ یکتائی داشت و از دلآویزیٔ گفتار صوفی بہرہ مند"

(آئین اکبری ص۱۶۳)

ان ہی شاعرانہ اوصاف کی بنا پر اس کو ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا، بہت ہی پرگو شاعر تھا، کئی دیوان اور کئی مثنویاں مثلاً مشہد انوار، مرآۃ الصفات، نقش بدیع، اور قدرت آثار لکھیں، ملا بدایونی اسکی شاعری کے بہت زیادہ مداح نہیں، مگر اس کی شاعری کی کمیت و کیفیت کے معترف (ہیں) لکھتے ہیں:-

---

[۱] خزانۂ عامرہ قلمی نسخہ بحوالہ شعر العجم حصہ سوم ص۱

"اگرچہ سخن او رتبۂ عالی چنداں ندارد اما در کمیت و کیفیت اشعار او زیادہ از ہمہ اقرانست بزبان تصوف مناسبت تمام دارد۔" (جلد سوم ص۴۱)

سنہ ۹۸۰ھ میں احمد آباد میں وفات پائی، اور سلاطین و مشائخ کے مقبرہ میں دفن ہوا، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں، مرأۃ الصفات اکبر کی ستائش میں لکھی گئی، اس میں کہتا ہے۔

"تاج دہ تارک رویین تناں — سرشکن گبر قوی گردناں
شاہ فلک مسند خورشید رخش — ملک ستانندہ و اقلیم بخش
گر بکشد تیغ جہاں سوز را — قطع کند سلک شب و روز را
ور نخورد مہرے از جام او — تیغ شود موے بر اندام او
سوے فلک گر فگند چشم کین — آب شود چرخ در رود زمین
رائے وی از عقل جوان پیر تر — بخت وی از صبح جہانگیر تر
ابر حیا کان کرم بحر جود — تازہ گل گلشن چرخ کبود

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱۶) میں غزالی کی مثنوی نقش بدیع کے حسب ذیل اشعار کی داد دی ہے۔

خاک دل آں روز کہ می بیختند — شبنمے از عشق برو ریختند
دل کہ بدآں رشحہ غم اندود شد — بود کبابے کہ نمک سود شد
بے اثر مہر چہ آب و چہ گل — بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل
ذوق جنوں از سر دیوانہ پرس — لذت سوز از دل پروانہ پرس

غزالی کے بعد **ابوالفیض فیضی** ملک الشعراء ہوا، جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، فیضی کی خوش بیانی، جدت طبع اور فلسفیانہ خیالات پر مولانا شبلی مرحوم کا ایک بے مثل تبصرہ شعر العجم حصہ سوم میں ملے گا، اس تبصرہ کی موجودگی میں فیضی کی شاعری پر مزید

روشنی ڈالنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے، پھر بھی ہم یہاں پر فیضی کے کچھ مدحیہ اشعار نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس سے اس کی شاعری کی شوکت و عظمت کے ساتھ ساتھ اکبر کی ذات سے اس کی [illegible] و شیفتگی کا بھی اندازہ ہوگا،

شاہنشاہا! خسرو پژوہا! ‏ ‏ دریا گہرا! فلک شکوہا!

بزمے است جہان بعیش پیوست ‏ ‏ دور تو شراب و آسمان مست

امروز برین نوائے چو شہد ‏ ‏ من یار بدم تو خسرو عہد

زین جامہ کہ کردہ ام فلک سائے ‏ ‏ پیش تو نہادہ ام بیک پائے

این نامہ کہ عشق بر زبان برد ‏ ‏ طغرائے ترا بہ آسمان برد

این چار ہزار گوہر ناب ‏ ‏ کانگیختہ ام بہ آتشین آب

بپذیر کہ آب گوہر تست ‏ ‏ از بہر نثار افسر تست

پیمانۂ من اگر شد پر ‏ ‏ دریا کنمت نثار ز دُر

گر عشق چنین سبو زند پاک ‏ ‏ مہتاب برون تراوم از خاک

بگداختہ آبگینۂ دل ‏ ‏ آئینہ دہم بدست محفل

آنم کہ بہ سحر کاری ژرف ‏ ‏ از شعلہ تراشش کردہ ام حرف

بانگ قلمم درین شب تار ‏ ‏ بس معنی خفتہ کرد بیدار

صبح بہ فیض پادشاہی ‏ ‏ من بودم و باد صبح گاہی

مثنوی نل دمن لکھتے وقت اکبر کی شان میں کہتا ہے:-

اے پایۂ فرزانے ہفت اورنگ ‏ ‏ میزان عدالتت گران سنگ

فیض تو بروزگار مفتوح ‏ ‏ چون بادہ بچشم و نغمہ با روح

صد باغ طرب بہ بزم گاہت | صد خم کدہ بادہ در نگاہت
اے از تو جہان سکون گرفتہ | با تیغ تو فتنہ خون گرفتہ
رحمت کہ گل لطف پروراندہ | از خار ترا انگبین فشاندہ
ہر جا غرور کج کلاہے | سر کردۂ فتنۂ شد سیاہے
تیغ تو کلہ ربودہ سر ہم | این زہرہ ترا است وین جگر ہم
آفاق بشام گاہ دیجور | از نیمۂ رائیت پر نور
آنرا کہ نشاط جاودانی ست | بیداری شب حیات آنی ست

فیضی کی علم دوستی بھی مشہور تھی، وہ اہل علم کے ساتھ غیر معمولی فیاضیاں کرتا تھا، حیدر معمائی نے اس کی تفسیر کی تاریخ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ سے نکالی، تو اس نے دس ہزار روپے انعام میں دیے، محمد جمال الدین عرفی شیرازی ہندوستان آیا، تو فیضی ہی کا مہمان ہوا، فیضی نے اس کی پوری قدر دانی کی، اور اس کی ضروریات کی کفالت کرتا رہا، مگر وہ اپنی نخوت پرستی کے سبب فیضی سے الگ ہوکر اکبر کے دوسرے جلیل القدر امیر حکیم ابو الفتح گیلانی کے دربار سے وابستہ ہوگیا، اس کی وفات کے بعد عبد الرحیم خانخاناں کے دربار کے ارباب کمال میں داخل ہوا، اپنے غرور، پندار اور خود ستائی میں اکبر کے دربار سے بے نیاز رہنا چاہتا تھا، پھر بھی اکبر اس کی طرف ملتفت ہوا، اور عرفی نے اس کی شان میں کئی قصیدے کہے، پہلے قصیدہ میں اپنی جولانی طبع اس طرح دکھائی ہے:-

اے دل معنی سرشت راز دان آفتاب | تا ابد بر خوان دولت میہمان آفتاب
بر کمال دولتت ہر کس کہ بیند بنگرد | از شراب تربیت رطل گران آفتاب
دولت جمشید ہمدوشی کند با دولتت | گر تواند سایہ بودن ہم عنان آفتاب

کاروان سالار شاہان آفتاب آمد ولے — چون تو نامد یوسفی در کاروان آفتاب
رہ ہر سرکش رام شد در زیر ران دولتت — چون سمند آسمان در زیر ران آفتاب
طوطی نطقم چو در مدحت شکر خائی کند — آب گردم از ذوق گردد در دہان آفتاب
تا لوائے دولتت انگشت زد از اوج عرش — اہل معنی را نشد معلوم شان آفتاب
ہمچو شمعی کان برافروزند از شمع دگر — از یکے نور است جان شاہ و جان آفتاب
فیض می تابد ز ذاتت چون نتابد کز ازل — گوہرت را پرورش داد است کان آفتاب
سجدہ گاہ ہفت اقلیم است مسندگاہ تو — قبلۂ ہفت آسمان است آستان آفتاب
ہر کجا آماج گاہی طلعتت آمادہ کرد — می جہد تیر سعادت از کمان آفتاب
گر ہمائے آفتاب آرام گہ می داشتی — جائے اکبر شاہ بودی آشیان آفتاب
وصف شاہ از ما کسی چون من کجا لائق شود — ہر چہ کردم نقل کردم از زبان آفتاب
گر پس از قرنے بود سعدین را باہم قران — چون بود بر صبح دم با شہ قران آفتاب
مدح خورشید و ثنای شہ کند عرفی مدام — کز مریدان شہ است و عاشقان آفتاب
وقف دولت باد سر لایزال آسمان — نور حشمت باد حسن جاودان آفتاب
بر سر شہ سایہ افگن چون شود بال ہما — چون پر خفاش گردد سایبان آفتاب
گر بدان غایت کہ شہ بشناسدش باید شناخت — از مسیحا ہم مجو نام و نشان آفتاب
آسمان داند کہ چون شاہ جہان ہرگز نبود — قدر دان آفتاب اندر زمان آفتاب[۱]

اکبر کے دربار میں کسی کو خودستائی کی جرأت اور ہمت نہیں ہوسکتی تھی، مگر خوددار عرفی ایک قصیدہ میں اکبر کو مخاطب کرکے کہتا ہے:-

۱؎ اس قصیدہ کے بعض اشعار اختصار کی خاطر حذف کر دیے گئے ہیں۔

شہا بہ بزم تو چون این قصیدہ برخوانم | کہ ملک نظم نہ فیضش گرفتہ است نظام
سزد بجائزہ با جیب پر گہر گردوں | بدو شیم افگند این جامۂ نہ مرد فام

اکبر ۹۹۷ھ میں کشمیر گیا، تو عرفی بھی ہم رکاب تھا، کشمیر پر اس نے ایک قصیدہ کہا جس میں اکبر کو مخاطب کر کے لکھتا ہے:۔

حکم تو اَتش آورد بکشمیر وگرنہ | کے از سر آن خاک بخاک دگر آید
می آید و می سوزد از ین رشک کہ کشمیر | چوں یافتہ کہ آید بکجا بہ اثر آید

اکبر نے ایک موقع پر اس کو ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن اس سے خوش ہونے کے بجائے اپنی رعونت میں اس نے گھوڑے کی ہجو لکھی، اکبری دور میں زور کلام، شوکت الفاظ، جدت استعارات و تشبیہات، نازک خیالی، مضمون آفرینی، فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی تمہیدوں کے لحاظ سے عرفی کا کوئی مقابل نہ تھا، اس نے اپنے شاعرانہ کمال پر کبر و نخوت کا جو اظہار کیا تو یہ بے جا نہ تھا، اور اس کی اس افتاد طبع سے خود شاعری بھی معنوی حیثیت سے بلند مقام پر پہنچ رہی تھی،

محمد حسین نظیری نیشاپوری ہندوستان پہنچا تو عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں ملازم ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے شاہانہ دربار میں رسائی حاصل کی پہلی بار جب اکبری دربار میں پہنچا تو جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو کی ولادت کا جشن تھا، نظیری نے اس موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا جس سے اکبر کی توجہ اس کی طرف ہوئی، لیکن حاسدوں نے اس کو تقرب حاصل کرنے نہیں دیا، پھر بھی اس نے اکبر کی مدح میں اور بھی قصیدے لکھے جو مقبول ہوئے، اسکی سخن دانی اور سخن گستری کی داد جہانگیر اور شہزادہ مراد کے دربار میں زیادہ دی گئی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا،

ان اکابر شعراء کے علاوہ دربار کے بعض اور سخن سنجوں کا بھی اجمالی ذکر ضروری ہے تاکہ اکبر

نے ان کی جس طرح قدر دانی، عزت افزائی اور سرپرستی کی اس کا اندازہ ہو جائے، کہیں کہیں ہم ان شعرا کے کلام کے نمونے بھی ناظرین کے تفنن طبع کے لیے پیش کرتے جائیں گے، ان سے اس دور کے شعر و شاعری کے عام رجحانات کا پتہ چلے گا،

خواجہ حسین مروی ۔ حضرت شیخ رکن الدولہ سمنانیؒ کی اولاد میں سے تھے، معقولات کی تعلیم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے پائی، حدیث میں خاتم العلما و المحدثین شیخ ابن حجر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا، ہمایوں ان کے علم و فضل کا قدردان تھا، اس لیے اس کے ندیم خاص بھی رہے، اپنی فصاحت، بلاغت، لطافت اور ظرافت کے لیے مشہور تھے، ان کی شاعری میں سلاست، صنایع اور بدایع کا پہلو غالب رہتا تھا، شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ کہا جس کے پہلے مصرع سے اکبر کی تاریخ جلوس اور دوسرے سے سلیم کی تاریخ ولادت نکلتی تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا:-

للہ الحمد از پے جاہ و جلال شہریار　　　گوہر مجد از محیط عدل آمد برکنار

اکبر نے اس قصیدہ پر دو لاکھ ٹنکے انعام دیے،[1] اکبر کی فرمایش پر سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ شروع کیا، مگر اس کی تکمیل نہ کر سکے، شیخ فیضی نے ان سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی،

کلام نمونۃً یہ ہے:

گوئیم مگر ز اہل وفائیم نہ ایم　　　و اندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان　　　افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

ثنائی مشہدی، نام خواجہ حسین، باپ کا نام غیاث الدین علی تھا، ایران میں اپنے کلام کی رنگینی اور پرکاری کے لیے مشہور تھا، وہاں ایک مدت تک سلطان ابراہیم مرزا کی

۱؎ طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۱۳۔

ثنا خوانی کی، ہندوستان میں آنے سے پہلے یہاں اس کا کلام ہر مجلس میں تبرک کے طور پر پڑھا جاتا تھا، ہندوستان آیا تو اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور آخر عمر تک اس کے خسروانہ مراحم سے مستفید ہوتا رہا، تمام تذکرہ نگار اس کے شاعرانہ کمال کے معترف ہیں، میخانہ کا مولف اس کو "عندلیب گلستان نکتہ سرائی" کہتا ہے، اور اس کی شاعری کو رنگ و بوے رنگین اور معطر بتاتا ہے منتخب التواریخ (ص۲۰۸) میں ہے:۔

"شاعر طبیعت است، و در ہمہ اقسام سخن غیر از توحید و موعظت و نصائح حکیم و سنگلاخی طرفہ دارد"

خواجہ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں لکھتا ہے:۔

"دیوان شعر و کتاب مثنوی دارد، و اقسام شعر را خوب و استادانہ می گفت، و از شعراے وقت امتیاز داشت" (جلد سوم ص۴۸۹)،

میخانہ (ص۱۶۶) میں مثنوی کا نام سکندر نامہ مرقوم ہے، اس میں اور منتخب التواریخ جلد سوم میں ثنائی کا ایک ساقی نامہ بھی منقول ہے، خانخانان عبد الرحیم کی شان میں بڑے لمبے لمبے قصائد کہے تھے، جو آثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے، قصیدہ گوئی کو اس کی شاعری سے بھی بڑی ترقی ہوئی، اس کی ایک رباعی ملاحظہ ہو،

ترک ستم چو کلہ گوشہ یغما شکند | نقد دو جہاں را ز طرۂ دیبا شکند
ہر گز تندی خوی تو بخاطر نرسد | کہ نہ بر عارض دل رنگ تمنا شکند

اس کے کچھ اور کلام سے بھی لطف لیجیے، (آئین اکبری ص۱۸۱)،

قاصد شوق دگر قطرہ زنان می آید | کہ بدل شوق کسے از پے جان می آید
شرط عشق ست کہ ہم باز بدل بسپارند | سخن دوست کہ از دل بزبان می آید

در حوصلۂ نہ فلک از عشق نگنجید ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہ ہوا رفت

میلی ہروی ۔ مولانا شبلیؒ شعر العجم حصہ پنجم (صـ) میں عرفات او حدی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ قزلباشی امراء میں سے تھا، نہایت خوش رو اور خوش مزاج تھا، مدت تک مشہد اقدس میں سلطان ابراہیم مرزا کے دربار میں رہا، پھر ہندوستان آیا، یہاں حسین ثنائی، غزالی، وحشی وغیرہ سے معرکے رہے، مشہور ہے کہ اکبر کے دربار میں غزالی سے مناظرہ ہوا، غزالی نے حکمت عملی سے اس کو مغلوب کیا، اس کا اس کو استقدر صدمہ ہوا کہ اسی وقت تپ چڑھ آئی، اور بالآخر بیمار رہ کر مر گیا، مگر منتخب التواریخ حصہ سوم (صـ۲۲۹) میں میلی ہروی کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"مرزا قلی تام، صاحب دیوان اور صاحب طرز ہے، اس کا سلیقۂ شاعری ایسا تھا کہ اگر وہ اب تک زندہ رہتا تو بہت سے تمام شعروں کے دل میں شعر گوئی کا سودا سرد پڑ جاتا، اس کے زمانہ سے اس وقت تک کے شعراء میں سے اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا، برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا، اور اس کی مدح میں بڑے بڑے قصائد کہے، کہتے ہیں کہ بدگمانی کی بنا پر نورنگ خان کے حکم سے اس کے پیالہ میں کوئی زہریلی چیز ڈال دی گئی کہ اس دنیا سے چل بسا، اس کی وفات مالوہ میں ہوئی۔

طبقات اکبری جلد سوم (صـ۴۹۶) میں ہے :-

"مرزا قلی میلی نورنگ خاں کی خدمت میں برسوں رہا، نورنگ خان اس عالی شان دودمان (یعنی خاندان تیموری) کے امراء میں سے ہے، مرزا قلی غزل اور قصیدہ کا ایک دیوان رکھتا ہے"

آئین اکبری اور منتخب التواریخ میں میلی قلی کے بہت سے اشعار درج ہیں، جن میں سے

کچھ یہ ہیں :-

دانستہ ام کہ مہر تو با جان نمی رود | کز خاک کشتگان گذری سرگران ہنوز

نہ آشنا و نہ بیگانہ نمی دانم | کہ اختلاط چنین راکسی چہ نام کند

بیقرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق | دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد

امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد | خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد

میرم و برزند گانم رحم می آید کہ تو | خوبان بے داد با داری کہ با ما کردۂ

نوری۔ ملا نور الدین محمد ترخان نوری سفیدون (توابع سرہند) کے رہنے والے تھے، ہمایوں کے سلسلہ میں ان کا ذکر آچکا ہے، ہندسہ، ریاضی، نجوم و حکمت میں ان کا علم مشہور تھا، جود و سخا اور بذلہ سنجی میں ضرب المثل تھے، اکبر نے ان کی عزت و قدر دانی باپ ہی کی طرح کی، اور ان کو خان کا بھی خطاب عطا کیا، چنانچہ اس خطاب پر اظہار تشکر کے ساتھ لطیف پیرایہ میں شکوہ بھی کرتے ہیں۔

زروے مکرمت وز راہ احسان | بہ ترخان داد خانی شاہ عادل

ازین خانی ہمین نا یست پیدا | ازین نام شگرف او را چہ حاصل

ز ترخانی ہم او را شکوہ ہست | بہ نزد خسرو دانائے کامل

کہ غیر از خان خشکی می نماند | ز ترخانی تری گردد چو زایل

مگر بعض سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ دنوں معتوب بھی رہے، آخر عمر میں ہمایوں کے مقبرہ کی تولیت ان کے سپرد تھی، شاعر بھی تھے اور اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا، یہ شعر ان ہی کا ہے :-

دل تنگ دور از ان لب خندان نشستہ ام | مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

توسنی - نام منوہر تھا، سانبر کے راجہ لون کرن کا لڑکا تھا، اکبر نے اس کو مرزا منوہر کا خطاب دیا تھا، مگر وہ اپنے کو محمد منوہر لکھتا تھا، اس کی شاعری میں متانت و سنجیدگی تھی، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر　　　مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

تشبیہی کاشی - کئی بار وطن سے ہندوستان آیا، اور ابو الفضل کے توسل سے اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، اور قصیدہ بھی پیش کیا، ملا بدایونی کی رائے کے مطابق ملحد تھا۔

تقی الدین ششتری - علوم عقلیات و نقلیات میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اکبر کے حکم سے شاہنامہ کو منثور کرنے کی کوشش کی، مگر یہ سعی لاحاصل تھی، اسی لیے ملا بدایونی اس قسم کی کوشش کے بارے میں لکھتے ہیں "قماش ابریشمین را پلاس میکند، و کیسان رامی سازد" یعنی مخمل کو ٹاٹ بنا رہا ہے، اور سوت کو روئی، اس کی سخن سنجی کا نمونہ یہ ہے:-

گر دست نہ بدہم کہ بروئیت نظر کنم　　　یاری دہان بیا و لبت پر شکر کنم
یا آنکہ ہمچو سبزہ بجا کم نشاندہ ای　　　دست و دلی کجاست کہ خاکے بسر کنم

ثانی خان ہروی - اکبر کے قدیم درباری امرا میں سے تھا، دین الٰہی کی تشکیل میں معاون ہوا، اس کی حمایت میں کچھ رسالے بھی لکھے، شعر گوئی سے بھی کچھ ذوق رکھتا تھا، مگر آخر عمر میں اس سے توبہ کر لی تھی۔ ذرہ و خورشید کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

جدائی - سید علی نام، اکبر کے دربار کا مصور تھا، اکبر کے حکم سے قصۂ امیر حمزہ کی ۱۶ جلدوں کو مصور کیا، اور نادر الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا، ہمایوں بھی اس کا قدر دان تھا، ہمایوں شاہی بھی کہلاتا تھا، (طبقات اکبری حصہ سوم ص۴۹۵)، ملا بدایونی اس کو ہندوستان کا مانی لکھتے ہیں، شاعر بھی تھا، [illegible] ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا کچھ اشعار یہ ہیں:-

صبح دم خار دم از سہد می گل می زد ناخنی در دل صد پارہ بلبل می زد

حسن بتان کعبہ ایست عشق بیابان او سرزنش ناکسان خار مغیلان او

نیم بسمل صیدم و افتادہ دور از کوی دوست میرم و افغان و خیزان تا بہ بینم روی دوست

جعفر بیگ قزوینی ۔ عہدۂ بخشی پر مامور تھا، اکبر نے آصف خان کے خطاب سے عزت بخشی، اسکی بذلہ سنجی مشہور تھی،

رسید و مضطربم کرد و آن قدر ننشست کہ آشناے دل خود کنم تسلی را

شہر گنجایش غمہاے دل ما چو نداشت آفریدند براے دل ما صحرا را

حیاتی گیلانی ۔ عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان آیا تو پہلے حکیم ابو الفتح گیلانی کے دربار سے منسلک ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار میں پہنچا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، منصب، الوقہ اور جاگیر عطا کی، مآثر رحیمی کے مصنف کا بیان ہے کہ

"و چندان قرب و منزلت او را در ملازمت آن پادشاہ بہم رسید کہ مزیدی بر آن متصور نبود"

عبد الرحیم خانخانان دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ حیاتی بھی گیا، خانخانان نے اس کی بڑی قدردانی کی، اور اسی کی سفارش پر حیاتی کو اکبر نے منصب ہزاری بخشا، خانخانان بزم اور رزم دونوں میں اسکو ساتھ رکھتا تھا، حیاتی نے جذبۂ تشکر میں اس کی شان میں لمبے لمبے قصیدے کہے، حیاتی جہانگیر کے دربار سے بھی وابستہ رہا، مآثر رحیمی کا مولف اس کی علمی اور شاعرانہ صلاحیت پر قوانی اوصاف کا بہت مداح ہے، لکھتا ہے،

"ہر نقطی از منظوماتش چون نقطۂ خال صباحت منظومہ، طالع آفتاب معانی ۔ و ہر حرفی از منشورات آتش چو دم عیسوی شگفتگی حیات باقی ۔ رشحات اقلامش از صفا رشک قطرات سحاب"

ونظم کلامش در پاکیزگی غیرتِ گوہر سیراب، وجامع فنون کمالات وحیثیات کسبی ووہبی آ
وآداب نیکو ذاتی وخوش صحبتی وشگفتہ روئی وقاعدہ دانی دستور العمل ارباب این فن است
وجود شریفش در ہر مکان وزمان باعث تفریح قلب وسرور اکابر واعیان، وجمعیت و
خوشحالی ومستعدان است۔" (جلد سوم ص۴۳۹)،

ملا بدایونی کی مدح وتعریف میں یہ غلو نہیں، وہ رقمطراز ہیں۔

از یاران دردمند ودر اقسام شعر مستثنیٰ، صاحب دیوان است، وادرا باسخنان اکثر
سریست اگرچہ از مادہ علمی عاریست، اما جد وجہد در فہمی درست دارد ومنصف است"

کلام کا [illegible]

بہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش	ز گفتنی کہ دلی نشگفد پشیمان باش
چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار این است	ز مور ہم قدمے وام کن گریزان باش
این سبزہ دراین صحرا بوی زجنون دارد	دیوانگی ومستی امروز شگون دارد

خنجر بیگ۔ اکبر کے دربار کے چغتائی امرا میں سے تھا، سپہگری، موسیقی، خوش خطی، معمائی گو
اور علم نجوم وہیئت میں یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، تین ہزار ابیات کی ایک مثنوی لکھی جس میں
اکبر کی مدح کرکے اپنے ذاتی فضائل بیان کئے ہیں، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ اس مثنوی کے
صلہ میں اکبر نے اس کو بہت سی نوازشوں سے سرفراز کیا، مثنوی کے کچھ اشعار منتخب التواریخ جلد ۳
(ص ۲۲۴ — ۲۲۶) میں ملیں گے، اس نے اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا،

میر دوری۔ نام سلطان بایزید تھا، بدایونی کا بیان ہے کہ اس نے خط نستعلیق لکھنے
میں ایسی مہارت پیدا کی تھی کہ ہندوستان میں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اسی لیے اکبر نے کاتب
الملک کا خطاب عطا کرکے نوازا، شعر گوئی سے بھی دلچسپی رکھتا تھا،

گہ درد رون جانے گہ در دل حزینی ‌ ‌ ‌ ‌ از شوخی کہ داری یکجا نمی نشینی

میر حیدر رفیعی، یہ کاشان سے گجرات آیا، اور وہاں سے لاہور پہنچکر شاہی ملازمت میں داخل ہوا، ملا بدایونی اور ابوالفضل کا بیان ہے کہ معما اور تاریخ گوئی میں عدیم المثال تھا، آخر عمر میں وطن واپس چلا گیا، ایک دیوان چھوڑا، اس کی ایک رباعی یہ ہے:۔

زاہد نکند گنہ کہ قہاری تو ‌ ‌ ‌ ‌ ما غرق گناہیم کہ غفاری تو

او قہاریت خواند و ما غفارت ‌ ‌ ‌ ‌ یارب بکدام نام خوش داری تو

روغنی۔ یہ اپنی ہرزہ سرائی و ہزل گوئی کے لیے مشہور تھا، اس کے دیوان میں تین ہزار اشعار تھے،

زین خان کوکہ۔ اکبر کا رضاعی بھائی، اور اس کے دربار کا (ا) ڈھائی ہزاری (طبقات اکبری کے مطابق پنجہزاری) امیر اور شہزادہ سلیم کا خسر تھا، موسیقی خصوصاً ہندی راگ کا بڑا شیدائی تھا، کبھی کبھی اشعار بھی موزون کرلیتا تھا، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو،

ز رام من نمی دہد این چرخ کج خرام ‌ ‌ ‌ ‌ تا رشتہ مراد بسوزن در آورم

وفائی اصفہانی اسی کی سرپرستی میں رہا،

سرمدی اصفہانی۔ نام محمد شریف، کچھ دنوں چوکی نویس رہا، پھر شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں کسی خدمت پر مامور کیا گیا، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا، فیضی نے اکبر سے اس کی شکایت کی، تو پھر سرمدی تخلص رکھا، آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کے بہت سے منتخب اشعار لکھے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں۔

ز گرمی خوئی عصیان چہا نجوکردیم ‌ ‌ ‌ ‌ بپشت گرمی رحمت چہ جرمہا وایم

بہ گلشنے من و دل بادل شوق افشاندیم ‌ ‌ ‌ ‌ کہ رشک از آمدن و رفتن صبا دایم

بغیر وصل ہزار آرزو ہست عاشق را　　　　ہنوز ما بہوائے بخت کارہا داریم

سیدی ۔ نام سید شاہ ، گرم سیر کے سادات میں سے تھا ، شیخ اسلام چشتی سے شرف بیعت حاصل کیا ، کچھ دنوں دربار شاہی سے بھی منسلک رہا ، آخر عمر میں قلیچ محمد خان کابل کے پاس جاکر ملازم ہوا ، خوش طبع اور خوش گو شاعر تھا ۔

اول سر گرمی عشقت و دل در اضطراب　　　　ہمچو طفلی کو تپد ہنگام بیداری ز خواب

ملا شیری ۔ پنجاب کے شیخ زادگان میں سے تھے ، ابو الفضل کا بیان ہے کہ شعر و شاعری میں اکبر ہی کی توجہ سے ان کو درک حاصل ہوا ،

بنظر گیتی خداوند در سخن بر روے او کشودند "

مآثر رحیمی کے مؤلف کا بیان ہے :۔

" بکمال حیثیات آراستہ و پیراستہ است ، و طبعش خالی از متانت و پختگی نیست ، و اشعار او در ہندوستان مشہور است " (ص ۱۱۱)

ملا بدایونی ملا شیری کے شاعرانہ کمالات کے بہت مداح ہیں ، اور لکھتے ہیں کہ ان کو شعر کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی ، زمانہ کے آلام و مصائب کی تصویر ان سے بہتر کسی اور شاعر نے نہیں کھینچی ، ایک رات میں تیس تیس غزل کہنے کا دعویٰ کرتے تھے ، قصیدہ اور قطعہ گوئی میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے ، اور ان کی فصاحت کے مقابلہ میں دوسروں کی فصاحت ماند پڑ گئی تھی ۔ (جلد سوم ص ۲۴۹) ، طبقات اکبری (جلد دوم ص ۴۹۱) میں ہے کہ آفتاب پر ایک مثنوی شمع جہاں افروز کے نام سے لکھی تھی جس میں ایک ہزار اشعار تھے ، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اکبر نے مہابھارت اور ہربنش کے ترجمے کے لیے ان کو مامور کیا تھا ، ان کے اشعار کے بہت سے نمونے منتخب التواریخ جلد سوم اور مآثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے ، ایک قصیدہ میں کہتے ہیں :۔

اے جہان در قبضۂ حکمت بضرب تیغ و تیر | تاجدار تخت و بخت از فیل و اسپ آفاق گیر
تاج و تخت و تیغ و تیرت مہر و مہ برق و شہاب | در شمار فیل و اسپت گشتہ عاجز صد دبیر

اکبر کی شان میں ایک قصیدہ جواب و سوال کے طرز پر کہا تھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

گفتم اے دل چیست اوضاع جہان گشت بدل | گفت خاموش کہ در مغز فلک رفتہ خلل
گفتم از چاہ امید آب تمنا نہ رسد | گفت کوتہ بود ... رسن طول امل
گفتم از بخت بہ تفصیل شکایت دارم | گفت با بدیۂ شہنشاہ بگوے مجمل
گفتمش اکبر جم قدر سلیمان دانش | گفت خاقان بلند اختر خورشید محل
گفتم آن ذات نبی را بہ تعظیم ثانی | گفت آن خلق خدا را بہ تفضل اول
گفتم اصل و نسبش لازم تاج است و سریر | گفت لطف و کرمش حامی ملکت و ملل

بابا طالب اصفہانی۔ طبیعت میں درویشی تھی، اس لیے پہلے قلندر رہتے، پھر اکبر کے دربار سے منسلک ہو گئے، اکبر نے تبت ایلچی بنا کر بھیجا، واپس ہوئے تو وہاں کے حالات ایک رسالہ میں قلمبند کیے، جس کو شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں شامل کر لیا، ادب و انشا کے ساتھ شعر گوئی میں بھی بڑا سلیقہ رکھتے تھے، جہانگیر کے زمانہ میں گجرات کے صدر مقرر ہوئے، انکی ایک رباعی یہ ہے:-

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد | خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد
اے غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد | خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد

غزالی۔ سید محمد نجفی الہ آباد میں کسی عہدہ پر تھا، اپنی ہجو گوئی بے باکی اور درشتیٔ طبع کی وجہ سے شاہی دربار سے معتوب رہا، مگر ارباب فن اس کی عربی اور فارسی شاعری کے مداح تھے،

میر عزیز اللہ قزوینی۔ طبقات اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص عزیزی تھا، احساب سیاق کا ماہر تھا، سنبھل کے ضبط و نسق کے لیے مامور ہوا[۱]، جہاں بعض امور کی بنا پر شاہی التفات

[۱] طبقات اکبری ج ۲ ص ۵۱۰ میں ہے، "دیوان ہم دارد بود" ...

سے محروم ہوگیا، ایک دیوان منظوم، الوشہر آشوب گل و مل، و بہ القناعت رسالہ منظوم رمل، صحیفہ العشاق کا مولف تھا، (طبقات اکبری جلد سوم ص۴۸۵)، کلام کا نمونہ یہ ہے :-

نیست ہر سوئی مژگان دیدہ نمناک را ۔۔۔ بر کنار افگند موج اشک من خاشاک را

تن سیمین نہ شد او را از خاک پیرہن پیدا ۔۔۔ سمن در باغ خوبی شد زبرگ یاسمن پیدا

چنیں کافتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم ۔۔۔ نسیم لطف و احسانت اگر بردارد از خاکم

مرزا عزیز کوکہ۔ آتکہ خان کا لڑکا اور اکبر کا رضاعی بھائی تھا، اکبر اس کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس کے مختلف سیاسی اور حربی کارناموں کی وجہ سے اس کو پنجہزاری اور خان اعظم کا خطاب عطا کیا، جب کبھی اس سے اختلاف ہوتا تو اکبر اس سے درگزر کرتا، اور کہتا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی ایک نہر بہتی ہے، اس کے علم و ہنر سے تمام معاصرین متاثر تھے، ملا بدایونی لکھتے ہیں :-

"بہ انواع و فضائل و ہنر موصوف است و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر از امرا نشان نمی دہند"

طبقات اکبری جلد دوم (ص۴۲۸) میں ہے :

بجودت فہم و جودت طبع و قوت در علم تاریخ عدیل ندارد"

تزک جہانگیری میں جہانگیر رقمطراز ہے،

در علم سیر و فن تاریخ استحضار تمام داشت و در تاریخ و تقریر بے نظیر بود، و در نامہ نویسی ید طولیٰ داشت، و در بدیہہ گوئی بے مثل بود و شعر ہموار می گفت"

یہ لکھ کر جہانگیر نے اس کی حسب ذیل رباعی پیش کی ہے،

عشق آمد و از جنون بر و سرم گم کرد ۔۔۔ وز [illegible] گم کرد

آزادو ز بند دین و دانش گشتم   تا سلسلۂ زلف کسے بند م کرد

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱) میں اس کی نکتہ سنجی کی داد دی ہے اور اس کے حسب ذیل مطلع کو پسند کیا ہے،

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی   اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی

خانخانان عبدالرحیم اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے بعد اس کے دربار کی علمی محفل آرائی مشہور تھی، نقیبی سبزواری، جعفر ہروی، اور نامی بدخشی خان اعظم ہی کی سرکار سے وابستہ تھے، حیدری نے بھی اس کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی، اس کو نقاشی میں بھی بڑی مہارت تھی آگرہ میں ایک باغ جہاں آرا کے نام سے تیار کیا، اور وہاں نقش ونگار کے ساتھ اپنی حسب ذیل رباعی لکھوائی۔

یارب بصفائے دل ارباب تمیز   کان نزد تو ہست خوبتر از ہمہ چیز

چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام   از راہ کرم فرست مہمان عزیز[۱]

عنایت اللہ شیرازی۔ شاہی کتب خانہ کا کتاب دار تھا، اس کی خوشنویسی پر اکبر نے اس کو مکتوب خانی خطاب سے سرفراز کیا[۲]، اپنی خوش طبعی کی بنا پر کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیتا تھا، اس کی ایک رباعی یہ ہے:۔

تا کاکل و زلف نیکوان خم بخم است   تا شیوۂ و رفتار بتان چم بچم است

تا ناوک غمزہ در کمان ستم است   مرگ من و زندگی من دم بدم است

غباری۔ قاسم علی نام، غباری تخلص۔ بقال تھا، اکبر نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا، اور خان کا خطاب عطا کیا،

---

[۱] خان اعظم کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھو مآثر الامرا، جلد اول ص ۹۳ - ۶۷۵ اور بدایونی ج ۳ ص ۲۸۵

[۲] ریاض الشعرا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

فشانی: نام مولانا علی احمد، مولانا حسین نقشی دہلوی مہرکن کے فرزند تھے، ہیئت و طبیعیات کے عالم تھے، خطاطی اور مہرکنی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، شہزادہ سلیم کے استاد بھی رہے، دربار میں بڑا عروج و رسوخ حاصل کیا، اور گو یک صدی کے منصبدار تھے، مگر ملا بدایونی کا بیان ہے کہ کسی امیر سے کمتر نہ تھے، اکبر نے گجرات تسخیر کر کے سکہ جاری کیا تو انھوں نے شاہی سکہ بنایا اور یہ تاریخ کندہ کی:-

خسروا سکۂ گجرات بنام تو زدند ۔۔۔ ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا

اے خوش آن دم کہ چو تاریخ وی از من پرسی ۔۔۔ گویمت، سکۂ گجرات مبارک بادا

ملا بدایونی ان کے علم و فضل کے بہت ہی معترف تھے، اسی لیے ان کی مثنویات، قصائد، اور رقعات کے نمونے منتخب التواریخ میں نقل کیے ہیں (دیکھو جلد سوم صفحہ ۳۶۰-۳۱۹)۔

نامی: میر محمد معصوم خان نامی بھکر وطن، آبا و اجداد ترمذ سے آئے، محمد معصوم خان طبقات اکبری کے مولف خواجہ نظام الدین احمد اور گجرات کے صوبہ دار شہاب خان کی وساطت سے شاہی دربار میں پہنچا، اکبر اس کو بہت عزیز رکھنے لگا، رفتہ رفتہ وہ ہزاری منصبدار بھی ہوا، ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا، وہاں سے تبریز گیا، جہاں حکیم شفائی، محمد رضا فکری اور تقی اوحدی کی صحبت میں شعر و شاعری کا شغل جاری رکھا، وہاں سے واپس ہوا تو جہانگیر نے بھکر میں امین کے عہدہ پر مامور کیا، اپنی دیانت، امانت، شجاعت، سخاوت، زہد اور تقوی کی وجہ سے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، علمی حیثیت سے وہ کثیر الاشتغال تھا، طب میں ایک رسالہ مفردات معصومی قلمبند کیا، ایک ضخیم تاریخ سندھ لکھی جو تاریخ معصومی کے نام سے مشہور رہی، آج بھی یہ تاریخ اپنے معلومات کے لحاظ سے مفید سمجھی جاتی ہے، میر محمد معصوم نامی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، اور ہمیشہ ایک سنگ تراش ساتھ رکھتا تھا، جو جا بجا اس کے اشعار پتھروں پر کندہ کر دیتا تھا، دیوان کے علاوہ خمسہ کے طرز پر پانچ مثنویاں (معدن الافکار، حسن و ناز، پری صورت وغیرہ) اور دو اور لکھیں، ایک طویل قصیدہ

منقبت اور بہت سی رباعیاں ملا بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم (ص ۳۶۶-۳۶۷) میں نقل کی ہیں۔

دو رباعیاں ملاحظہ ہوں :-

یک حصۂ عمر من بنادانی رفت — یک حصہ ازان چنانکہ می دانی رفت
یک حصہ بہیودہ بیکار گذشت — یک حصہ بافسوس و پشیمانی رفت

تا کے دل از این و آن پر از کینہ کنی — تا چند بزر سینہ چو گنجینہ کنی
کار این بود کہ تیرہ سازی دل را — آن کار بود کہ دل چو آئینہ کنی

غزنوی۔ میر محمد نام، خان کلان خطاب، اکبر کے دربار کا جلیل القدر امیر پنجہزاری منصبدار تھا، اس کی مجلس میں شعر و شاعری کا شغل برابر جاری رہتا تھا، سنبھل کی حکومت کے زمانہ میں شیخ سعدی کا یہ مطلع اس کے سامنے پڑھا گیا،

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است — ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

غزنوی نے فوراً کہا۔

دمے کہ چہرۂ ساقی ز بادہ گلرنگ است — بنوش بادہ برآواز نے کہ دل تنگ است

اسی کے دربار کے ایک شاعر جمال خان بدایونی نے بھی ایک مطلع کہا

ترا رخ از مے عشرت مدام گل رنگ است — مرا بفکر دہانت چو غنچہ دل تنگ است

فارسی اور ترکی کا ایک دیوان بھی چھوڑا، مآثر الامرا جلد سوم (ص ۲۱۶) میں اس کے حسب ذیل دو شعر منقول ہیں،

درجوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت — انچہ باقی بود آن ہم در پشیمانی گذشت
کس ز بیچارہ مردم چشم نہ بد — جز آہ سحر ہم نفسے نیست مرا

ہمدمی۔ نام ... بیگم اکا مرزا ... ہمدم بیگم کا لڑکا تھا، مرزا بخورد دار بھی

کہلاتا تھا، ہمدمی تخلص اور خان عالم خطاب تھا، مرزا کامراں ہمایوں سے شکست کھا کر حجاز کے سفر پر روانہ ہوا تو ہمدمی ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پہلے یہ بیت پڑھی۔

کلاہ گوشہ درویش بر فلک ساید ۔۔۔ کہ سایہ ہمچو تو شاہی فگند بر سرا و

اور اسی کے بعد یہ شعر بھی زبان پر لایا،

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است ۔۔۔ گر ناوک جفاست و گر خنجر ستم

یہ سنکر ہمایوں بہت متاثر ہوا اور اس کو بڑی نوازشوں کے ساتھ اپنے ساتھ اپنے دربار میں رکھا، اکبر نے بھی شاہانہ لطف و کرم سے نوازا، اور سہ ہزاری منصب اور خان عالم کا خطاب عنایت کیا، اکبر کے ساتھ حصار پٹنہ کی تسخیر میں بڑی جانبازی دکھائی، عبدالرحیم خانخاناں کے ساتھ بنگالہ کی مہم میں بھی ساتھ رہا، اور ۹۸۲ھ میں اوڑیسہ کی لشکرکشی کے سلسلہ میں مارا گیا[1]

شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، اکبر کو آصفی کا یہ مطلع پسند تھا،

قاتل من چشم می بندد و مسبل مرا ۔۔۔ تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

اکبر نے ہمدمی کو اسی مطلع پر ایک مطلع کہنے کی فرمایش کی تو اس نے کہا،

آمد و بگذشت از دل تیر آن قاتل مرا ۔۔۔ ماند تا روز قیامت داغ او در دل مرا

فیضی کا بھی ایک مطلع اسی قافیہ و ردیف میں ہے۔

پا برہ بگذار اے قاتل دم بسمل مرا ۔۔۔ تا بایں تقریب پابوسی شود حاصل مرا

ہمدمی کا ایک قطعہ ہے۔

اے کہ کردی ہرزہ ریش سفید ۔۔۔ یک بیک می کنی ز بہر نمود

بزبان داده جدائی را ۔۔۔ ریش کندن کنون ندارد سود

[1] ماثرالامرا ج ۱ ص ۶۵-۶۲۲، و منتخب التواریخ ج ۲ ص ۹۹-۱۸۵،

اشکی۔ میر اشکی قمی ابن سید علی محتسب، ہندوستان آیا، تو اکبر کے دربار میں ملازم ہوا، ریاض الشعراء کے مولف کا بیان ہے کہ یہاں غزالی مشہدی وغیرہ سے اس کے شاعرانہ معرکے ہوتے تھے، وفات سے کچھ دنوں پہلے اپنا دیوان نادر الملک جدائی کو دیا، جس نے اسکے کچھ اشعار اپنی طرف منسوب کر لیے، ریاض الشعراء میں ہے کہ غزالی نے اس پر ایک ہجو بھی کہی تھی، ملا بدایونی نے اس کے کلام کے کچھ نمونے دیے ہیں۔

از بسکہ سنگ بر سر زدیے تو سینہ چاکی — آں سنگ در کفت اوگر دید مشت خاکی

بسے سنگ از غمت بر سر من لی تنگ خواہم زد — اگر دستم رود دانہ کار سر بر سنگ خواہم زد

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا افتم — ز ہر سو بر من آید سنگ و گلزار زیبا افتم

موخر الذکر شعر لکھکر ملا بدایونی کہتے ہیں کہ "مضمون سنگ" پر اس سے بہتر شعر کہنا مشکل ہے[1]

فکری خراسانی۔ نام سید محمد، اکبر کا قصیدہ خوان بھی رہا، رباعی کہنے میں شہرت حاصل کی، اس لیے میر رباعی کے نام سے مشہور ہوا، اس کے اشعار میں بلند افکار ہوتے تھے، اسکی ایک رباعی ہے۔

زان بت ہمہ غم نصیب ما خواہد بود — بیداد و ستم نصیب ما خواہد بود

تا عمر بود از ان قد و زلف و دہان — پیوستہ الم نقیب ما خواہد بود

فیضی ترمتی۔ اکبری دور کا بلند پایہ شاعر تسلیم کیا گیا ہے، ملک الشعراء ابوالفیض فیضی نے اس کے شاعرانہ کمالات کی تعریف میں ایک قطعہ بھی کہی ہے، اکبر کی شان میں فیضی ترمتی نے متعدد قصائد کہے، ریاض الشعراء میں اس کی بہت سی رباعیاں منقول ہیں، ایک دو ہم بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

[1] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۹۴

اے قبلۂ جان کعبۂ من کوئے تو باشد — محراب می سازم خم ابروئے تو باشد

گر جانب مسجد گذرم ور طرف دیر — ہر جا کہ روم روئے دلم سوئے تو باشد

زاہد تو ز مستی منگر پستی ما — صرف رہ نیستی شدہ ہستی ما

ما مست محبتیم و تو مست غرور — فرقست ز مستی تو مستی ما

سید فسونی یزدی ۔ محمود بیگ نام[1] ۔ ظاہری، معنوی اور علمی حیثیت سے یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، شعر و شاعری کے علاوہ فن سیاق، نجوم و ہیئت، حساب اور تاریخ سے بھی اسکو واقفیت تھی، ریاض الشعرا میں ہے کہ اکبر کے علاوہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار سے بھی منسلک رہا، جہانگیر نے اس کو افضل خان کا خطاب بھی عطا کیا تھا، اس کے بعض اشعار یہ ہیں

خواب راحت شد از ان دیدہ کہ دیدن دانست — رفت آسایش از ان دل کہ طپیدن دانست

خبردار آن زمان خواہی شدن از سوز پنہانم — کہ آتش سر برون آورد یا شد از گریبانم

فنائی ہروی ۔ چغتائی نسل سے تھا، اکبر نے اس کو بھی خان کے خطاب سے نوازا تھا، طبقات اکبری (جلد سوم ص ۴۸۶) میں ہے کہ تمام عمر اکبر کی بارگاہ میں رہا، ملا بدایونی (جلد سوم ص ۲۶۹) رقمطراز ہیں کہ اس کا حسب ذیل مطلع ان کو اسقدر پسند آیا کہ اس کو پچاس سال تک یاد رکھا،

نگویم بہر تشریف قدومت خانۂ دارم — غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانۂ دارم

فنائی کا ایک مطلع یہ بھی ہے

تا گل روی تو از بادہ گلفام شگفت — بادہ از عکس گل روئے تو در جام شگفت

فیروزہ کابلی ۔ مرزا محمد حکیم کے یہاں تربیت پائی، آئین اکبری میں ہے کہ اکبر نے اس کو منصب دو ہزاری عطا کیا، موسیقی اور شاعری سے بھی ذوق رکھتا تھا، متقدمین اور متاخرین

---

[1] آئین اکبری میں ہے "از نامور سکھیان، اختر سگالو بہ شمرد"

کے شعر و، کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کا بھی دعویدار تھا، ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۲) لکھتے ہیں کہ اسکی علمی استعداد تو اچھی نہ تھی، مگر شعر فہمی کی صلاحیت اچھی رکھتا تھا، اور اس کی شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں ان میں سے دو شعر یہ ہیں۔

غیر منظور نظر ساختہ یعنی چہ	بندہ را از نظر انداختہ یعنی چہ

کس ندیدم بدور تو باین حسن و جمال	قیمت حسن برانداختہ یعنی چہ

حیدری تبریزی ۔ تین بار عراق سے ہندوستان آیا، پہلی بار قاسم خان نیشاپوری کے دربار سے وابستہ رہا، مگر ہندوستان اس کو پسند نہ آیا، اس لیے اس کی ہجو بھی لکھی، اور وطن واپس چلا گیا، دوسری بار ہندوستان آیا تو خان اعظم مرزا کوکہ کے خوش بیانی کرم کی خوشہ چینی کی، اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا

نزد اہل سخن چون کنم بیان سخن	اگر مدد نکند روح صاحبان سخن

خان اعظم نے اس کے صلہ میں دو ہزار روپے، خلعت اور گھوڑا عطا کیا، شمس الدین محمد اتکہ خان کے وسیلہ سے شاہی دربار میں بھی حاضر ہوا، ایک قصیدہ میں اکبر کے ہاتھی کی تعریف اس طرح کی

بہ دو پشت ہاے ریگ روان	فیلہایش کہ در صفت ہیجاست

کز پے غرق کردن اعدا	ہر طرف موجہای بحر بلاست

ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۸) رقمطراز ہیں کہ اکبر نے اس قصیدہ پر خلعت اور اسپ اور کچھ روپے عنایت کئے، مگر شاہی خزانہ سے ملنے میں دیر ہوئی، تو یہ قطعہ لکھکر اکبر کی خدمت میں پیش کیا،

مشکلے دارم شہا خواہم کنم پیش تو عرض	وانکہ زین مشکل مرا جمعاز اغ خسرو بود شفا

سیم و زر انعام کردی لیک از خازن مرا　　　　ہم گرفتن مشکل و ہم ناگرفتن مشکل است

خزانہ عامرہ (مولفہ آزاد بلگرامی) میں ہے کہ اکبر نے حیدری کو انعام حسب ذیل قصیدہ پر عطا کیا تھا، اور اس کے نہ ملنے پر مذکورہ بالا قطعہ لکھا،

اما چو روزگار مددگار من نبود　　　　زان شاخ گل بپای دلم خار غم خلید

نشنید شاہ عقدہ کشا مصرعی زمن　　　　بکشود قفل آرزو من از ین کلید

بودم ز آب دیدہ غرق بحر غم　　　　کز عیب این ترانہ بگوش دلم رسید

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس　　　　در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید۔

تیسری بار حیدری ہندوستان آیا تو خانخانان کے دربار میں شغل سخن کو جاری رکھا، مگر پھر وطن کی طرف مراجعت کی، اور وہیں ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی، اس کے دیوان میں چودہ ہزار اشعار تھے، ایک مثنوی لسان الغیب بھی لکھی جس میں اپنے استاد لسانی کی مدح کی تھی،

(بدایونی جلد سوم ص ۲۱۸، ونیز انگریزی ترجمہ)

حلیمی - مرزا جانی بیگ ارغون حلیمی ٹھٹھہ کا حاکم تھا، اپنی فراست و دانائی کے لیے مشہور تھا، اکبر نے اس کو سہ ہزاروپانصدی کا منصب عطا کیا، شعر و شاعری میں حلیمی تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا جلد سوم (ص ۳۱۱) میں اس کے یہ دو شعر مرقوم ہیں:

خوش آن وقتی کہ عشق غمزہ ارم بود　　　　آہ شب و گریہ سحر کارم بود

بگردی چرخ بین کہ با من نگذاشت　　　　کالاے غمی کہ بیب بازارم بود

میر مرتضیٰ سبزواری - فوجی عہدہ دار تھا، دکن کے اکثر علاقہ کو اس نے فتح کیا، آخر عمر میں شاہی دربار میں رہنے لگا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں وفات پائی، ریاض الشعراء اور مخزن الغرائب میں اس کا یہ شعر منقول ہے:

اے از رخ تو مارا صد عیش و کامرانی　　در عیش و کامرانی صد سال زندہ مانی

اسد بیگ قزوینی، ہندوستان آیا تو اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل کے دربار میں سترہ سال تک ملازم رہا، اس لیے اسد شیخ ابوالفضلی کہلایا، ابوالفضل کے قتل کے بعد اکبر نے اس کو اپنے دربار میں داخل کر لیا، شہزادہ دانیال کی نسبت کے سلسلہ میں اکبر نے اس کو دائی بیجا پور کے پاس بھیجا، وہاں سے واپسی کے بعد اس کو شاہی حاجب بنایا گیا، منصب اور ستر ہزار روپے کا وظیفہ بھی عطا کیا گیا، اکبر کی وفات سے پہلے دکن میں بعض خدمات کو انجام دینے کے لیے سفیر کی حیثیت سے مامور ہوا، مگر وہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کو اکبر کی وفات کی خبر ملی، دارالسلطنت واپس آیا تو جہانگیر کے دربار میں اس کی پذیرائی نہ ہوئی، ابوالفضل کے قتل کے سلسلہ میں جہانگیر اس سے ناراض تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ ناراضگی دور ہو گئی، اور مقبول بارگاہ ہوا تو جہانگیر نے اس کو پشترو خاں کا خطاب عطا کیا، سخن سنجی و سخن فہمی کے ساتھ اپنی طبیعت کی لطافت اور شگفتگی کے لیے ہر مجلس میں پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے کلام کا رنگ یہ ہے:

ز صبحدم نفسی پیشتر شدم بیدار　　لب پیالہ گرفتم بہ بوسہ چون لب یار

خون مرا مریز کہ ترسم خجل شوی　　چون ساقی کہ ریختہ باشد شراب را

خون مرا بریز و شراب مرا مریز　　یک قطرہ زین شراب بصد خون برابر است

ہر کہ خیال آن گل خود روی می کنم　　دل می کند خیال کہ گل بوی می کنم

وقایع اسد بیگ کے نام سے اپنے کچھ ذاتی کوائف اور اس عہد کے کچھ تاریخی حالات خصوصاً ابوالفضل کے قتل کی تفصیلات لکھی ہیں، جس کے اقتباسات الیٹ جلد ششم میں درج ہیں،[1]

دربار اکبری کے ارباب سخن کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو ان صفحات پر آسانی سے سمیٹا نہیں جا سکتا

[1] نیز دیکھو میخانہ ص ۵۹۴ و ریاض الشعراء

ہوتا جارہا ہے، اس لیے ہم بقیہ شعراء کے صرف نام لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ان میں بھی ہم ان ہی کے نام درج کرتے ہیں، جو شاہی ملازموں کے زمرہ میں داخل تھے،

ملا قیدی شیرازی، قاسم ارسلان، یادگار حالتی، طریقی ساوجی مشفقی بخاری، ملا صبوحی کابلی، حیفی ساوجی، خواجہ ہجری، تویدی، نارغی، وقوعی خسروی، نیازی سمرقندی، میر حزنی، مظہر کشمیری، بہرام سقا، محمد صالح دیوانہ، شریف سرمدی، غازی اسیری وغیرہ وغیرہ ان کے کلام کے نمونے طبقات اکبری جلد سوم میں ملیں گے،

بہت سے ایسے شعراء بھی تھے جنکا دربار سے براہ راست تعلق تو نہ تھا، مگر اپنے قصائد بھیجکر اکبر کے ابر کرم سے سیراب ہوتے رہتے تھے، ان میں ظہوری ترشیزی اور ملک قمی بھی تھے،

ہندو فضلاء | اکبر کو ہندوؤں کے علوم و فنون سے جو شغف تھا وہ ظاہر ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی شاعری میں طبع آزمائی بھی کرتا تھا، اور رائے تخلص رکھتا تھا، ہندو فضلاء کی ایک کثیر جماعت بھی دربار شاہی سے منسلک تھی، ابو الفضل نے "دانش اندوزان جاوید دولت" کے سلسلہ میں خدیو نشاسین کی فہرست میں حسب ذیل ہندوؤں کے نام لکھے ہیں۔

مادھو سرستی، مدھوسودن، نارائن آسرم، ہرجی سود، داموودر بھٹ، رام تیرتھ، نر سنگ، پرم اندر، آدیت،

"خداوند باطن" کی فہرست میں یہ نام ہیں،

رام بھدر، جدروپ

شناسائے عقلی کلام کے عنوان سے مندرجۂ ذیل نام گنائے ہیں:

نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام بشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر،

یا تین بھیٹ، بدیا تواس، گوبرہی ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹاچارج، بھاگیرت بھٹاچارج
کاشی ناتھ بھٹاچارج، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی۔[۵۱]

کتب خانہ | اکبر کے علمی ذوق کے سبب جو کتب خانہ قائم ہوا، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھا، قلعہ آگرہ میں مثمن برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ ہے، وہیں شاہی کتب خانہ تھا، ہمایوں کے کتب خانہ کی جتنی کتابیں تھیں وہ وراثت میں ملیں، اس کے علاوہ مختلف مقامات اور اشخاص سے وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہیں، اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ خزانہ عامرہ میں ضرور بھیجتے، اکبر کے درباری مصنفوں کی تصنیفات، تالیفات، و تراجم خود ان کی نگرانی میں ہوتے تھے، ان کے کئی کئی نسخے شاہی کتب خانہ میں رہتے، پھر اکبر کو فتوحات کے سلسلہ میں جتنی کتابیں دستیاب ہوتیں ان کو خزانہ عامرہ میں داخل کر لیتا، فتح گجرات کے زمانہ میں اعتماد خان گجراتی سے بہت سی نفیس اور نادر کتابیں حاصل ہوئیں، ان میں سے بعض تو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں اور بعض اہل ذوق کو دیدی گئیں، ملا عبد القادر بدایونی کو اس تقسیم میں انوار المشکوٰۃ کا نسخہ ملا۔[۵۲] فیضی کے انتقال کے بعد اس کی تمام کتابیں شاہی کتب خانہ میں منتقل کردی گئیں، ان کی کل تعداد ۴۳۰۰ تھی، جو اکثر مصنفوں کے ہاتھ کی یا ان کے عہد کی لکھی ہوئی تھیں، ان کتابوں کا مجموعہ تین حصوں میں منقسم تھا، پہلے میں نظم، طب، نجوم اور موسیقی کی کتابیں اور دوسرے میں حکمت، تصوف، ہیئت، ہندسہ کی اور تیسرے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تھیں۔[۵۳] خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر کے کتب خانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں تھیں، جو زیادہ تر مشاہیر کی لکھی ہوئی تھیں، مآثر الامرا جلد دوم (ص ۶۱۱) میں ہے کہ ایک روز شہزادہ سلیم ابو الفضل کے گھر گیا تو چالیس کاتبوں کو کلام پاک اور تفسیر نقل کرتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ شاہی کتب خانہ کے لیے اور بھی زیادہ کاتب اور خوشنویس مقرر

۵۱ آئین اکبری ۵۲ بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲ ۵۳ ایضاً ص ۴۰۳

ہوں گے، خوشنویسوں کے علاوہ مقابلہ نویس، مصحح، نقاش، جدول ساز، جلد ساز اور مصور بھی۔ تھے

اکبر خاص طور سے بعض کتابوں کو مصور کراتا تھا، ان میں تصویریں اور شبیہیں بنواتا مرقعے تیار کراتا ... کتابوں کی لوح و جدول مطلا کراتا تھا، قصہ امیر حمزہ کی بارہ جلدیں اس کی فرمایش سے مصور کی گئی تھیں، اور اس میں استادان سحر پرواز نے ۱۰۰ تصویریں بنائیں، اسی طرح چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ (مہابھارت) رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ، اور عیار دانش، نقش ونگار سے آراستہ ہوئیں[1]

یہاں پر بے محل نہ ہوگا اگر دربار اکبری کے ان خطاطوں اور خوشنویسوں کا تذکرہ کیا جائے جنھوں نے شاہی کتب خانہ کی زینت اپنے کمال فن سے بڑھائی اور جن کی قدردانی اکبر نے جاگیر، منصب اور خطابات دے کر کی،

(۱) ملا محمد حسین کشمیری، نستعلیق کے استاد تھے، اکبر نے زریں قلم کا خطاب دیا تھا، ابوالفضل ان کو جادو رقم لکھتا ہے[2]

(۲) خواجہ عبد الصمد شیریں رقم، خواجہ نظام الملک وزیر شاہ شجاع شیرازی کے بیٹے تھے، ہمایوں کے دربار میں خوشنویس تھے، نستعلیق کے استاد اور مصور تھے، اپنے فن کی مہارت کے لحاظ سے شیریں قلم کہلاتے تھے، اکبر کے عہد میں چار صدی منصب عطا ہوا، اور فتح پور سیکری کے ٹکسال کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے، خشخاش کے دانے پر سورہ اخلاص لکھی تھی،[3]

(۳) میر معصوم قندھاری اکبری دور کے مشہور خطاط ہیں، فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر ان کے کتبے کندہ ہیں،

(۴) حسین بن احمد چشتی، یہ بھی اس دور کے عربی کے باکمال خطاط تھے، فتح پور سیکری

---

[1] آئین اکبری ص۷۷ [2] ایضاً ص۱۰۳ و تذکرہ خوشنویسان ص۵۳ [3] ایضاً ص۵۲ و مآثر الامراء، ج ۲

کے بلند دروازے کے پیش طاق کی محراب کے اوپر ابھرے ہوئے حروف میں جو عربی کتبہ ہے وہ انہی کے کمال کا نمونہ ہے،

خط نستعلیق کے دوسرے باکمال اساتذہ مولانا میر علی ہروی، مولانا جعفر تبریزی، مولانا اظہر مولانا محمد اوبہی، مولانا سلطان علی مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبد الرحیم، میر عبد اللہ نظامی وغیرہ تھے، خط تعلیق کے ماہروں میں مولانا عبد الحئی، منشی ابو سعید مرزا، مولانا ابراہیم استرابادی، منشی محمد جمال الدین قزوینی وغیرہ تھے، اکبر کا میر منشی اشرف خاں اس خط کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا،[1]

ان خوشنویسوں کے علاوہ بہت سے ایسے خطاط بھی تھے جو دوسرے رسم الخط مثلاً ثلث، توقیع، محقق، ریحان، رقاع اور غبار کے لکھنے میں بہت مشاق تھے (دیکھو آئین اکبری ص)

مدارس | اکبر نے علم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مدارس قائم کئے، آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں تعلیم و تعلم کے لیے چلپی بیگ نام ایک عالم کو شیراز سے بلایا، (اکبر نامہ دفتر اول) فتحپور سیکری میں پہاڑی کے اوپر ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جس کے مقابلہ میں کوئی سیاح کسی دوسرے مدرسہ کا نام نہیں بتا سکتا تھا،[2] ان تعلیم گاہوں کے علاوہ بہت سے ایسے بھی مدارس تھے جن کو امرا اور دوسرے لوگوں نے قائم کئے، مثلاً دہلی میں ماہم بیگم کا مدرسہ جو خیر المنازل کے نام سے موسوم تھا، ابو الفضل کا مدرسہ جو فتح پور سیکری میں قائم تھا، پھر عبد الرحیم خانخاناں کے مختلف مدارس تھے، ان کے ماسوا بہت سے معلمین اور علما، اپنے اپنے مقامات پر علوم و فنون کی ترقی اور افراد قوم کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے، اور ان کی اعانت شاہی دربار سے برابر ہوتی رہتی تھی، تاریخ بدایونی میں ان مدرسین کی تفصیلات درج ہیں، ہم طوالت

---

[1] آئین اکبری ص، [2] آئین اکبری، ذکر دار الخلافہ صوبہ آگرہ،

کے خیال سے نظر انداز کرتے ہیں،

مگر جو چیز اس سلسلہ میں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اکبر نے بچوں کی تعلیم کے لیے بعض ایسے طریقے ایجاد کئے تھے جو آج ابتدائی تعلیم کے جدید طریقوں کے بالکل مشابہ تھے۔ فارسی حروف بچوں کے ذہن نشین کرانا آسان نہیں، خصوصاً ہندو بچوں کے لیے تو اور بھی دشوار تھا، کیونکہ ان کی تمام تحریریں بائیں سے داہنے جانب لکھی جاتی ہیں، چنانچہ حروف آموزی کے طریقہ کو سہل بنانے کے لیے اکبر نے ہدایت دی کہ پہلے استاد بچوں کو مفرد حروف پہچنوا ئے، پھر اعراب اور مرکب حروف، پھر چھوٹے چھوٹے جملے، اس کے بعد اشعار اور طویل عبارتیں، یہ طریقۂ تعلیم کامیاب ثابت ہوا اور لڑکے جو برسوں میں سیکھتے وہ مہینوں میں حاصل کر لیتے، آئین اکبری کی عبارت ہے:

بفرمودۂ گیتی خداوند حروف ابتث (ا ب ت ث) را بہ نویسند و دیگرگون پیکر را بدانسان نگارند نخست بصورت و نام آشنا گردند و دو روز بیش نکشد کہ از نقوش حروف پیوستہ آگہی برگیرد، و چون ہفتہ بدین دریافت تنومندی یابد و لختی نظم و نثر آشنا رود و نیایش ایزدی و اندرزگزاری جداگانہ نگاشتہ در آموزند، و کوشش رود کہ ہر ایک را خود بشناسد و اندکے استاد دستگیری کند و چندے ہر روز یک مصرع یا یک بیت بانجام رساند، در کمتر زمانے سواد خوانی روشنی پذیرد و آموزگار ہر روز از پنج چیز آگہی برجوید شناسائی حروف، الفاظ، مصرع، بیت، پیشین خواندہ بدین روش انچہ بسالہا آموختنی بماہی بروز کشید و جہانی بشگفت در آمد،[۱]

ابو الفضل نے ان مختلف علوم و فنون کی فہرست بھی دی ہے، جو اس زمانہ میں پڑھائے جاتے تھے، اور وہ حسب ذیل ہیں، اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبعی، ریاضی، الہی، تاریخ، بیاکرن، بیدانت، پاتنجل، یہ گویا اعلیٰ تعلیم کا نصاب تھا،[۲]

۱؎ آئین اکبری ص ۱۴۳
۲؎ ایضاً ص ۵۲

۴ سال - ۴ ماہ - ۴ روز

جہانگیر

جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا اور ناز و نیاز کے ساتھ بڑھا، ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارہ میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو علم پرور باپ نے اس کے بسم مکتب کی تقریب انجام دی،[1] اور ملک الشعراء فیضی اور مولانا میر کلاں ہروی محدث کو اس کی تعلیم کے لیے مامور کیا، قطب الدین خان آتکہ، اور عبد الرحیم خانخانان اس کے اتالیق مقرر ہوئے، مولانا علی احمد نشانی بھی اس کے استادوں میں تھے، یہ ہیئت، طبعیات، املا، انشا اور خطاطی میں اپنی نظیر آپ تھے،[2] جہانگیر نے چہل حدیث سید صدر جہاں سے پڑھی،[3] ایسے استادوں اور اتالیقوں کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بن کر چمکا،

عبد الرحیم خانخانان سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی ہے، لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہوں،" تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزاء ترکی زبان میں لکھکر اضافہ کئے ہیں،

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشا پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علمی شاہکار خود اس کی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے عدیل ہے، مولانا شبلی کی رائے میں اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف

---

[1] طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۷۱، [2] بدایونی جلد سوم ص ۱۴۴، [3] مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۱۔

برجستہ اور دلآویز طریقہ سے ادا کرتا ہے، کہ بڑے بڑے انشا پرداز نہیں کر سکتے"، وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچتا ہے تو ہم میدان کارزار میں کھڑے نظر آتے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستان عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں آ جاتی ہیں، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے تو ایک محقق جغرافیہ داں کی طرح اس کے سارے معلومات فراہم کر دیتا ہے، جب ایک شہر کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کو تحریر کرتا ہے، تو ایک مورخ کی شان میں نظر آتا ہے، وہ جب پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات کو بیان کرتا ہے، تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے، یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

سنہ ۱۶۱۲ء میں عثمان خان افغانی نے بنگالہ میں بغاوت کا علم بلند کیا، اس کے استیصال کے لیے جہانگیر نے شاہی لشکر بھیجا، اس جنگ کی جو قلمی تصویر اس نے کھینچی ہے، وہ یہ ہے:

در کنار نالہ کہ زمین آن تمام چہلہ و دلدل بود، جائے جنگ قرار داد، روز یکشنبہ ۹ محرم شجاعت خاں ساعت جنگ اختیار نمودہ افواج قاہرہ را مقرر ساخت کہ ہر یک بجا و مقام خود رفتہ آمادۂ جنگ باشد، عثمان در آن روز قرار جنگ با خود ندادہ بود، چون شنید کہ لشکر ہائے پادشاہی مستعد گشتہ آمدہ اند، ناچار او ہم سوار شدہ بکنار نالہ آمد، و سوار و پیادۂ خود را در برابر افواج منصورہ باز داشت، چون ہنگامۂ جنگ گرم گشت و فوج بہ فوج رو بروئے خود متوجہ گردید، در ہمیں مرتبہ اول آن جاہل خیرہ سر فیل مست جنگی خود را پیشتر انداختہ بہ فوج ہراول ایلچی تاخت، بعد از زد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید اعظم بارہہ و شیخ اچھے برادر زادۂ بشہادت نامی رسیدند، سرداران برانغار و جوانغار ہم در ستیز و آویز تقصیر

نه کرده جان خود را نثار می نماید، و جمعی که با او بودند، آنقدر تلاش می کنند که پاره پاره می شوند، همچنان گروه چیرا قنفار کشور خان داد مردی و مردانگی داده خود را فدای کار صاحب می سازد، با آنکه تیره بختان نیز سیاه زخمی و کشته شده بودند، آن مه به حساب لشکریان را از روی دانستگی و فهمیدگی بخاطر می آورد و مشخص خود می سازد که سرداران هراول چیرا قنفار و چیرا قنفار کشته شدند، همین قول مانده از کشته شدن و زخمی گشتن جمعیت خود پروا نکرده در همان گرمی بر قول می تازد و درین جانب پسر و برادران و خویشان شجاعت خان و دیگر بنده ها راه بر آن گمراهان گرفته بر مثال شیران و پلنگان به پنجه و دندان تلاش می کردند، چنانچه بعضی درجهٔ شهادت یافتند، و جمعی که زنده ماندند زخمهای منکر داشتند، درین وقت فیل مستی گجپت نام که فیل اول او بوده بر شجاعت خان می دواند شجاعت خان دست بر برچه برده بر فیل میزند، آن طور فیل مستی را از برچه چه پروا است، دست به شمشیر برده و شمشیر پی در پی می زند، از آن هم چه محابا بعد از آن جمدهر کشیده و جمدهر می رساند، با آن هم برنمی گردد و شجاعت خان را با اسپ زیر می کند، بمجرد از اسپ جدا شدن، جهانگیر شاه گفته برمی جهد و جلودار او شمشیر دودستی بر خرطوم فیل رسانیده و چون فیل بر زانو در می آید، اتفاقاً جلودار فیلبان را از بالای فیل زیر می کشد، و همان جمدهر که در دست داشت، درین پیادگی به نوعی بر خرطوم و پیشانی فیل می زند، که فیل از الم آن فریاد زنان بر می گردد، و چون زخمها بسیار داشت به فوج خود رسیده می افتد و اسپ شجاعت خان سالم بر می خیزد و در حینی که سوار می شد، آن مخذولان فیل بر علمدار او می دوانند و علم او را با اسپ زیر می کنند و از آنجا شجاعت خان نعرهٔ مردانه کشیده علمدار را خبر می سازد و می گوید که مردانه باش من زنده ام و در پای علم درین وقت تنگ هرکس از بنده های درگاه حاضر بودند، دست به تیر و جمدهر و شمشیر برده

بر فیل می دوند، و شجاعت خان ہم خود را رسانیدہ، بہ علمدار نہیب می دہد، کہ بر خیزد و اسپ دیگر بہمت علمدار حاضر ساختہ، او را سوار می سازد و علمدار علم را برافراختہ بر جائے خود می ایستد در اثنائے این گیر و دار تفنگی بر پیشانی آں مقہور می رسد کہ زنندۂ آنرا ہر چند تفحص کردند، ظاہر نشد بمجرد رسیدن، این تفنگ ازاں گرمی باز آمد، و می داند کہ ازین زخم جان بری نیست، تا دو پہر ہم با وجودیکہ چنین زخمی منکر مردم خود را بہ جنگ ترغیب می نمود، معرکہ قتال و جدال گرم بود بعد ازان غنیم رو گردانید، و افواج قاہرہ سر در پے آنہا می نہند، و زدہ زدہ آں مخذولان را در محلے کہ دائرہ کردہ بودند، در می آورند، آں مخذولان بہ تیر و تفنگ مردم را نگاہ داشتہ نمی گذارند کہ مردم پادشاہی بجا و مقام آنہا در آئیندہ چون ولی برادر عثمان و ممریز پسر او و دیگر خویشان و نزدیکان او بہ زخم عثمان مطلع می شوند بخاطر می گزرانند کہ ازین زخم خود او را خلاصی میسر نیست، اگر با ہمچنین شکستہ و ریختہ بہ قلعہ خود ردیم یک کس زندہ نخواہد رسید، صلاح در نیست کہ امشب کہ درہمیں جا کہ دائرہ کردہ ایم بمانیم و آخر شب فرصت جستہ، خود را بہ قلعہ خود رسانیم دو پہر از شب گذشتہ عثمان بجہنم واصل می گردد۔۔۔۔۔۔۔۔ الخ[1]

وہ عیش و نشاط کی بزم کی تصویر بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ کھینچتا ہے، تخت نشینی کے بعد پہلے نوروز کے جشن کا مرقع اس طرح سج کر تیار کرتا ہے،

شب سہ شنبہ یازدہم ذیقعدہ ۱۰۱۴ھ ہزار و چہاردہ صبح کہ محل فیضان نور ست حضرت نیر اعظم از برج حوت بخانہ شرف و خوش حالی خود کہ برج حمل باشد، انتقال فرمود چون اول نوروز از جلوس ہمایون بود، فرمودم کہ ایوانہائے دولت خانہ خاص و عام بدستور زمان والد بزرگوارم در اقمشہ نفیسہ گرفتہ، آئین در غایت زیب و زینت بستند، و از روز

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۳۰–۱۳۱ نولکشور پریس۔

نوروز تا نوزدہم، درجۂ حمل کہ روز شرف است خلائق داد عیش و کامرانی دادند، اہل سازو نغمہ از ہر طائفہ و ہر جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند کہ بکرشمہ دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامۂ مجلس راگرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس از مکیفات و مغیرات، آنچہ می خواستہ باشند بخورد، منع و مانعی نہ باشد۔"

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما ... مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما[1]

تخت نشینی کے بارہویں سال شعبان کی چودہویں تاریخ کو نورجہاں نے ایک مجلس جشن ترتیب دی، اس کا حال جہانگیر اس طرح لکھتا ہے:۔

"آخرہائے روز پنجشنبہ بست و ششم موافق چہاردہم شہر شعبان کہ شب برات بود، در یکے از منازل و عمارات محل نورجہاں بیگم کہ در میان تالابہائے کلان واقع است، مجلس جشن نمودم، و امرا و مقربان را دریں مجلس کہ ترتیب دادہ بیگم بود طلب داشتہ حکم کردم کہ بردم پیالہ را اقسام کیفیات بہ مقتضائے خواہش ہر کس بدہند بسیارے پیالہ اختیار نمودند، فرمودم کہ ہر کس کہ پیالہ بخورد بہ مثل منصب و حالت خود نشیند، و اقسام کبابہا و میوہ ہا بطریق گزک مقرر شد کہ در پیش ہر کس بنہند، عجیب مجلسے منعقد گشت، در آغاز شام براطراف تال و عمارات فانوسہا و چراغہا روشن ساختہ، چراغانے بہم دست داد، کہ تا ایں رسم را معمول ساختہ اند، شاید در ہیچ جا مثل ایں چراغانے نشدہ باشد جمیع چراغہا و فانوسہا عکس در آب انداختہ بنوعے بنظر می آمد کہ گویا تمام صحن ایں تالاب یک میدان آتش است، بسیار شگفتہ مجلسے گذشت و پیالہ خواراں زیادہ از حوصلہ طاقت پیالہا تناول نمودند۔"

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۲۲۳۔

دل افروز بزمے شد آراستہ — بخوبی بدانسان کہ دل خواستہ
فگندند در پیش ایں سبز کاخ — بساطے چو میدان ہمت فراخ
زمیں نکہت بزم می رفت دور — فلک نافہ مشک بود از بخور
شدہ جلوہ گر تا ز نیان باغ — رخ افروختہ ہر یکے چون چراغ [51]

وہ دقیق فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو اس سادگی، اختصار اور حسن و خوبی سے لکھتا ہے کہ دوسرے اہل قلم شاید صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کے بعد بھی وہی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، وہ ہندو پنڈتوں کو بتانا چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات مقدس جسم و چون وچگونگی سے منزہ ہے، تو لکھتا ہے:-

روزے از پنڈتان کہ عبارت از دانایان ہنود ست پرسیدم کہ اگر تنہا سے دین شما برفرود آمدن ذات مقدس حق تعالیٰ است در دہ پیکر مختلف بطریق حلول آن خود بزد دار با عقل مردود است و ایں مفسدہ لازم دارد کہ واجب تعالیٰ کہ مجرد از جمیع تعینات ست صاحب طول و عرض و عمق بودہ باشد، و اگر مراد ظہور نور الٰہی است دریں اجسام آن خود در ہمہ موجودات مساوی است، و بایں دہ پیکر مخصوص نیست و اگر مراد اثبات صفتے از صفات الٰہی ست، دریں صورت ہم تخصیص درست نہ، زیرا کہ در ہر دین و آئین صاحبان معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردمان زمان خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت وشنود بسیار و ردو بدل بیشمار بخدائی خدائے منزہ از جسم و چون وچگون معترف گشتند وگفتند کہ چون اندیشہ ما در ادراک ذات مجرد ناقص است، بے وسیلہ صورتے ما بہ معرفت او نمی بریم وایں دہ پیکر را وسیلہ شناخت و معرفت خود ساختہ ایم، پس گفتم ایں

---

[51] تزک جہانگیری صفحہ ۱۹۱، نولکشور پریس۔

ایں پیکرہائے شمار او سیلۂ مقصود دیہ معبود توانند بود۔"[۱]

وہ جب پھولوں کا ذکر کرنے لگتا ہے تو نباتات کے طالب العلم اپنی واقفیت میں نئی معلومات کا بیش قیمت اضافہ کر سکتے ہیں، آگرہ کے شاہی باغ گل افشاں کے پھولوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

اول گل چنپہ گلی ست در نہایت خوشبوئے و لطافت ہیأت گل زعفران لیکن رنگ چنپہ زرد مائل بسفیدی ست، درخت آن در غایت موزونی ست و کلان و پر برگ و شاخ وسایہ دار می شود، ایام گل یک درخت باغے را معطر دارد، و از آن گذشتہ گل کیوڑہ است کہ ہیئت و اندام غیر مکرر است، بوئے او در تندی و تیزی بدرجۂ ایست، کہ از بوئے مشک ہیچ کمی نہ دارد، دیگر رائے بیل کہ در بو از عالم یاسمین سفید است، غایتاً برگہایش دو سہ طبقہ بر روئے ہم واقع شدہ، دیگر گل مولسری است، کہ درخت آن نیز بسیار خوش اندام و موزون و سایہ دار است، و بوئے گل آن در نہایت ملایمت دیگر گل سیوتی کہ از عالم گل کیوڑہ است، غایتاً کیوڑہ خار دار است، و سیوتی خار نہ دارد، رنگ آن بزردی مائل است و کیوڑہ سفید رنگ ست از یں گلہا و از گل چنبیلی کہ یاسمن سفید ولایت ست، روغن ہا خوشبوی سازند،

جانوروں کی تصویر جب وہ کھینچتا ہے، تو وہ اتنی صاف اور واضح ہوتی ہے کہ علم الحیوانات کے ماہرین اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ۱۰۲۱ھ میں مقرب خان کھمبائت سے ایک عجیب غریب جانور ساتھ لایا، اس کا بیان جہانگیر جس طرح کرتا ہے، وہ انشا پردازی، اور لطافت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے، ملاحظہ ہو:

یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلان تر، و از نر قدری بخاطر خورد تر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید، تخم خود را و دیگر پر ہا را طاؤس آسا پریشان می سازد، و بہ رقص در می آید، سر و گردن وزیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد، وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ است، گویا کہ تمام او

[۱] تزک جہانگیری ص ۱۵۱ نولکشور ایڈیشن ص ۱۱۹

بہ مرجان مرصع ساختہ اند، و بعد زمانے ہمیں جا ہا سفید می شود و بہ طریق پنبہ بہ نظر در می آید، بوقلمون آسا ہر زمان برنگے دیگر دیدہ می شود، و دو پارچہ گوشتی کہ بر سر دارد، بتاج خروس مشابہ است، عجیب این است کہ در ہنگام مستی پارچہ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالائے سر او تا یک وجب می آویزد و باز کہ آنرا بالا می کشد، چون شاخ کرگدن بر سر او مقدار دو دو انگشت نمایاں می گردد، اطراف چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست۔[1]

جہانگیر جب کسی جگہ کے کیف پرور اور خمار رنگین مناظر سے متاثر ہوتا تھا، تو اپنے کیفیات و جذبات کو اسی انداز سے تحریر میں لاتا تھا، کشمیر کو دیکھتا تو اپنے کیف و مستی کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنین حصار، پادشاہان را گلشنے است عشرت افزا و درویشان را خلوتکدۂ دلکشا، چمنہائے خوش و آبشارہائے دلکش از شرح و بیان افزون، آبہائے روان و چشمہ سارہائے از حساب و شمار بیرون، چندانکہ نظر کار کند سبزہ است و آب روان، گل سرخ و بنفشہ و نرگس خودرو صحرا صحرا، انواع گلہا و اقسام ریاحین از آن بیشتر است کہ بشمار در آید، در بہار جان نگار کوہ و دشت از اقسام شگوفہ مالامال، در و دیوار و صحن و بام خانہا از مشعل لالہ بزم افروز، چہ گلہائے سطح و سبزہ گلہائے میروت پا چہ گوید،

شدہ جلوہ گر تا ز نیسان باغ — رخ آراستہ ہر یکے چون چراغ
شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست — چون تعویذ مشکیں بیازوئے دوست
غزل خوانی بلبل صبح خیز — تمنائے مے خوارگان کردہ تیز
بہر چشمہ منقار ربط آب گیر — چو مقراض زرین بقطع حریر
بساط گل و سبزہ گلشن شدہ — چراغ گل از باد روشن شدہ

[1] تزک جہانگیری بحوالہ مقالات شبلی تنقیدی جلد چہارم ص ۱۵۴ – ۱۵۵

بنفشہ سر زلف را خم زدہ   گرہ در دل غنچہ محکم زدہ[1]

جب وہ سوگوار اور مغموم ہوتا ہے، تو بڑے دردناک پیرایہ میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے۔ خسرو کی ماں اس کی باغیانہ اور ناشایستہ حرکتوں سے عاجز آکر افیون کھا لیتی ہے، اس کی موت پر جہانگیر جس طرح ماتم کرتا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

از خوبی ہا و نیکذاتی ہاے او چہ می نویسم عقلے بکمال داشت، وا خلاص او بمن درجہ بود کہ ہزار پسر و برادر را قربان یک موے من می کرد، مکرر بہ خسرو مقدمات نوشتہ و او را دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد، چون دید کہ ہیچ فائدہ ندارد ...... از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی است، خاطر بر مرگ خود قرار دادہ ...... روز بیست و ششم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار در عین سوزش دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت ...... از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب دارد طبیعت نگشت، چون این قصہ بہ والد بزرگوارم رسید دلاسا نامہ   مرحمت بدین مرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر بر داشتہ بودند، ہمایون طور بستہ بجہت من فرستادند، این عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب واضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامی بخشید[2]

جہانگیر کی یہ قادر الکلامی صرف نثر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ نکتہ سنج اور ادیب ہونے کے ساتھ وہ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتا تھا، بقول مولانا شبلی "سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمانروا سخن فہم و ادا شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اچھا درک رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا۔ اس کا اثر اگرچہ اس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہونے دیا، یہاں تک کہ

1. تزک جہانگیری ص ۲۱۲، ۲. ایضاً ص ۲۷

تزک میں نور جہان کا جہاں جہاں ذکر آیا مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لیے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھ کر کون ہوسکتا تھا۔" (شعر العجم حصہ سوم ص۱۹۵)

وہ خود شاعر تھا، چنانچہ مندرجۂ ذیل اس کی ایک غزل ہے، جو سلاست اور رنگینی بیان کے لحاظ سے خوب ہے:

من چون کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ می خرامی و مست تو عالمی — اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل دوست مستم و در ہجر بیقرار — داد از چنین غمے کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہ وصال — فریاد ازان زمان کہ مرا این خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر — امید آنکہ شعلۂ نور و اثر رسد[1]

مصنف مخزن الغرائب نے جہانگیر کے جو چند اشعار نقل کئے ہیں، وہ یہ ہیں:

ما نا کہ بہ برگ گل نوشتیم — شاید کہ صبا بار در ساند

رباعی

ہر کس بضمیر خود صفا خواہد داد — آئینہ خویش را جلا خواہد داد
ہر چہ کہ شکستہ بود درستش گیر — بشنو کہ ہمین کار سر صد خواہد داد

رباعی

اے آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ — اندوہ دل و سود سرناکنتہ خوردہ
مانند قطرہاے باران بزمین — جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ[2]

---

[1] تزک جہانگیری ص۳۰۴، [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ مو کہ دار المصنفین اعظم گڑھ ورق ۵۰۰۔

وہ اکثر اساتذہ کے مقابلہ میں شعر کہتا، ایک بار امیر الامرا کا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا گیا،

یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است ۔۔۔ گر میسح از سر کشتگان عشق

جہانگیر نے فوراً یہ شعر موزون کیا،

یک دل شکستن تو بصد خون برابر است ۔۔۔ از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس

مولانا علی احمد نشانی نے بھی اس پر ایک شعر کہا، جو جہانگیر کو بہت پسند آیا،

یک خم شکستن تو بصد خون برابر است[51] ۔۔۔ اے محتسب ز گریۂ پیر مغان بترس

ایک دفعہ عبد الرحیم خان خانان نے مولانا جامی کی ایک غزل پر غزل لکھی جس کا ایک مصرع یہ ہے

بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید

جہانگیر کو یہ مصرع پسند آیا اس نے فی البدیہہ مطلع کہا،

ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید[52] ۔۔۔ ساغر مے بر رخ گلزار می باید کشید

ماوراء النہر کے درویش صفت بزرگ خواجہ ہاشم سے جہانگیر خاص عقیدت رکھتا تھا،
ایک بار خواجہ مذکور کے یہاں اس نے ایک ہزار مہر جہانگیری اور اسی کے ساتھ اپنی کہی ہوئی مندرجۂ ذیل رباعی بھیجی،

از دولت یاد بود ما اے درویش است ۔۔۔ اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است

شادیم ز آنکہ لطف از حد بیش است ۔۔۔ چندانکہ ز مہر دولت ما شاد شود

اسی کے ساتھ جہانگیر نے دربار میں فرمائش کی کہ اسی مضمون کی اور رباعیاں کہہ کر طبع آزمائی کیجائے
حکیم مسیح الزمان[53] نے ایک رباعی کہی، جو جہانگیر کو بہت پسند آئی، وہ رباعی یہ تھی،

[51] تزک جہانگیری ص ۱۱۲ [52] اقبال نامۂ جہانگیر و تزک جہانگیری ص ۲۳۵ [53] نام ضیاء الدین کاشان سے ہندوستان آیا، علم طب کا ماہر تھا، اس لیے جہانگیر نے مسیح الزمان کا خطاب دیا، شاعر بھی تھا تذکرہ نصرآبادی میں اسکے بہت سے اشعار منقول ہیں،

دایم اگرچہ شغل شاہی در پیش ۔۔۔ ہر لحظہ کنیم یاد درویشان پیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش ۔۔۔ آنرا شمریم حاصل شاہی خویش

جہانگیر نے خوش ہو کر حکیم مذکور کو ایک ہزار مہر انعام میں دیا[1]

سنہ جلوس شاہی میں جہانگیر موضع سمونگر شکار کے لیے گیا ، اسی شکارگاہ میں ایک رات اس نے یہ شعر کہا :-

بود پیر آسماں تا مہر را نور ۔۔۔ مبادا عکس او از چتر شہ دور

اور قصہ خوانوں کو تاکید کی کہ سلام و صلوٰۃ بھیجتے وقت یہ شعر بھی پڑھا جائے[2]

ایک شکارگاہ میں جہانگیر کے تیر نے ایک کالے ہرن کا شکار کیا وہ گرا تو غایت خوشی میں جہانگیر چلا اٹھا،

چیتہ پادشاہ زد کالہ

طالب آملی بھی ساتھ تھا ، اس نے برجستہ کہا

گشت صحرا ز خون پر از لالہ

جہانگیر نے مسرور ہو کر پانچ ہزار روپے انعام طالب کو دیے ، (تذکرہ سرخوش قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) ،

ایک بار جہانگیر نے پانی پینے کو مانگا مٹی کے کوزہ میں پانی لایا گیا ، کوزہ بہت ہی نازک پانی لانے والے کے ہاتھ میں جنبش ہوئی تو کوزہ ٹوٹ گیا ، جہانگیر نے اپنے ہم صحبت نواب قاسم خان یعنی نورجہان کی حقیقی بہن منیجہ بیگم کے شوہر کی طرف دیکھ کر فوراً کہا

کاسہ نازک بود و آب آرام نتوانست کرد

قاسم خاں نے بھی فی البدیہہ عرض کیا ،

---

[1] تزک جہانگیری ص۱۱۱ [2] ایضاً ص۱۰۱

دید حالم را و چشمش ضبط اشک خود نکرد   کاسہ نازک بود و آب آرام نتوانست کرد[۱]

۱۲ سنہ جلوس میں سید عبد اللہ خان بارہہ شاہزادہ خرم کی یہ عرضداشت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ عادل خان، عنبر اور دکن کے تمام سرکشوں نے اطاعت اختیار کر لی ہے، جہانگیر یہ مژدہ سنکر نہایت خوش ہوا، اور شادیانے کے نقارے بجوائے، سید عبد اللہ خان کو سیف خان کا خطاب دیا، شہزادہ خرم کے لیے ایک لعل بے بہا بھجوایا، اور عادل خان کے نام فرمان جاری کیا، جس میں اپنا یہ شعر لکھ بھیجا،

شدی از التماس شاہ خرم   بفرزندی ما مشہور عالم[۲]

اس کے دوسرے سال عادل خان نے جہانگیر کی ایک تصویر کی درخواست کی، جہانگیر نے ایک لعل گراں بہا و لعل خاصہ کے ساتھ اس کو اپنی تصویر عنایت کی، اور اس پر یہ رباعی دست خاص سے لکھ دی،

اے سوے تو دائم نظر رحمت ما   آسودہ نشین بسایۂ دولت ما
سوے تو شبیہ خویش کردیم روان   تا معنی ما ببینی از صورت ما[۳]

۱۴ سنہ جلوس میں جہانگیر کلانور میں مقیم تھا کہ خان عالم جو شاہ عباس کے پاس ایران قاصد بنا کر بھیجا گیا تھا، واپس آیا، جہانگیر اس کے ساتھ بہت ہی لطف و عنایت کے ساتھ پیش آتا تھا، جب اس کے نزدیک آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اسے مندرجہ ذیل مطلع لکھ کر عطر جہانگیری کے ساتھ بھیجا،

بسویت فرستادہ ام بوے خویش[۴]   کہ آرام ترا زود تر سوے خویش

جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سکوں پر بھی اس کا اظہار

۱ مرآۃ الخیال ص۱۰۰، ۲ تزک جہانگیری ص۱۹۵ ۳ ایضاً ص۲۱۲، ۴ ایضاً ص۲۸۵

چاہتا تھا، چنانچہ سو تولے، پچاس تولے، بیس تولے، اور دس تولے کی مہروں پر یہ بیت لکھی ہوئی تھی،

بخط نور بر زر کلک تقدیر　　　رقم زد شاہ نور الدین جہانگیر

اور مصرعوں کے درمیان کی جگہ چھوڑ کر کلمہ اور دوسری طرف یہ بیت جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے، منقش تھی،

شد چو خورزین سکہ نورانی جہاں　　　آفتاب مملکت تاریخ آن

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر تھا،

روے زر را ساخت نورانی برنگ مہرو ماہ　　　شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جب نور جہاں کا اقتدار ہوا تو سکہ پر یہ شعر ثبت کیا،

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور　　　بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

جہانگیر کی سخن فہم اور ذوق شناس طبیعت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی، کہ اس کے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بد مذاقی کی جائے، ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا حضور نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا، ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا، کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت بر سر" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

مولانا شبلی تذکرۂ سرخوش سے شعر العجم حصہ سوم میں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں تقی تخلص کا ایک شاعر تھا، جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لیے مخصوص تھی، تقی نے نور جہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری

کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاوشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت لیکن نورجہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مئی نے یہ شعر پڑھا۔

مئی بگریہ سرے وا دوائے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشہ کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی، مئی نے مطلع پڑھا:

من می روم وبرق زبان شعلۂ آہم اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔[1]

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم ان اشعار کا ذکر کریں جن کو جہانگیر نے خاص طور پر پسند کیا اور ان پر اپنی رائے ظاہر کی، تاکہ ناظرین کو اس کا صحیح مذاق معلوم ہو، مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ جہانگیر کا ذوق شاعری اس قدر صحیح تھا، جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق کہا نہیں جا سکتا،

سنہ جلوس میں مانڈو (فتح پور) کے ایک تال کے قریب قروکش ہوا تو وہاں ایک ستون پر ایک رباعی لکھی ہوئی دیکھی، اس کے بارے میں لکھتا ہے:

درمیان تال نشیمنے از سنگ واقع است بریکے از ستون ہا رباعی شخصے ثبت نمودہ بود

بنظر درآمد و مرا ازجا درآورد، الحق از شعرہائے خوب است، رباعی

یاران موافق ہمہ از دست شدند در دست اجل یگان یگان پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

اس کے بعد فوراً ہی لکھتا ہے:

---

[1] تذکرہ سرخوش و ذکر میں، و شعر العجم حصہ سوم ص۔۔۔

دریں وقت رباعی دیگر ہم ازیں عالم شنیدہ شد، چون بسیار خوب گفتہ آن را نیز نوشتم"

رباعی

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند — از خاطر ہمدمان فراموش شدند

آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند[۵۱]

ایک بار سلطان قوام کے بیٹے حسینی کی ایک رباعی اس کے سامنے پڑھی گئی جو اس کو پسند آگئی ہو۔ اس نے تزک میں [illegible] نقل کیا ہے،

گردے کہ تو از طرف دامان ریزد — آب از رخ سرمۂ سلیمان ریزد

گر خاک درت بامتحان بفشارند — از دے عرق جبین شاہان ریزد

اس رباعی کو نقل کرکے وہ لکھتا ہے:-

"معتمد خان دریں وقت رباعی خواند، مرا بغایت خوش آمد، در بیاض خود نوشتم"

رباعی

زہر رم بفراق خود چشانی کہ چہ شد — خون ریزی و داستین فشانی کہ چہ شد

اے غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد — خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد[۵۲]

یہ رباعی بابا طالب اصفہانی کی تھی۔

سلطان سنجر کے ملک الشعراء معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھا تھا، اس کے سامنے پڑھا گیا، جس کا مطلع یہ ہے،

اے آسمان سحر حکم روان تو — کیوان پیر بندۂ بخت جوان تو

اس مطلع کو سنکر وہ بہت محظوظ ہوا، اور اس قصیدہ کی تعریف تزک میں کرتا ہے، کہ

۵۱ تزک جہانگیری ص۲۳۰، نولکشور پریس ۵۲ ایضاً ص۲۴۹،

"بنہایت سلیس وہموار گفتہ"

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدہ کے تتبع میں ایک قصیدہ کہکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جسکو اس نے پسند کیا، اس کی تعریف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار تزک میں نقل کئے ہیں:[۱]

اے نہ فلک نمونہ از آستانِ تو | دورانِ پیر گشتہ جوان در زمانِ تو
بخشند دل تو فیض دہد بے سبب چو مہر | جانہا ہمہ فدائے دل مہربانِ تو
از باغ قدرت است فلک یک ترنج سبز | انداختہ بروئے ہوا باغبانِ تو
یارب چہ گوہری تو کہ افروخت در ازل | جانہائے قدسیان ہمہ از نور جانِ تو
بادا جہان بکام تو اے بادشاہ عہد | در سایۂ تو خرم شاہ جہانِ تو
اے سایۂ خدا از تو پرنور شد جہان | بادا ہمیشہ نور خدا سائبانِ تو

ایک بار ایک ہندو شاعر نے جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی جس کا حاصل یہ تھا، کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا، تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اس کا بیٹا اس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپکے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا، آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے دور سلطنت میں کہیں رات نہیں، جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سنکر بہت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی انعام میں دیا، وہ لکھتا ہے:-

"ایں تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ، بہ جلدوی ایں مدح فیلے بادر حمت کردم"

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا، جو حسب ذیل ہیں:-

گر پسر داشتی جہان افروز | شب نہ گشتی ہمیشہ بودی روز

---

[۱] تزک جہانگیری ص۲۲۲، نولکشور پریس

زانکہ چون او نہفتہ افسر زر ۔۔۔ بہ نمودی کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد آن چنان پدرے ۔۔۔ جانشین گشت این چنین پسرے
کز شنفتار گشتن آن شاہ ۔۔۔ کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ[1]

جہانگیر کو طالب آملی کے مندرجہ ذیل اشعار بہت مرغوب تھے،

ز غارت چمنت بر بہار منتہا ست ۔۔۔ کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
لب از گفتن چنان بستم کہ گوئے ۔۔۔ دہان بر چہرہ زخمی بود و بہ شد
عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع ۔۔۔ این تب لے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
گر من بجائے جوہر آئینہ بودمے ۔۔۔ رونما ترا بتو کے می نمودمے
دو لب دارم یکے در می پرستے ۔۔۔ یکے در عذر خواہی ہائے مستے

جہانگیر کے اس انتخاب پر مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ "خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔[2]"

ایران سے ملا محمد صوفی مازندرانی ہندوستان آئے تو اپنے زہد، تقوی اور صوفیانہ ذوق کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے لیے بھی مشہور ہوئے، بتخانہ کے نام سے ایک بیاض ترتیب دی تھی جس میں ساٹھ ہزار اشعار تھے، ان کا ساقی نامہ بہت ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :۔

نمی ماند این بادہ اصلا بآب ۔۔۔ تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

جہانگیر کو بھی ان سے ملنے کا شوق ہوا، وہ احمد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، شاہی حکم کے بموجب سیف خان صوبہ دار گجرات نے جو خود بھی ملا صوفی کا معتقد تھا، ان کو دار السلطنت

[1] تزک جہانگیری ص۹۵ [2] شعر العجم حصہ سوم ص۷، و تزک جہانگیری ص ۲۸۹

روانہ کیا، مگر راستہ ہی میں مالک حقیقی سے جا ملے، وفات کے وقت یہ رباعی کہی:

اے شاہ نہ تخت و نہ نگین می ماند ۔ از بہر تو یک دو گز زمین می ماند

صندوق خود و کاسہ درویشان را ۔ خالی کن و پر کن کہ ہمین می ماند

جہانگیر نے یہ رباعی سنی تو اس پر رقت طاری ہوگئی (مآثر الامراء جلد سوم ص۴۵۵)

جہانگیر کی خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے والے بھی اس کے علمی ذوق سے متاثر ہوئے، ہم اس کے شہزادوں اور نورجہاں بیگم کی علم پروری کا ذکر آیندہ صفحات میں کریں گے، اس کے خسر یعنی نورجہاں کے باپ اعتماد الدولہ کو بھی ادب وانشاء سے ذوق تھا، مآثر الامراء جلد اول (ص۱۳۱) میں ہے:

"اعتماد الدولہ اگرچہ شعر نمی گفت اما تتبع شعر متقدمین بسیار کردہ، در انشا بد طولی داشت و شکستہ را متین و آبداری نوشت، وخوش محاورہ رنگین صحبت شگفتہ او بودہ، وبا زندگی و معاملہ فہمی نیک اندیش کار رواں بود"

اس کے یہاں بھی شعروشاعری کی مجلس گرم ہوا کرتی تھی، شعراء اس کے دربار میں قصیدے کہتے، اور انعام پاتے، حکیم عارف ایگی نے جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کی شان میں حسب ذیل قصیدہ دلآویز انداز میں کہا تھا:

عارف نیاز مند از آن زلف ما پیچ ۔ تا بر تو نگذرد ہمہ ہر روز گار پیچ

پیستان نو بہار جوانی ہست می ۔ یعنی بموج بادہ بگیر از خمار پیچ

در حلقہ پیچ دارد زلف تو ہمچنانکہ ۔ ہنگام خشم در گرہ چشم مار پیچ

آن اعتماد دولت کز راست بینی اش ۔ از موج خشم جدا نشود از جویبار پیچ

تا در زمانہ پیچ نماند بعہد تو ۔ زان موج آنگہیر کشد بر کنار پیچ[۱]

[۱] ایضاً ص۴۲۶

جہانگیر کہا کرتا تھا کہ اعتماد الدولہ کی صحبت ہزار مفرح یاقوتی سے بہتر ہوتی ہے، اعتماد الدولہ کے عالم نزع میں جہانگیر نورجہان کے ساتھ اس کے بستر مرگ کے پاس پہنچا تو نورجہان نے باپ سے جہانگیر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ آپ ان کو پہچانتے ہیں اعتماد الدولہ نے اسی حالت میں انوری کا یہ شعر پڑھا:

آنکہ نابینائے مادرزاد اگر حاضر شود　　در جبین عالم آرایش ببیند بہترے

جہانگیر کا ہمزلف یعنی نورجہان کی سگی بہن منیجہ بیگم کا شوہر نواب قاسم خان بھی شاعر تھا، اس کا ذکر نورجہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا، اسکی ایک غزل ہے،

می پرستم مہ ز چشمم جائے آب آید بروں　　گر بگرید بلبل از چشمش گلاب آید بروں
یک رہ اندر چشم من آید خیال او بخواب　　کے ز ذوق آں دگر از چشم خواب آید بروں
بسکہ میل ہمزبانی با تو دارد ہر کسے　　گر ز شکل آئینہ پرسی جواب آید بروں
ز اشتیاق ہم نشینی ہائے گوش دگرت　　بعد ازیں ہمچون صدف از حباب آید بروں
بسکہ قاسم پیشتر از مہر علی موسی رضا　　سینہ اش گر بشگافی آفتاب آید بروں

(ارمغان پاک ص ۱۹۱)

جہانگیر کا ندیم خاص محمد شریف تھا، جس کو اس نے معتمد خان کا خطاب دیا تھا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے، (مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۳۱)

بدور شاہ جہانگیر خانی ازان شد　　شریفہ یا نوی مارفت و معتمد خان شد

جہانگیر کی تزک لکھنے میں بھی معاون رہا، تزک میں سترہویں جلوس کا کچھ حصہ، اٹھارہویں اور پھر انیسویں جلوس کا کچھ حصہ اسی کا نوشتہ ہے،

جہانگیر کے ایک دوسرے ندیم مرزا محمد ہادی نے تزک کا تکملہ لکھا، اور شروع میں دیباچہ بھی تحریر کیا، معتمد خان نے اقبال نامۂ جہانگیری کے نام سے تیموریوں کی تاریخ تین جلدوں میں لکھی،

پہلی جلد میں تیمور سے ہمایوں تک کے حالات تھے، دوسری اکبری عہد کے واقعات پر مشتمل تھی، تیسری میں جہانگیر کے دور کی سیاسی تاریخ ہے، پہلی دو جلدیں مفقود ہیں، لیکن تیسری جلد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہو گئی ہے،

جہانگیر کے امرار میں بہت ہی قابل، بڑا علم دوست، دریا دل اور مشہور شعرار کا ہم پلہ مرزا غازی خان تھا، جو مرزا جانی بیگ جلیبی کا لڑکا تھا، اس کو فرزند کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب عطا کر کے قندھار کا حاکم بنایا تھا، اور ٹھٹھہ اور ملتان جاگیر میں دیے تھے، اس کے یہاں ارباب کمال کا اجتماع رہتا تھا، ملا مرشد بروجردی، ملا اسد قصہ خوان، طالب آملی اور میر نعمت اللہ وصلی نے اسی کے یہاں تربیت پائی، میخانہ میں ہے:

چوان خوشخوئی خوش روی کرہمی بودہ ، بہ اکثریاس خاطر ارباب معنی می داشتہ وبا آن

جماعت بے تکلفانہ سلوک می کردہ، مروتش بمرتبہ خوب وسخاوتش بحدی مطلوب بودہ،

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ ایران سے جو اہل کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا، چنانچہ ماثر الامرار میں ہے کہ فغفوری گیلانی قندھار پہنچا تو غازی خان اس کے ساتھ بہت ہی لطف و کرم سے پیش آیا، مگر فغفوری کو بعض باتیں ناگوار ہوئیں، اس لیے لاہور کی طرف اٹھ کھڑا ہوا، غازی خان نے معذرت لکھ بھیجی، لیکن فغفوری نے قبول نہیں کیا،

غازی خان خود بھی بہت ہی بلند پایہ شاعر تھا، قندھار میں ایک شاعر وقاری تخلص رکھتا تھا، غازی خان نے اس تخلص کو ہزار روپے، خلعت اور ایک گھوڑا دیکر خرید لیا، عالم شباب یعنی پچیس سال کی عمر میں اس کی وفات ہوئی، پھر بھی پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، میخانہ میں اس کا ایک طویل ساقی نامہ منقول ہے، اسی سے مولانا شبلی نے اس کی بعض غزلوں کے حسب ذیل اشعار منتخب کیے ہیں:

در عہد تو مارا ہمہ با غیر خطاب است   سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب   ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار   نشستہ پہلوی ہم یہ کشیم آوازے

مولانا مرشد بروجردی نے اس کی شان میں بہت سے قصیدے کہے ہیں، ایک قصیدہ کے صلہ میں اس نے مولانا کو مرشد خان کا خطاب دیا، طالب آملی کا بھی ممدوح رہا، طالب کی مداحی تو عاشقی کی حد تک پہنچ گئی تھی،

جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر سپہ سالار مہابت خان نے بھی اپنے یہاں علمی مجالس سجائیں، شیخ حکیم رکنا کاشی، آقا صنفی صفاہانی، اسد بیگ قزوینی، مولانا حمید رضائی اور مولانا مرشد بروجردی اس کی فیاضیوں سے مستفید ہوئے[1]، وہ خود بھی شاعر تھا، سوسنی تخلص کرتا تھا، اس کا حسب ذیل شعر ندرت خیال کے لحاظ سے خوب ہے،

ننگ و ظلم بود کہ بہشت آرزو کند   دوزخ نصیب من بود و آرزو مباد[2]

آصف خان مرزا قوام الدین جعفر بیگ بھی دربار کا ایک ممتاز اہل علم تھا، اکبر کے بائیسویں سال جلوس میں عراق سے ہندوستان آیا، اور اپنے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خان بخشی کی وساطت سے شاہی دربار میں روشناس ہوا، رفتہ رفتہ ترقی کر کے جہانگیر کے عہد میں پنجہزاری منصب اور عہدۂ وکالت پر مامور ہوا، اس نے بہت سے حربی کارنامے بھی انجام دیے، اس کے ذاتی اوصاف اور علمی ذوق کے بارے میں مآثر الامراء کا مؤلف لکھتا ہے:

یکتائے روزگار تھا، ہر فن میں یگانہ اور ہر ہنر میں کامل، اس کے فہم کی تیزی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو میخانہ مؤلفہ ملا عبد النبی ص ۷۲۵، ۴۴۴، ۴۸۰، ۵۰۰، ۵۵۵، مآثر الکرام حصہ دوم ص ۹۰، مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۸-۵۳۳، شعر العجم حصہ سوم ص ۱۰، مخزن الغرائب ذکر حمید رضائی [2] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۴۰۹،

اور فطرت کی بلندی کی بڑی شہرت تھی، وہ خود کہا کرتا کہ جس چیز کو میں فوراً نہ سمجھوں وہ بے معنی ہے، ایک نگاہ سے تمام سطروں کو پڑھ لیتا تھا، اس کو ملکی ومالی معاملات میں بھی غیر معمولی مہارت تھی، اس کا ظاہر اور باطن آراستہ تھا، شعر وانشا میں کمال اور پختگی حاصل تھی (ج ۲ ص ۱۱۲)

جعفری تخلص کرتا تھا، اور اپنی سخن دری کی شہ زوری میں نظامی گنجوی کے تتبع میں ایک مثنوی خسرو شیریں لکھی، جس کے بارہ میں مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہے:

بعد از شیخ نظامی خسرو شیریں را کسے بہ از و نگفتہ" (ص ۵۳)

مآثر الامراء جلد اول (ص ۱۱۲) میں بھی ہے:

"باعتقاد جمعے بعد از شیخ نظامی گنجہ مثنوی خسرو شیریں بہ از و کسے نگفتہ"

اس مثنوی کے بہت سے اقتباسات تذکرہ نصرآبادی میں منقول ہیں،

امرائے جہانگیری میں عبدالرحیم خانخاناں کی شعر وسخن کی شمع سب سے زیادہ روشن رہی، پہلے کہا جاچکا ہے کہ اس کا دربار شعراء کا ایک دار الحکمت تھا، جہانگیری دور میں اس نے بیس سال تک اس روایت کو قائم رکھا،

شعراء کی سرپرستی | جہانگیر کی شہزادگی کے زمانہ ہی سے شعراء اس کے یہاں ملازم تھے، اس کی مجلس شعر وشاعری سے ہمیشہ گرم رہتی تھی، ایک بہت ہی کمسن شاعر جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، شہزادہ سلیم کے دربار میں اپنی سخن گستری کی داد لیتا تھا، شہزادہ سلیم ہی نے اس کا تخلص طفلی رکھا تھا، شہزادہ کی شان میں اس نے کئی قصائد کہے، ایک مدح کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ایا شہے کہ جہان را زبہر نان خلل	بدورِ معدلتت فتنہ پاسبان آمد
امید لطف تو ہست آنچنانکہ عاصی را	گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد
تو آنی کہ مرکب عزم ترا بہ روز وغا	ظفر علم کش و اقبال ہم عنان آمد

رسانند نامۂ اقبال و شش مرغ شرف — کہ صیت شہپرش از اوج لامکان آمد
نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را — امید ترجمۂ شوق ترجمان آمد

ملا بدایونی نے اس کمسن بچے کی شعرگوئی پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے[۵۱]

میر حیدر رفیعی معمائی کا لڑکا محمد ہاشم سنجر اکبری دور کا ایک ممتاز شاعر تھا، اس کے بارے میں میخانہ کا مؤلف رقمطراز ہے:

بعد از عرفی در استعارہ کردن کسے بہ از مرتکب این شیوہ نشدہ[۵۲]

سنجر نے بھی شہزادہ سلیم کے دربار میں باریابی حاصل کرکے اس کی ثنا خوانی کی، اس کے ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

ہمیشہ لطف تو بر دشمنان شود مصروف — مدام جور تو بر دوستان بود جاری
زمانہ چند دل آزردن از تو آموزد — یکے ز شاہ بیاموز رسم دلداری
منت حلال کنم لیک بر نمی تابد — زبان شاہ سلیم این ہمہ ستمگاری[۵۳]

عرفی جب ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم نے بھی اس کے کلام کی شان و شوکت، استعارات کی طرفگی، بندش کی چستی، مضامین کی نازک خیالی، خیالات کی رفعت اور فقروں کے در و بست کی بڑی شہرت سنی، چنانچہ اس نے عرفی کو اپنے دربار میں بلاکر قصیدہ کہنے کی فرمائش کی، عرفی کی خودستائی اور خودبینی مشہور تھی، مگر اس دعوت پر اپنی خوش قسمتی کا اظہار کرتا ہے، چنانچہ جس وقت یہ پیام لیکر اس کے یہاں قاصد پہنچتا ہے، تو وہ گوہر افشانی کرتا ہے:

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم — گدا کلاہ نمد کج نہادہ شد و سلیم
جہان چنین خوش و من خوشتر از جہان و ناقی — نشستہ با خرد و ناز در تعلم و تعلیم

---

[۵۱] بدایونی جلد سوم ص ۲۷۶۔ [۵۲] میخانہ ص ۲۲۹۔ [۵۳] خزانۂ عامرہ قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے ۔ چناں کہ از چمن طالعم ز مغز شمیم
چہ گفت؟ گفت کہ اے مخزن جواہر قدسیں ۔ چہ گفت؟ گفت کہ اے مطلب بہشت نعیم
بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا ۔ بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شاداں ۔ چناں کہ باغ ز شبنم چنانکہ گل ز نسیم

عرفی ہمہ تن شوق بنکر اور بے تابی کے عالم میں دربار روانہ ہوا،

بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ ۔ کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

اور جب وہ دربار میں پہونچکر شہزادہ سلیم کے سامنے آیا، تو زمین بوس ہوا، کہ وہ لطیف پیرایہ میں کہتا ہے کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے اس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

چو روزگار رسیدم بہ درگہے کہ کند ۔ زمانہ طوف حریمش بہ دیدہ تعظیم
رسیدن من و اقبال آں ہمایوں فال ۔ چناں فتاد مطابق و رآں نخستہ حریم
کہ اگر ادب نکشیدی عنان من قدمش ۔ بہ بوسہ گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

شہزادہ سلیم اس کے ساتھ خاص لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا جس کے بعد وہ آداب شاہی بجا لایا،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد ۔ بہ لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
ز موئیہ کرنش و تسلیم را ادا کردم ۔ بہ داب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم

شہزادہ سلیم نے وقار و تمکنت میں عرفی کی طرف صرف نگاہیں اٹھائیں لیکن جب عرفی سے مخاطب ہوا تو مغرور و خود بین شاعر نے محسوس کیا کہ اس کا سامعہ گوہر کی موجوں میں ڈوب گیا

نگفت و من بشنودم ہر انچہ گفتن داشت ۔ کہ در میاں نگہش کرد بر زبان تقدیم

بش چو نوبت تو بیش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

شہزادے نے بلیغ پیرایہ میں عرفی کی تعریف کی اور پھر قصیدہ کی فرمائش کی،

نخیدہ گفت کہ دہ عذر این گناہ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم پایہ سیفت اقلیم

ہمین کہ رفتی ازین آستان نوشتہ بیار — گزیدہ نسخہ از رادھاے طبع سلیم

عرفی نے شہزادہ سلیم کی شان میں اور بھی قصیدے لکھے، دو کے مطلعے یہ ہیں،

دگر سفیر طبیعت بساز آگاہی — بعالم ملکوت است محملش راہی

نو بہار آمد کہ افشاند چو حسن یار گل — چون وصال عام پرور ہر خس و ہر خار گل

عرفی کو عالم شباب ہی میں حاسدوں نے زہر دیدیا، اس لیے جہانگیر کی بادشاہت کے زمانے میں اس کی سرپرستی سے مستفید نہ ہو سکا، اس کے دیوان میں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰ غزلیں، اور ان کے علاوہ بہت سے قطعات اور رباعیاں تھیں جنمیں ۷۰۰ شعر تھے، مخزن اسرار شیرین خسرو کے جواب میں دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک رسالہ نفسیہ کے نام سے فن تصوف میں تحریر کیا،

جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو شاہی دربار باکمال شعراء سے بھرا ہوا تھا، جہانگیر نے جوہر شناسی سے کام لے کر طالب آملی کو ملک الشعراء کے عہدہ پر فائز کیا، طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، سولہ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، تیموری حکمرانوں کی فیاضیوں کا شہرہ سنکر ہندوستان آیا، قندھار میں غازی خاں کے یہاں ایک قصیدہ لکھکر حاضر ہوا، غازی خان نے بڑی گرمجوشی سے اس کی پذیرائی کی، اور ندیم خاص بنایا، غازی خان کی موت کے بعد خواجہ قاسم دیانت خان کے پاس آگرہ آیا، اور کچھ وقفہ کے بعد دیانت خاں نے جہانگیر کے دربار میں اس کی تقریب کی، مگر طالب جب جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو کچھ ایسا مخمور اور مسحور ہو گیا کہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا،

دیانت خاں کو بڑی ندامت ہوئی مگر طالب گھر آیا تو ۹ شعروں کا ایک قطعہ فی البدیہہ لکھکر دیانت خاں کے پاس بطور معذرت بھیجا، اس کے بعد اعتماد الدولہ نے اس کو دربار میں پیش کیا، جہانگیر بہت لطف و محبت سے پیش آیا، رفتہ رفتہ سخن سنج اور سخن فہم بادشاہ طالب کی شاعری کی تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت و نزاکت سے ایسا متاثر ہوا کہ اس کو دربار کا ملک الشعرا بنایا، جس کے بعد اس نے بڑی خوشحالی سے زندگی بسر کی، اس کا معاصر عبد النبی فخر الزمانی قزوینی مؤلف میخانہ رقمطراز ہے کہ

وزیر اعظم دار الامان مدار المہامی فرمانروائے ہندوستان اعتماد الدولۃ العلیہ العالیہ .... بعد از اندک ایامی خود باعث از دیاد رشد طالب گردیدہ او را داخل بساط بوسان محفل عظمت و شوکت بادشاہ جہان پناہ آسمان جاہ سلیمان دستگاہ شاہ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ گردانید، آن منتخب نکتہ سنجان در اندک زمانی جوہر خویش بر فرمان روای دار الامان ہندوستان و شہریار جان بخش جہان ستان ظاہر ساخت تا در سنہ ثمان عشرین والف آن شہنشاہ گردوں اساس و این بادشاہ جوہر شناس طالب را از امثال و اقران برگزیدہ بخطاب ملک الشعرائی مفتخر و سرفراز گردانید الحال بدولت این خسرو غریب دوست، مسکین نواز و این خورشید ذرہ پرور، از ہمہ چیز بے نیاز سر آمد سخنوران و برگزیدۂ نکتہ پروران است " (ص ۳۸۸)

جہانگیر ایک موقع پر طالب سے ناراض ہو گیا، طالب چند روز شرفیابی سے محروم کر دیا گیا، اس کا قصور معاف ہوا تو اس واقعہ کو ایک قصیدہ میں خاص شاعرانہ لطافت و بلاغت کے ساتھ ادا کرتا ہے، جہانگیر کے ساتھ طالب کو جو قلبی لگاؤ تھا، اس کا بھی اندازہ حسب ذیل اشعار سے ہوگا،

بہ نسبت گہرم دادہ بودی از کف خویش ۔۔۔ ترا ز جود زبانے چنین ہزار افتاد

چو رو شدم ز کفت چرخم از ہوا بربود ۔۔۔ بہ گرمی کہ زبانم بہ نیمہا را افتاد

یکے مقابل خورشید داشتت آئینہ ام ۔۔۔ بدید کز عرقش موج بر عذار افتاد

چو پیش مشعل مہ بردشب چراغ مرا ۔۔۔ بچہرہ گونہ کاہیش شمع وار افتاد

ازیں نشاط مگر دست آسمان لرزید ۔۔۔ کہ باز در کف خاقان کامگار افتاد

کنوں برشتہ اھرش بدار کز تقدیر ۔۔۔ دو بار در کف ایں در شاہوار افتاد[1]

نظیری نیشاپوری کو بھی جہانگیر نے شاہانہ الطاف و اکرام سے سرفراز کیا، اس کے بارے میں تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :

"در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود" (ص ۹۲)

۵ھ جلوس شاہی میں جہانگیر نے اس کا شہرہ سنکر دربار میں طلب کیا، نظیری نے انوری کے اس قصیدہ پر

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را

ایک قصیدہ[3] لکھکر پیش کیا۔ جہانگیر نے اس کے صلہ میں ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کیا ہے[2]

جہانگیر نے ایک دفعہ نظیری سے ایک عمارت کے کتبہ کی فرمایش کی، اس نے ایک غزل لکھ کر پیش کی جس کا مطلع یہ تھا،

ایں خاک درت صندل سر گشتہ سراں را ۔۔۔ با وہ مژہ جاروب رہت تاجوراں را

---

[1] منقول از شعر العجم حصہ سوم ص ۷۹ - ۱۸۰، [2] تزک جہانگیری (ص ۹۲)، شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۳۹) [3] نظیری کا قصیدہ ملاحظہ ہو۔

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگھہ زمین انعام دی[1]،

حیاتی گیلانی بھی جہانگیر کے دربار سے منسلک رہا، اس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے، آخر عمر تک جہانگیر کے جود وکرم سے فیضیاب ہوتا رہا، جہانگیر اس کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا، بہت ہی پرگو شاعر تھا، سات ہزار اشعار اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، خسرو شیرین کی بحر میں قصہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا[2]،

مولانا شکیبی صفاہانی، یہ اپنے شیریں و رنگین کلام کے لیے مشہور تھے، ہندوستان آئے تو کچھ دنوں عبد الرحیم خانخاناں کے دربار میں رہے، پھر مہابت خان کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں پہنچے، اور ایک قصیدہ پیش کیا جس کے تین شعر یہ ہیں:—

فتاد بر سر ہم از ہجوم نقش جباہ   بر آستان جہانگیر شاہ اکبر شاہ

چہ رفعت است تعالی اللہ آستانش را   کہ از بلندی آن پر بریخت مرغ نگاہ

زبسکہ ناصیۂ خویش سودہ اند ملک   نگار خانۂ چین گشتہ خاک آن درگاہ

جہانگیر اس قصیدہ سے محظوظ ہو کر مولانا شکیبی سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا، مولانا شکیبی کو توقع ہوئی کہ جہانگیر کے حضور میں ان کی روزباریابی ہوگی مگر کسی وجہ سے یہ توقع پوری نہیں ہوئی اسلئے کبیدہ خاطر ہو کر ایران واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جہانگیر کو جب ان کی اس کبیدگی کی خبر ملی، تو طلب کر کے کہا

مولانا شکیبی بایستی کہ از درِ ما چندے بموجب تخلص خود شکیبی ... نا شکیبیدے۔

مولانا نے اس لطف خسروانہ کو ایک رباعی میں قلمبند کر کے بطور معذرت پیش کیا،

گفتی شکیبی کہ ز ما نشکیبیدی   لیکن کہ نہ قبلہ و دعا نشکیبیدی

حد نیست مرا کہ گویم ایں بہتان است   گویند بسا کسا کہ از وفا نشکیبیدی

اس رباعی کو سنکر جہانگیر خوش ہوا، پھر مولانا شکیبی سے کہا کہ آپ کی ایک اور رباعی مجھکو بہت پسند آئی ہے جو میں نے اپنی بیاض میں اپنے ہاتھ سے لکھ لی ہے

نزدیست جہان کہ پر دِش باختن است　　زادی آن بداو کم ساختن است
دنیا بمثال کعبتین و نرد است　　بر داشتنش برائے انداختن است

جہانگیر نے ازراہ قدردانی مولانا کو دہلی کی صدارت پر فائز کیا، اور اسی شہر میں آخر عمر تک رہے شکیبی رفت (۱۰۲۳ھ) تاریخ وفات ہے، چار ہزار بیت کے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی خسرو شیریں بھی یادگار چھوڑی، (میخانہ ص ۲۳۰)

ملا لطفی تبریزی ہندوستان آئے تو جہانگیر ان کے کلام کی لطافت، دلاویزی، اور رنگینی سے محظوظ ہوا، اور **موزون الملک** کے خطاب سے سرفراز کیا، اور ندیم خاص بنایا، کچھ دنوں کے بعد ان کو ٹھٹھ کے علاقہ میں بندر لہری کی حکومت تفویض کی، وہاں تین سال رہ کر آگرہ واپس ہوئے، دوسری بار جہانگیر نے ان کو گجرات کے دارالضرب کا داروغہ بنا کر بھیجا ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ہنوز جام شرابے بتو سگلے نزدیم　(۱)　نواے قہقہہ بر صوت بلبلے نزدیم
ہزار فصل گل آرزو رسید و گذشت　　ہنوز بر سر یک آرزو گلے نزدیم

ہمین نہ کام من از روزگار تلخ شدہ است　(۲)　کہ زندگانیم از ہجر یار تلخ شدہ است
ز روزگار بود تلخکامی ہمہ کس　　ز تلخ کامی من روزگار تلخ شدہ است

یکچندپے گردش افلاک شدیم　(۳)　یکچندپے دانش و ادراک شدیم
از آمد و رفت خود ہمی فہمیدیم　　خاکے بہ آمدیم و در خاک شدیم[1]

---

[1] میخانہ ص ۱۳۹-۲۴۰، و تذکرۂ گلشن ص ۳۵۵

مولانا علی احمد **نشانی** کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ صاحب فن، صاحب سخن اور صاحب دل بھی تھے، ایک بار جہانگیر کے حضور میں محفل سماع گرم تھی کہ ایک مطرب نے یہ بیت پڑھی

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے　　　من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

جہانگیر نے حاضرین سے اس بیت کا مطلب پوچھا، مولانا نشانی پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی، اسی عالم میں رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہوئے شاہی تخت کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے کہ ایک روز جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اپنی خانقاہ سے امیر خسرو کے ساتھ نکلے، دریا کے کنارے نظر اٹھائی تو یہ مصرع زبان مبارک سے نکلا،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے یہ مصرع سنا تو برجستہ فی البدیہہ عرض کیا کہ

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سر مبارک پر اس وقت طاقیہ تھی، وہ تھوڑی سی کج تھی، مولانا نشانی نے اس بیت کی تشریح کرنے میں اپنی کلاہ کو کج کیا، اور وجد کی حالت میں بسمل کی طرح رقص کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے، حاضرین کو خیال ہوا کہ مولانا بیہوش ہو گئے ہیں، جہانگیر اپنے استاد کی یہ کیفیت دیکھکر بے چین ہو گیا، غایت اضطراب میں تخت سے اتر کر مولانا کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا، اسی سکر میں مولانا کی روح مالک حقیقی سے جا ملی،[۱]

عطائی مثنوی جونپوری۔ شیخ عبد الکریم عطائی نام اور مثنوی تخلص تھا، انشاد شعر میں اس کی قابلیت مسلم تھی، بعض امرا نے اس کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا، اس کی شاعری سے جہانگیر محظوظ

---

[۱] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

ہو کر جونپور میں کچھ جاگیر مرحمت کی، جس کے بعد معنوی نے خوشحالی سے زندگی بسر کی، اس کی ایک رباعی ہے :-

سودا بسرم ہمچو پلنگ اندر کوہ — غم بر سرِ غم بدل چو سنگ اندر کوہ
دور از وطن خویش بخواری گردم — چو شیر بدریا و نہنگ اندر کوہ[1]

حسن بیگ خاکی، جہانگیر اس کی ذہانت اور دقت نظر کا معترف تھا، شاہانہ نوازش سے سرفراز کر کے اس کو صوبہ بہار کا دیوان بنایا، یہاں اس نے ایک تاریخ عالم بھی لکھی، ۱۰۳۲ھ میں وفات پائی ؛

عشق خوبان وفاکیش ندارد معنوی — سرآن یار بگردم کہ جفا کیش بود[2]

حکیم عارف ایگی، نام سراج الدین حسن، تخلص عارف، اپنے وطن ایگ سے کرمان یزد، کرک اور سیستان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم کی آستان بوسی کی، اور اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے، پھر شہزادہ دانیال کے دربار سے وابستہ ہو گیا، جہاں اس کے دن اچھے نہیں گذرے، اکبر کا بھی پانچ سال تک وظیفہ خوار رہا، پھر وطن چلا گیا، وہاں سے پانچ سال کے بعد واپس ہوا تو کچھ دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کے بعد اعتمادالدولہ کے وسیلہ سے پھر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا، جہانگیر نے شاہانہ لطف و کرم سے نوازا، اور صوبہ بہار میں پانچ سو بگھہ زمین گذران اوقات کے لیے عطا کی، عارف نے جذبۂ تشکر میں ایک قطعہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں ؛

خدایا تو این شاہ درویش دوست — کہ آسایش خلق در ظلِ اوست
برازش برا ورنگ شاہی وجاہ — برا وج فلک تا بود مہر و ماہ

---

[1] میخانہ ص۳۵۵ ، [2] ریاض الشعراء

وہ ایک کتاب اندرزنامہ کا مصنف بھی تھا جس میں شاہنامہ کی بحر میں دو ہزار تین سو اشعار تھے، ایک ساقی نامہ میخانہ میں منقول ہے،[۵۱] اس کے ایک قصیدہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،

شیدا۔ قبیلہ تکلو سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے شیدائے تکلو کے نام سے مشہور ہوا، اس کا خاندان مشہد سے ہندوستان آیا، شیدا کی پیدائش فتح پور (آگرہ) میں ہوئی، اسی لیے ایرانی شعراء اس کو ہندوستانی سمجھتے تھے، جہانگیر کے لشکر میں احدی کی حیثیت سے مامور ہوا، اور دستور کے مطابق اس کو جاگیر اور علوفہ ملتا تھا، دکن کی تسخیر کے سلسلہ میں اس نے عبدالرحیم خانخاناں کی شان میں بھی انوری کے طرز پر قصیدہ کہا، جو مآثر رحیمی جلد سوم (ص۱۲۸۹) میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، کچھ دنوں شہزادہ شہریار کی ملازمت میں بھی رہا، اور آخر میں شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہوا، بہت ہی ذہین، پرگو اور ذی علم شاعر تھا، مگر تمام شعراء اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجوگوئی سے عاجز تھے، حتیٰ کہ ملک الشعراء طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزاء سے نخچیر کیا،

شب و روز مخدوم ما طالبا ۔۔۔ پئے جیفۂ دنیوی در تگ است

مگر قول پیغمبر آمد عجب ۔۔۔ کہ دنیا است مردار طالب سگ است[۵۲]

ارباب سخن شیدا کو زیر کرنے کی فکر میں رہتے، مگر شاید ایک ہی موقع ایسا آیا جب کہ وہ ان سے پسپا ہوا، اس کی دلچسپ تفصیل سے ہم ناظرین کو بھی محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ۱۰۲۳ھ میں جہانگیر اجمیر گیا، لشکر کے ساتھ شاہی جلو میں شعراء بھی تھے، ایک روز شیخ فیروز کی قیامگاہ پر تمام اصحاب سخن مثلاً طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری، طفیلی فتحپوری وغیرہ جمع ہوئے، شیخ فیروز کو مقبولیت اس لیے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، یہ مجلس جاری ہی تھی کہ شیدا بھی آپہنچا، تمام شعراء نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم

۵۱ ص ۲۰۰۔۴۲۱ م ۵۲ ید بیضا قلمی نسخہ ص۹۲،

کیا، اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمایش کی، شیدا نے یہ شعر پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے ٭ حسن را پروردگا عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے،

عشق را پیمبر ولیکن ٭ حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا،

زبسکہ کرد غنت بتدبیر جگر ناخن ٭ چو پشت ماہیم از پاے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثا ہی حلوائی کا چربہ ہے،

از بسکہ سینہ کندم ناخن درونشستہ ٭ چو پشت ماہیست سراپاے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چین بجبین ہوا، مگر ایک اور شعر پڑھکر داد چاہی،

بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود ٭ بدریا روبشوی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولا کہ یہ تو ملا کاتبی کے شعر سے توارد ہے،

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ ٭ خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا کہ اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ،

ذات تو بود صحیفہ کن کہ کرد ٭ از روی ادب مہر خدا برپشت

شیخ فیروز نے فوراً ہی ہاتفی کا شعر پیش کیا،

نبوت را توی آن نامہ در مشت ٭ کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہوکر بد کلامی شروع کر دی لیکن اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے تو اس نے یہ شعر پڑھا،

زلف او را رشتہ جان گفتم و گشتم خجل ٭ زانکہ این معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ جہان کی دلآزاری مراد نہیں لیکن اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے،

کس نیابد مصرعہ پیچیدۂ زلف کجت گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

اسی طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے، تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا، بالآخر شیدا پر مہر سکوت لگ گئی، اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی، اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا، مگر شیخ فیروز کا بیان ہے کہ کشمیر میں ایک روز شیدا اس کے گھر پر آیا، اور پوچھا کہ میرا کوئی شعر بھی قابل ستایش ہے تو فیروز نے کہا ہاں اور وہ شعر ہے

اے بروے تو کز و آئینہ را چشم نیاز شانہ را دست دعا در شب زلف تو دراز

شیدا نے ہاتھ پھیلا کر دعا کی عمرت دراز باد[۱] شیدا کا ذکر شاہجہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا،

فضلا، جہانگیر کی قدردانیوں کے سبب اس کے دربار میں علما بھی بکثرت تھے ہم ان میں سے دو چار کا ذکر کرتے ہیں،

میران صدر جہان پہانی۔ پہلے ذکر آچکا ہے، کہ جہانگیر نے شہزادگی کے زمانہ میں ان سے چہل حدیث پڑھی تھی، مآثر الامرا، جلد سوم (ص ۳۴۸) میں ہے،

"مرد فاضل خوش طبع بود"

اکبر کے زمانہ میں ممالک محروسہ کے صدر تھے، حکیم ہمام کے ساتھ عبداللہ خان اوزبک والی توران کے پاس ایلچی بنا کر بھی بھیجے گئے، وہان علما سے بڑے معرکے ہوئے، ہر فن میں صدرجہان ان پر غالب رہے، جس سے وہان کے ارباب علم کو بڑی حیرت ہوئی، وہاں سے واپس ہوئے تو کچھ دنوں کیلئے صدارت کل کی خدمت تفویض کی گئی، اور منصب دو ہزاری بھی عطا ہوا، جہانگیر کا

[۱] مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین ورق ۲۱۶ - ۲۱۵

بڑا قدردان تھا، شہزادگی کے زمانہ میں اس کو معلوم ہوا کہ صدر جہاں مقروض ہیں، تو اس نے وعدہ کیا کہ تخت و تاج کا مالک ہوا تو وہ ان کا سارا قرض ادا کر دیگا، اور ان کی خواہش کے مطابق منصب پیش کریگا، چنانچہ ایسا ہی کیا، چار ہزاری منصب دے کر قنوج کا علاقہ تنخواہ میں عطا کیا، صدر جہان نے جہانگیر کی نوازشوں سے فائدہ اٹھا کر خلق اللہ کی بڑی خدمت کی، اور ان کی مدد معاش کے سلسلہ میں بڑی فیاضی دکھائی، چنانچہ آصف خان جعفر نے جہانگیر سے عرض کیا کہ عرش آشیانی (یعنی اکبر) نے جو بخشش پچاس سال میں کی تھی، صدر جہاں نے پانچ سال کی صدارت میں کی (مآثر الامراء، جلد سوم ص ۳۵۰، و مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۳)

مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی۔ شیراز، قزوین، عراق اور عرب سے علوم متداولہ حاصل کر کے ہندوستان آئے، نسخ، تعلیق اور علم سیاق میں مہارت تامہ رکھتے تھے، پہلے عبدالرحیم خانخانان کی فیاضیوں سے متمتع ہوئے، پھر جہانگیر کی ملازمت میں آئے، جہانگیر نے انھیں شہزادہ خرم کی ماتحتی میں عہدۂ دیوانی پر مامور کیا، اپنے فرائض منصبی میں بہت کامیاب رہے، پھر اودے پور کی مہم میں کچھ مفید خدمات انجام دینے پر جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ میں انھیں افضل خاں کے خطاب سے مشرف کیا، اور اجمیر کا ناظم بنا کر بھیجا۔[۱]

مولانا تقیای شوستری۔ شیراز سے تعلیم کی تکمیل کر کے ہندوستان آئے، ان کے بارے میں مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے،

"مولانا تقیای شوستری طالب علمے بے مثال و قرین دانشی و شاعرے سخن آفرین است در اقسام منظومات تقیای تخلص می فرماید"

جہانگیر نے انھیں صدارت کے منصب سے سرفراز کیا،[۲]

---

[۱] مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۱۳۰۰، [۲] ایضاً ص ۶۶۳۔

مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی۔ حدیث اور فقہ کے متبحر عالم تھے، قزوین اور اصفہان میں کچھ دنوں رہنے کے بعد ہندوستان آئے، تو پہلے بیجاپور میں دربار عادل شاہی سے وابستہ رہے، ۱۰۲۴ھ میں برہانپور خاندیس میں شہزادہ پرویز سے ملے، جس نے ان کی بڑی پذیرائی کی، عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اپنے دربار میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور نقد جواہرات کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ان کی خدمت میں پیش کیں، اور اسی کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں ملازم ہوئے، جہانگیر ان کا سرپرست اور قدردان رہا[1]

جہانگیر کے عہد کے دوسرے علماء کے نام جو مصنف اقبال نامۂ جہانگیری نے بتائے ہیں، یہ ہیں

ملا روزبہان شیرازی، امی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹھی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نوراللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبدالمطلب سلطانپوری، ملا عبدالرحمن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، اور ملا محمد جونپوری،[2]

جہانگیر ہر مذہب و ملت کے علماء سے بہت بے تکلفی کے ساتھ ملتا تھا، اور ان کے متعلق جو رائے ظاہر کرتا تھا، وہ بڑی محققانہ ہوتی تھی، شیخ عبدالحق دہلوی سے ملا، تو لکھتا ہے:

"مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بروضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی ست صحبتش بے ذوق نیست، بانواع مراحم و لنوازی کردہ رخصت فرمودم"

ان کی تصنیف تذکرۂ اولیائے ہند کے بارے میں رائے ظاہر کرتا ہے:۔

کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر درآمدہ خیلے زحمت کشیدہ[3]

میر عضدالدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی، تو اس کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے:

۱؎ مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۵۳۹، ۲؎ اقبالنامۂ جہانگیری ص ۳۰۸، ۳؎ تزک جہانگیری ص ۲۸۴،

"الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علما ء قدما استشہاد آوردہ

درین فن کتاب بے مثل ایں نمی باشد"[1]

مولانا شبلی جہانگیر کی اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں کہ "فارسی کا ایک محقق اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھ کر کیا رائے دے سکتا ہے، فارسی لغت میں جس قدر کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں، کسی میں قدما کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا، اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہے"[2]

وہ ہندو پنڈتوں اور درویشوں سے اسی فراخدلی اور عقیدتمندی سے ملتا جس طرح علمائے اسلام سے پیش آتا تھا، ۱۲ سنہ جلوس میں جب اوجین گیا، تو اسے معلوم ہوا کہ سنیاسی مرتاض جدروپ نامی دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک دشوار گذار کھبٹ میں رہتا ہے، جس کا طول ساڑھے پانچ گرہ اور عرض ساڑھے تین گرہ تھا، یہ اس قدر تنگ تھا کہ اس میں مشکل سے ایک شیر خوار بچہ سما سکتا تھا، جہانگیر کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، وہاں تک سواری پہنچ نہ سکتی تھی، مگر وہ تین میل پاپیادہ چل کر وہاں پہنچا، اور چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا، اس ملاقات کی نسبت لکھتا ہے:

"الحق کہ وجود ش بغایت مغتنم است، در مجلس او محظوظ و مستفید می توان شد علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب گفت ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد"

اس ملاقات سے وہ سیر نہیں ہوا، پھر گیا، چنانچہ لکھتا ہے:

"بازخاطر را بملاقات گسائیں جدروپ رغبت افزود، بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت

---

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۷۔ [2] مقالات شبلی ج ۴ ص ۱۱۳

داشتہ شد، سخنان بلند و میان آمد حق جل و علی غریب توفیقے کرامت فرمودہ فہم عالی فطرت بلند و مدرکہ تند را با دانش خداداد جمع و دل آزاد و ساختہ پشت پا بر عالم و مافیہا زدہ در گوشۂ تجرید مستغنی و بے نیاز نشستہ۔"

اوجین سے رخصت ہوتے وقت اس کے پاس پھر ملاقات کو گیا، اور دائمی ملاقات اس پر شاق گذری، لکھتا ہے:

"باز بملاقات گسائیں رفتہ ازو وداع شدم، بے تکلف جدائی از صحبت او بر خاطر حقیقت گزیں گرانی نمود۔"[1]

آخر عمر میں جہانگیر کو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیمیا اثر سے غیر معمولی روحانی اور مذہبی فیوض و برکات حاصل ہوئے، پہلے تو بعض درباری امرا کی فتنہ سامانیوں اور شر انگیزیوں سے حضرت مجدد اعظم سے برگشتہ رہا تھی کہ مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا مگر عاشق شریعت رسول کی قید و بند کے زمانہ میں ایک روز جہانگیر نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرما رہے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے" جہانگیر نے منفعل ہو کر حضرت شیخ احمد قدس سرہ کی رہائی کا حکم صادر کیا، اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور لطف و کرم سے پیش آیا، ان کی ذات اقدس سے جہانگیر کی شیفتگی اور عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی خدمت بابرکت میں دیکھنا چاہتا تھا، خزینۃ الاصفیا میں ہے:

"بادشاہ (جہانگیر) از محبان شیخ شد، بحدیکہ گاہی آنجناب را از خود جدا نمی کرد، و شاہزادہ خرم را داخل حلقہ مریدان شیخ نمود، چنانچہ تا عہد شاہجہان و عالمگیر بادشاہان باہمہ علما و وزرا، داخل سلسلہ مجددیہ می شدند" (حصہ اول ص ۶۱۳)

[1] تزک جہانگیری ص ۲۴۳

روزانہ مغرب کے بعد جہانگیر حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ سے ملاقات کرتا۔ ان ملاقاتون
مین حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سرچشمۂ علم وفضل سے اس کے قلب کی جس طرح تطہیر ہوئی وہ
خود ان کے مکتوب میں سننے کے قابل ہے، وہ اپنے صاحبزادون خواجہ محمد سعید اور خواجہ معصوم
کو تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اس طرف کے احوال اور اوضاع حمد کے لائق ہیں، (بادشاہ کے ساتھ) عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سرموسستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلون مین بھی وہی باتین ہوتی ہین جو خاص خلوتون اور مجلسون مین بیان ہوا کرتی ہین، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاصکر آج ماہ رمضان کی سترہوین رات کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب وثواب اور رویت ودیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتداء اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جن اور جنیون کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا اور (بادشاہ) بڑی خوشی سے سنتے رہے اس اثنا مین اور بھی بہت سی چیزون کا ذکر ہوا، اور اقطاب، اوتاد ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتون وغیرہ کا ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ (بادشاہ) سب کچھ قبول کرتے رہے، اور کوئی ایسا تغیر ظاہر نہ ہوا جو بے دلالت کرے ان واقعات اور ملاقات مین شاید اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمت اور راز خفیہ ہوگا۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت

وَسَلَّ رَبُّنَا الحق، دوسرے یہ کہ قرآن مجید کو (بادشاہ سے) سورہ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہوں،

جب رات کو اس مجلس (یعنی شاہی مجلس) سے اٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہوتا

ہوں، حفظ قرآن مجید کی یہ اعلیٰ دولت اس پراگندہ حالی میں جو میں جمعیت سے حاصل ہوئی

ہے الحمدللہ اولاً و آخراً، (مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، نمبر ۴۳)

جہانگیر کے اس تزکیۂ باطن کے بعد حضرت مجدد و اعظمؒ نے اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کے لیے

جو چاہا اس سے کرایا،

مشہور ہے کہ جہانگیر اکثر کہتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخ

کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے،

جہانگیر اور کتب خانہ و مدارس جہانگیر ایک شاندار کتب خانہ کا مالک تھا، مکتوب خان اس کا مہتمم تھا،

جب وہ سفر میں ہوتا تو بھی ایک کتب خانہ ساتھ لیے رہتا تھا چنانچہ تزک میں ہے کہ جب وہ گجرات پہنچا

تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانہ سے تفسیر حسینی، تفسیر کاشفی، اور روضۃ الاحباب نذر کیں،

اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام رکھا تھا، کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مر جاتا،

تو اس کے مال و متاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوا تا تھا،[۱] تاریخ خان جہان میں ہے کہ اس

نے ان تمام مدارس کو از سر نو آباد کیا، جو گذشتہ تیس سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے

مسکن بنے ہوئے تھے،[۲]

---

[۱] منتخب اللباب خافی خان [۲] تاریخ خان جہان بحوالہ پرومونشن آف محمڈن لرننگ ص ۱۲۵،

شاہجہان

شاہجہان کی نادرۂ کار تعمیری یادگاریں اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بیّن دلیل ہیں، اس کی تمام تکوینی قوتیں فنونِ لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئیں، اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیاں اس کی تزک بابری میں، ہمایوں کی تخئیل آرائیاں اس کے شعر و شاعری میں، اکبر کی علمی فیاضیاں اس کے دربار کی ہنر پرور فضا میں اور جہانگیر کی رنگینیاں اس کی تزک جہانگیری میں پاتے ہیں، تو شاہجہان کے ذہن کی پرکاریاں اس کے تختِ طاؤس، قلعۂ معلّٰی اور روضۂ تاج کے نقش و نگار سے عیاں ہیں، اس لیے یہ امر موجبِ تعجب نہیں کہ اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکوں دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی، اس کے دماغ کی گل افشانی کاغذ کے صفحات کے بجائے دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کی دیواروں پر ہوئی، اس کا حسنِ ذوق علم و ادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت و نفاست میں ظاہر ہوا، اس نے محبت کا ترانہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج میں منظوم کیا،

اس کو بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا، اس لیے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کی کتابِ زندگی کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں، اس کے دربار کی علمی فضا اور اہلِ علم و سخن کے ساتھ اس کی عدیم المثال فیاضیاں اور سرپرستیاں، پھر دارا شکوہ، جہان آرا، مراد، اور اورنگ زیب کی اعلیٰ تعلیم و تربیت اس کے ذوقِ سلیم کی شہادت ہے۔

وہ جب چار برس، چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے

کے لیے بٹھایا گیا، قاسم بیگ تبریزی، حکیم دوائی گیلانی، شیخ ابو الخیر (برادر علامی ابو الفضل) اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے، ان باکمال استادوں کی زیر نگرانی شہزادہ خرم نے علوم و فنون کی تکمیل کی، خطاطی میں اس کو بڑی مہارت تھی، محمد صالح کنبوہ لاہوری شاہجہان کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

"بسے برنیامد کہ بتفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ درجمیع فنون فضائل و دقائق نکتہ فہمی را باعلیٰ درجات کمال رسانید، و درعرض اندک مدتے بے آنکہ کار ربطول کشد، ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختۂ مشق از ریختۂ قلم مشکین رقمش چون صفحۂ رخسار نوخطان بحسن خط زینت گرفت[۱]"

ان استادوں میں دوائی گیلانی کی سعی و محنت زیادہ بار آور تھی، چنانچہ شاہجہان کہا کرتا تھا:-

"فی الحقیقت حکیم دوائی آموزگار ماست، وحق تعلیم او بر ما از استادان دیگر بیش است[۲]"

تاتار خان جس کو ترکی لغت کی واقفیت میں اعلیٰ کمال حاصل تھا، شہزادہ کی ترکی زبان کی تعلیم کے لیے مامور تھا[۳]، یوں تو اس نے شروع ہی سے اکبر کی سب سے پہلی بیوی غدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کی نگرانی میں پرورش پائی[۴]، جو خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی، مگر شاہجہان کو ترکی بولنے کی کبھی مشق نہیں ہوئی، جہانگیر کہا کرتا تھا "کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خرم میں کیا عیب ہے تو میں کہونگا کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا ہے[۵]" وہ ہندوستانی زبان سے بھی واقف تھا، شاہجہان نے کوئی تصنیف اور نہ رقعات کا مجموعہ چھوڑا، اس لیے اس کی علمی لیاقت کا اندازہ کرنا

---

[۱] عمل صالح موسوم بہ شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ جلد اول ص ۳۱ [۲] ایضاً ص ۳۲ [۳] ایضاً ص ۳۳،

[۴] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد ۱ ص ۶ [۵] تزک جہانگیری،

مشکل ہے، لیکن شاہجہان نامہ میں اس کا ایک رقعہ منقول ہے، جو اس نے تخت نشینی کے بعد دست[1] خاص سے لکھکر آصف خان یمین الدولہ کے پاس بھیجا، رقعہ حسب ذیل ہے:۔

"دانائے رموز سلطنت عظمیٰ، واقف اسرار خلافت کبریٰ، سرخیل یکرنگان وفادار، سلالۂ یکجہتان حق گذار، کارفرمای سیف وقلم، مدبر امور عالم، زبدۂ خوانین عالیشان، قدوۂ امرای بلند مکان، عضد الخلافت یمین الدولہ، عموی دانا آصف خان، در امان حضرت ملک منان بوده بدانند، کہ در چہارم گھڑی روز مبارک دوشنبہ بست وہفتم ماہ بہمن موافق ہشتم جمادی الثانی سنہ ہزار وسی وہفت ہجری بمبارکی وفیروزی در دار الخلافت اکبرآباد جلوس میمنت مانوس بر تخت سلطنت وسریر خلافت واقع شد، وبدستوری کہ معروض داشتہ بودند، لقب را شہاب الدین قرار دادیم، چنانچہ نام مبارک ما را بعنوان اقبال نشان صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی درخطبہ کہ درین روز بلند آوازه گردانیدند، درج نمودند، سکہ ہم بہمین نام مبارک زده شد"

للہ الحمد کہ آن نقش کہ خاطر میخواست

آمد آخر زپس پردۂ تقدیر برون

امیدواریم کہ اللہ تعالیٰ این بادشاہی کل ہندوستان بہشت نشان را کہ بمحض کرم خود با عنایت فرموده بر باد شما کہ شریک غالب دین ودولت اید، مبارک گرداند، وروز بروز فتوحات تازه ونصرت ہای بے اندازه نصیب ما شود وشا ہم بعمر طبعی رسیده از دولت ما ودو عظیم یابید، خدمت پرستیخان آخر روز جمعہ رسید وعرضہ داشت شما را گذرانید، وبعرض

[1] شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبو ص۲۶۲، وبادشاہ نامہ جلد اول از عبدالحمید لاہوری ص۱۱۵، شاہجہان کے بعض اور رقعات بھی نظر سے گذرے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بلند نہیں ہیں۔

[1] بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ج۱ ص۱۱۱

رسانیدند کہ مشعر بر نمودہ آمد، کہ روز پنجشنبہ بیست و یکم ماہ بہمن از آنجا روانہ شوید و روز جمعہ چہار دہم ماہ اسفندار بملازمت مشرف گردید، این معنی چون دلالت بر آن می نمود کہ زمان دریافت ملازمت نزدیک رسید خوشحال شدیم، قرار داد این معنی کہ پادشاہزادہ ہا کامگار بر خوردار را ہمراہ بیاورید، و خواجہ ابوالحسن را در لاہور بگذارید، مستحسن افتاد، سرو پا کہ در روز مبارک جلوس میمنت مانوس پوشیدہ بودیم برائے آن عضد الخلافہ فرستادیم، ہر چند کہ ہر چہ بآن عمو عنایت فرمائیم زیادہ از ان گنجایش دارد، اما بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت نمودیم، و سوائے آن بندر لاہری را بطریق انعام مرحمت فرمودیم، این عنایت ہائے بر شما مبارک باشد"

اس عبارت میں نہ جہانگیر کی تزک کی رنگینی اور روانی ہے، اور نہ عالمگیر کے رقعات کی سلاست و برجستگی، لیکن پھر بھی اس کا کاتب کوئی معمولی استعداد کا آدمی نہیں معلوم ہوتا،

ایک اور فرمان سے اس کی علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہجہانی سفرا عراق گئے، تو وہاں ان کے ایک وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں قدم علم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ شاہجہانی سفرا ہندوستان اور سلطنت تیموریہ کے علمی . . . . . وقار کو قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے شاہجہان کو اطلاع کی، شاہجہان نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کریں تاکہ عراق بھیجا جائے، چنانچہ سعد اللہ خان نے ایک فرمان صادر کیا، جس میں لکھا کہ

"مکرمتر ...... مرجع ...... فضائل و کمالات ...... سلطنت ...... دین ......"

آورد کہ آن افادت وافاضت مرتبت را درین مسائل مختصر جامع مفیدے کہ مستجمع کلمات
حکایات حکما وتاویلات علما ووجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ، ومباحثات ومناظرات
وشکوک وشبہات وازالات واخراجات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت
تحقیقات واصل کلام درہر باب واساس سخن درہر جواب وآن چہ دران ظفر یافتہ باشد
وبرہان بران قائم شدہ باشد ، واحاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حصولی وحضوری
بود وعلم وعین عالم وعین معلوم است یا غیر ، وتعلق آن بجزئیات بوجہ کلی است یا بوجہ
جزئی ، وتحریر آنکہ کلیہ وجزئیہ معلوم تابع مدرک ویا تابع مدرک است ونسبۃ الواجب جزئی
ست یا نہ ، وبیان آنکہ ادراک تعلقی است، نہ احساسی .... الخ"

ایک صاحب نظر کا خیال ہے کہ یہ جملے شاہجہان کے بنائے ہوئے تھے، چنانچہ عبارت ہذا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاہجہان کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے، کہ اس نے اس مسئلہ مین جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملون مین ادا کر دیا" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں کہ "سعد اللہ خان کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے لیکن شاہجہان کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم وفن سے واقف نہ ہو وہ کیا اس کو سمجھ سکتا ہے"[1]

شاہجہان کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتون سے بھی معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے درباریون سے کہا کرتا تھا، عمل صالح جلد اول (ص ۱۵-۵۱۴) مین ہے:

ماہ آذر کی چوتھی تاریخ کو بادشاہ کی محفل مین ہر ملک کے علماء جمع تھے، اور ہر ایک اپنے اپنے مبلغ علم کے مطابق ہر فن کے تمام مسائل کے متعلق گفتگو کرتے تھے، بادشاہ جو نہایت حکیم اور محقق تھا، ہر مسئلہ مین دخل دیتا تھا، اور ہر قسم کی گفتگو کرتا تھا، یہان تک کہ سلسلۂ سخن ان بادشاہزادون تک پہنچا جو بادشاہ بھی تھے اور حکیم بھی تھے، یعنی

[1] معارف نمبر ۲ جلد ۱۰

اثنا ہین یمین الدولہ سکندر کی تعریف اس حد تک کی کہ اتنی طویل مدت مین عقلمندون کے کسی فرد نے اس بادشاہ کے کسی قول وفعل سے گرفت نہیں کی، بادشاہ نے فرمایاکہ چونکہ سکندر فیلقوس رومی کی نبوت ثبوت کے درجہ تک نہین پہونچی ہے، اور محققین ائمہ تاریخ کے قول کے مطابق اسکندر ذوالقرنین دوسرا شخص ہے، اس لیے مجھکو ادب کے ساتھ اس کے قول وفعل پر دو اعتراضات ہیں پہلا یہ کہ داراکے قاصد کے جواب مین جب اس نے سونے کے وہ انڈے مانگے تھے جن کو اس کا باپ فیلقوس ہر سال بطور خراج دیتا تھا تو اس نے کہا کہ

شد آن مرغ کو خایۂ زرین نہاد

اس قسم کی بات اپنے باپ کے متعلق کہنا نہایت بے ادبی ہے، کیونکہ مرغیان نہایت حقیر جانور ہین اور اسی کے ساتھ انڈا دینا ان کی نسوانیت کو مستلزم ہے، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس قاصد کے لباس مین نوشابہ کی مجلس مین جانا دور اندیشی اور احتیاط کے خلاف تھا، اور یہ طریقہ عقلمندون کے طریقہ سے الگ ہے، کیونکہ عقلمند ایسا کام نہین کرتے جس سے ان کو پسپائی ہو، حاضرین مجلس نے ان باتون سے اتفاق کیا،

ایک دوسری مجلس کا تذکرہ بھی ملاحظہ ہو:-

مہینے کی انیسوین تاریخ کو جبکہ تمام حکماء وشعراء دربار مین حاضر تھے، ہر قسم کی گفتگو ئین شروع ہوئین، اور اسی سلسلے مین ایک تقریب سے صوبجات کے ایک دیوانی کے عہدہ دار کا ذکر آیا کہ وہ کاروبار اور تمام معاملات مین نہایت سخت گیری سے کام لیتا ہے، اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ کارگذاری کا یہ مناسب طریقہ نہین، کیونکہ کام مین سخت گیری اور اس کے دائرہ مین تنگی کرنے کا انجام یہ ہوگا کہ کامون کے کرنے مین سستی اور کاہلی ظاہر

ہو گی اور ملک میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا، جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں ہوا، کہ وہ اگرچہ خلیفہ برحق اور امام مطلق تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے قول کے موافق حق و صداقت کے ساتھ کام کرتے تھے تاہم کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا، کیونکہ وہ دین اور دنیا کے کسی کام میں سہل انگاری اور رو رعایت سے کام نہیں لیتے تھے، اس لیے دنیا کے لوگ جو دین و آخرت کے بالکل مخالف بلکہ سراپا باطل ہیں، اٹھ کھڑے ہوئے، اور فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا (عمل صالح جلد دوم ص۲۳۲)،

اسی اثنا میں سید جلال بخاری نے شاہجہان کے ایک ارشاد عالی کا حوالہ دیا کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے، ایک حق دوسرا باطل لیکن سید جلال بخاری نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حق پر قائم ہو، شاہجہان نے کہا کہ حق و باطل ہر زمانہ میں رہا، اور اس سلسلہ میں یہ تقریر کی :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام کاموں کی بنیاد حق پر تھی، اور تمام ترقیاں اس لیے ہوتی تھیں کہ آپؐ کے وجود کی برکت سے اس زمانہ کے لوگ حق و صداقت پر تھے، اور سب کے دل فطری پاکیزگی اور صفائی کے علاوہ آپ کے مواعظ و نصائح سے پاک و صاف ہو گئے تھے، اس لیے حق و صداقت کے سوا کسی چیز کا نقش ان پر قائم نہیں ہو سکتا تھا، اور باطل کے لیے ان میں کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے تمام امور واقعہ کے مطابق حق و صداقت کے ساتھ انجام پاتے تھے، یہی حال خلفائے راشدین کے زمانے کا تھا، کہ جس طرح سورج کے ڈوبنے کے بعد بھی کچھ دیر تک روشنی قائم رہتی ہے، اسی طرح آفتاب نبوت کے ڈوبنے کے بعد بھی خلفائے راشدین کے زمانے کے لوگوں کے دلوں پر بھی غفلت کا زنگ لگنے نہ پایا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے حالات بدل گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بالکل بعد ہو گیا اور لوگوں کے دل زنگ خوردہ ہو گئے، نوبت یہاں تک

پہونچی کہ سبہ کار ظالموں نے حضرت عثمانؓ ذی النورین کی شمع زندگی کو بجھا دیا، اور اس حالت میں دنیا حق و صداقت پر قائم نہ رہ سکی، اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اقامت حق میں جو ان کا مقصود تھا کامیابی نہ ہو سکی" (عمل صالح جلد دوم ص۳۴۲)

شاہجہان شاعر تو نہ تھا، مگر شعر و شاعری سے اس کو غیر معمولی مناسبت تھی، جیسا کہ آیندہ صفحات سے اندازہ ہوگا، جب ہم شعراء کے ساتھ اس کی قدردانی کی تفصیل بیان کریں گے، مگر ایک بار اس نے شہزادہ اورنگ زیب کو ایک رباعی لکھکر اپنی پدرانہ محبت کا جو ثبوت دیا تھا، اس کا یہاں پر ذکر کرنا شاید بے جا نہ ہوگا، اورنگ زیب کی شادی کی تقریب انجام پانے والی تھی، اورنگ زیب دولت آباد سے چل کر دہلی آیا تو نور منزل میں مقیم ہوا، شاہجہان اس مسرت و انبساط کے جشن کے موقع پر غایت اشتیاق میں بیٹے سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا، اس لیے کلیم کی یہ رباعی اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجی:

باعث دہ اگر زود درآئی چہ شود　　　　با تاختہ پیش از خبر آئی چہ شود
زود آمدنت نظر بشو قم دیر است　　　　از زود اگر زود تر آئی چہ شود[1]

شاہجہان اپنے گوناگون مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا جب تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا، تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے تھے، جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء، و سلاطین کی سوانحعمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفرنامہ اور واقعات بابری کو بہت پسند کرتا تھا[2]

اس کا گھر خود علم و ادب کا گہوارہ تھا[3]، اس کے دربار میں علمی شان و شوکت، دیرینہ روایات کے ساتھ قائم رہی، وہ اہل علم و فضل کو کن نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہ ذیل کے پند و نصائح

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۳۴۲ [2] بادشاہ نامہ اول ص ۱۵۰ [3] شاہجہان کی اولاد کی علم نوازی کا حال ہم تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق کے سلسلے میں لکھیں گے،

سے معلوم ہوگا، جو اس نے اپنی بیاض خاص میں لکھ رکھی تھیں،

"رو ندادن بمردم بد، نرنجیدن بعدم حصول مقصد، نرنجانیدن مردم خوب مزاج، در خواستن بکمال احتیاج، صحبت داشتن باہل معاد، جستجو کردن قابلان با استعداد، بار ندادن پیش خود بمردم جہان، دادن بار پایہ استحقاق بقدر توفیق پیش از سوال، بکرم داشتن اہل فضل مصروف نمودن مزاج بعدل، میل نکردن باقوال غیر عقائد، بے خبر نبودن از احوال متوکلان بے مکائد، غنیمت داشتن در چو دیگانگان کہ بیگانہ از خلق باشند، پیش داشتن جمعیکہ مصالح امور دنیا وعقبیٰ بودند"

یہ نکات علمی اور عملی حیثیت سے کس قدر سبق آموز ہیں، عالمگیر نے ان کو شاہجہان کی بیاض سے نقل کرکے اپنے فرزند عالیجاہ شاہزادہ معظم کو بطور نصیحت لکھ بھیجا تھا،[۱]

شعراء | اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی سرپرستی میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں، ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہا تھا، ایران سے شعراء ہندوستان اُلٹے چلے آرہے تھے، اور بقول مولانا شبلیؒ ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، چنانچہ شاہجہان کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی، وہ اپنی فیاضی و قدردانی میں اکبر اور جہانگیر دونوں سے بازی لے گیا، اس نے شعراء و فضلاء کے ساتھ جو داد و دہش اور انعام و اکرام کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر مثال شاید ہی کسی حکمران خاندان میں پائی جائے گی۔

لطف اللہ مہندس[۲] نے جو دارا شکوہ کے مقربان خاص میں تھا، شاہجہانی شعراء کے نام مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کئے ہیں:-

---

[۱] وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی۔ [۲] لطف اللہ مہندس کے حالات کے لیے دیکھو مضمون "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی، معارف فروری و مارچ، اپریل ۱۹۳۳ء

وحید دہر امانی بن مہابت خان ولے سحبان زبان است شہرۂ دوران

دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن ربودہ گوئے سخن از سخنوران دکن

دگر وحید زمن آشنا عنایت خان بود بہ بحر سخن آشنا عنایت خان

دگر وحید زمن شادمان غم پرور بیان شادی و غم در کلام او مضمر

دگر سخنور کشمیر محسن فانی است بقاے نام وے از دولت سخندانیست

سپہر سیادت یگانہ میر عماد کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است سخنورے کہ سخنہاش جملہ مرغوب است

دگر وحید زمان ہست طالبائے کلیم کہ شعر او ید بیضاست نزد طبع سلیم

دگر فرید جہان قدسی محمد خان بعہد شاہجہان گو ربودہ از اقران

الٰہی ہمدانی است در سخن استاد سخنورے است کہ داد سخنوری می داد

لبیب از منہ امی نخواندہ ہیچ کتاب ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب

دگر وحید زمن باقیا ترانہ او خوش است ہمچو غزلہاے عاشقانہ او

فصیح از منہ تنہا کہ چو غزل می گفت چو عندلیب غزلخوان در و گہر می سفت

اس چمنستان شعراء کا گل سرسبد حاجی محمد جان قدسی تھا، جس کو تمام انواع سخن پر قدرت[1] حاصل تھی، مشہد کا رہنے والا تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تعلیم پاکر ہندوستان آیا، خواجہ عبداللہ خان زخمی کی مدح میں، جو ہفت ہزاری منصب کا شاہجہانی امیر تھا، ایک قصیدہ کہا، عبداللہ سفر میں تھا، قدسی نے قصیدہ پڑھا، تو عبداللہ خان اس قدر متاثر و محظوظ ہوا کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا، اور قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا، پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ اس کے تمام متعلقات اور لشکر کی تمام چیزیں

[1] دیکھو مضمون ہذا در فہرست کتب خانہ شاہ اودھ از ڈاکٹر اسپرنگر ص ۱۱۱

قدسی کو انعام میں دیدیں۔ ۱۰۴۲ھ[1] میں قدسی شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک قصیدہ کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ای قلم بر جوہ بیال از شادی بکشا زبان — در ثنای قبلۂ اقبال خاقان زمان

جوہر اول شہاب الدین محمد کز ازل — از برای خدمتش زد چرخ دامن بر میان

اختر برج کرامت مظہر لطف الٰہ — جوہر تیغ شجاعت مصدر امن و امان

آنکہ از آغاز فطرت بستہ شہباز ظفر — چون عقاب تیر بر شاخ کمانش آشیان

گر مخالف ور موافق از ولایش دم زنند — با بد و نیک است چون خورشید گرم و مہربان

سرمۂ چشم غزالان سازد از داغ پلنگ — سازگاریہای عدلش چون نہد پا در میان

شہرت آثار عدلش زود می خواہد گرفت — تہمت زنجیر عدل از گردن نوشیروان

خوش نشست از نقش پایش نقش ہفت اقلیم را — ربع مسکون گو دگر بنشین بعیش جاودان

آفتابی اینچنین طالع نشد در ہیچ قرن — از زمان حضرت صاحبقران تا این زمان

چند از دولت کہ بیند با تو خود را در رکاب — مرحبا نصرت کہ باشد با تو دایم ہمعنان[1]

مراۃ الخیال کے مؤلف کی روایت ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں شاہجہان نے قدسی کے منہ کو سات دفعہ جواہرات سے بھرا، اصل عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"چند روز کے بعد (یعنی عبداللہ خان سے انعام پانے کے چند دن کے بعد) محمد جان نے صاحبقران ثانی کی مدح میں اور بھی زیادہ رنگین قصیدہ کہکر سنایا، بادشاہ عبداللہ خان کی بخشش کا حال سن چکا تھا، اس نے کہا کہ حاجی! عبداللہ خان نے تم کو جو انعام دیا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے لیکن اس نے جواہرات کی تحفہ نفیس طلب کیں،

---

[1] مراۃ الخیال صفحہ ۱۲۳ [2] [illegible] صفحہ ۹ – ۳۰۸

اور حکم دیا کہ اس کا (یعنی قدسی کا) منہ سات بار ان موتیوں سے پر کیا جائے، سامنے سونے کا طشت رکھا ہوا تھا، قدسی کا منہ بھر جاتا تو اس طشت میں موتیوں کو گرا دیتا تھا (ص۱۶۹)

اس قصیدہ کے بعد شاہجہان نے قدسی کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا، جہان سے اس کو روزانہ وظیفہ ملتا تھا، اور جب اس نے دربار میں اپنی شاعری و نکتہ سنجی کا سکہ بٹھا دیا، تو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، ۱۰۵۵ھ میں اس نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس کو شاہجہان نے بہت پسند کیا، انعام میں اس کو روپے میں تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار پانچ سو تھے[1] ۱۰۴۹ھ میں قدسی کو کچھ اشعار کے صلہ میں سو اشرفیاں مرحمت ہوئیں، جہان آرا بیگم کی صحت یابی کے موقع پر قدسی نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے دو ہزار روپے عطا کئے[2] جہان آرا بیگم کے جلنے کے موقع پر قدسی نے ایک رباعی لکھکر گذرانی، اس کی آخری بیت یہ ہے (کلمات الشعراء)

نا سر زدہ از شمع چنین بے ادبی   پروانہ ز عشق شمع واسوختہ است

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا، طالب کلیم نے ایک مرثیہ لکھا جس کے ایک ترکیب بند سے تاریخ نکلتی ہے، ع دو دراز ان بلبل قدسی جہیم زندان شد،

قدسی نے ایک مثنوی "تعریف کشمیر و صعوبت راہ" بھی لکھی، (کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

قدسی کا مد مقابل ابو طالب کلیم تھا، کلیم کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، لیکن ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا، پھر ہندوستان آیا، جہانگیر

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۲۴۲ [2] عمل صالح حصہ دوم ص ۱۸ ام، سرو آزاد (ص ۶۲) میں ہے کہ قدسی بادشاہ نامہ ابتدائی بہ نظم آوردہ" تذکرہ سرخوش میں ہے کہ "ظفر نامہ شاہجہان باحسن وجوہ و طرز دلخواہ بہ فصاحت و بلاغت تمام ادا کردہ"

کے دربار میں ملک الشعراء طالب آملی کے مقابلہ میں اگرچہ کہ فروغ حاصل نہ ہوسکا، لیکن شاہجہان کے عہد میں کلیم کا کلام شعلۂ طور بن کر چمکا، اس کے اشعار کے حسن تقابل، خیال بندی، ترکیبوں کے سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی سے اس عہد کی شاعری جگمگا اٹھی، اسی لیے شاہجہان کے دربار سے اس کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، سنہ ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہان نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا، اور آگرہ میں جشن نوروز کے موقع پر اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو دربار کے شعراء نے[1] اس تقریب میں قصائد کہہ کر اپنی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا، کلیم نے بھی ایک قصیدہ کہا جس کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں،

خجستہ مقدمہ نوروز و غرہ شوال | فشاندہ اند گل عیش بر سر مہ و سال
بچشم مردم دار الخلافہ عید نوبت | غبار موکب شاہجہان جہان جلال
شرف پذیرد نوروز چنین عیدی | کہ بادشاہ نشیند بہ تخت استقلال
بوصف تخت مرصع گہرفشان گشتم | خدا نصیب کند عمر خضر و طول مقال
ہزار سیلان یاقوت صد بدخشان لعل | بہ رونمائی گرفت است تا نمود جمال
توان ز آتش یاقوت آن چراغ افروخت | کہ نے ز باد رسد آفتش نہ ز آب زلال
فتادہ پرتو یاقوت و لعل بر الماس | چنانچہ عکس چراغان فتد در آب زلال
زمردینش تازہ تر ز سبزۂ نو | کہ اجتماع نقیضین را شمردہ محال
طلائے تخت شدی آب ز آتش یاقوت | اگر نہ قطرہ فشانی می شدی زلال لال
بماند از دو دیگر ہر انچہ خواہی ہست | ز شان و شوکت فردوسی و حسن جمال

شاہجہان کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا کہ کلیم کو اس کے صلہ میں روپے کے برابر تلوایا جو ۵۵۰۰ وزن میں آئے، اور اس کو عطا کیے، سنہ ۱۰۵۵ھ میں جشن وزن شمسی کے موقع پر شاہی خزانہ سے کلیم کو کچھ

[1] بادشاہ نامہ حصہ ۲ ص ۸۲ و عمل صالح ج ۲ ص ۱۰۰

اشعار کے صلہ میں ایک ہزار روپے ملے، ۱۰۴۹ھ میں کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا، اس جگہ کی دلآویزیوں اور رنگینیوں کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا، بادشاہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی، جو منظور ہوئی، یہیں بیٹھکر شاہی فتوحات منظوم کرتا تھا، جس کے لیے کلیم کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں شاہجہان پھر کشمیر گیا، تو کلیم نے تہنیت کا قصیدہ لکھکر پیش کیا، جس کے انعام میں خلعت اور دو سو اشرفیاں پائیں، شاہجہان جب واپس ہونے لگا، تو کلیم نے پھر ایک قصیدہ کہا، اور دو سو اشرفیاں پھر انعام میں ملیں[۱]، کلمات الشعراء مؤلفہ سرخوش میں ہے کہ قیصر روم نے شاہجہان کو خط لکھکر یہ اعتراض کیا کہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہوکر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا صحیح نہیں، اس اعتراض پر شاہجہان بھی کچھ پریشان ہوا، اور یمین الدولہ سے اپنے لقب کو بدلنے کے لیے مشورہ کرنے والا تھا، کہ کلیم نے ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا، جس میں لقب کی یہ توجیہ کی،

ہند و جہان ز روی عدد ہر دو چون یکیست ۔۔۔ شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن است[۲]

شاہجہان نے خوش ہوکر روپے میں اس کو تلوا دیا،

کلیم نے بہت سے قصائد کہے[۳]، ان قصائد میں طبیعت کا اصلی زور تشبیب خصوصاً بہاریہ تمہید

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص۴۶۲، نیز شعر العجم حصہ سوم ماثر الکرام دفتر ثانی ص۸۰ [۲] یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے

ہند و جہان ز روے عدد چون برابر است ۔۔۔ بر شہ خطاب شاہجہان زان مقرر است

[۳] مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص۱۷۳) میں اس کے ایک قصیدہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں، جو شاید شاہجہان ہی کی شان میں کہا گیا تھا، اس کی جدت آفرینیاں ملاحظہ ہوں

بعہد شی کہ جہان در خواب امن است ۔۔۔ کہ بادپا سپاسے پاسبان را

بلکش راہ زن باشند جادہ ۔۔۔ بمنزل میرسانند کاروان را

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۳)

میں صرف کرتا تھا، مگر بقول مولانا شبلی کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے[۵]، اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک منظر ہے، جب اس کا انتقال ہوا تو غنی کشمیری نے تاریخ وفات یہ کہی

گفت تاریخ وفات او غنی — طور معنی بود روشن از کلیم
(۱۰۶۱ھ)

کلیم نے بہت سی مثنویاں بھی لکھیں، تعریف اکبرآباد، قحط دکن، صعوبت دکن کے علاوہ ایک مثنوی بادشاہ نامہ بھی قلمبند کی، جس میں عہد شاہجہانی کے ۱۰۴۷ھ تک کے حالات ہیں، یہ شاید قدسی کی مثنوی ظفرنامہ شاہجہانی کے تتبع میں لکھی گئی جس میں ۱۰۴۸ھ تک کے واقعات ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ) بعہد عدل او واپس ستانند — چمن از خاک زرہائے خزان را

کفش پرداخت کان گوہر وزر — فلک برچید آخر این دکان را

درون شیشۂ افلاک بیند — لبالب از ہوا فضائے آسمان را

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] مراۃ الخیال (ص ۱۴۶-۱۴۵) میں کلیم کی کچھ منتخب غزلیں منقول ہیں، ان میں سے ایک ہم بھی ناظرین کی ضیافت کے لیے پیش کرتے ہیں،

پیری رسید و مستی طبع جوان گذشت — ضعف تن از تحمل رطل گران گذشت

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست — رو پس نکرد ہر کہ ازین خاکدان گذشت

در راہ عشق گریہ متاع اثر نداشت — صد بار از کنار من این کاروان گذشت

طبعے بہم رسان کہ بسازی بعالمی — یا ہمتی کہ از سر عالم توان گذشت

در کیش ما تجرد عنقا تمام نیست — در قید نام ماند اگر از نشان گذشت

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش — آنہم کلیم با تو بگویم چسان گذشت

یک روز صرف بستن دل شد باین و آن — روز دگر بکندن دل زین و آن گذشت

کلیم کو شاہ جہان کی فرمائش پر شعر کہنے کی قدرت اتنی حاصل تھی کہ اس نے شاہی تخت مرصع، شاہی سپر، شاہی شمشیر اور شاہی قلمدان پر اشعار کہے، شاہ جہان نے اپنی ہر چیز پر اس کے اشعار کندہ کرا دیے تھے، (کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

ظفر خان احسن کو شاہ جہانی عہد کا عبدالرحیم خانخانان سمجھنا چاہیے، مجمع النفائس میں ہے

"بعد از عبدالرحیم خانخانان مثل او از امرائے ہند یہ نشان ندارد"۔[1]

نام اصلی احسن اللہ، تخلص احسن اور ظفر خان خطاب تھا، اس کا باپ خواجہ ابوالحسن تربتی خراسان سے اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، شہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا، جہانگیر کے زمانہ میں پہلے میر بخشی پھر دیوان کل کے عہدہ پر مامور ہوا، اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز کیا گیا، کابل کا حاکم بھی مقرر ہوا، شاہجہان کے زمانہ میں شش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کا علاقہ عطا ہوا، اس کے مرنے کے بعد احسن اللہ شاہانہ عنایت سے مستفیض ہوا، جہانگیر کے زمانہ ہی میں وہ باپ کی جگہ کابل کا حاکم، اور ظفر خان کے خطاب سے سرفراز کیا جا چکا تھا، شاہجہان نے خواجہ ابوالحسن کی زندگی ہی میں ظفر خان کو کشمیر کی حکومت تفویض کی، جہاں سے اس نے تبت پر فوج کشی کی، کچھ دنوں ٹھٹھ کا بھی حاکم رہا، وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا صائب سے مشق سخن کرتا ...... رفتہ رفتہ اس کا ذوق اتنا بڑھا کہ خود مرزا صائب اس کی سخندانی کا مداح ہو گیا، جب صائب کے کلام پر نکتہ چینی کرتا تو خود صائب اس کی داد دیتا، چنانچہ صائب ظفر خان کو مخاطب کر کے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

تو جان ز دنبل بجا مصرع مرا دادی تو از فصاحت دادی خطاب سحبانم

صائب کو ظفر خان کی مداحی پر فخر تھا، اس کی شان میں بہت سے قصائد کہے، ظفر خان

---

[1] مجمع النفائس قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

بھی اس کا بڑا قدر دان تھا، ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضی مشہور تھی، مآثر الامراء جلد ۲ (ص ۷۶۱) میں ہے،

"ظفر خان ایرانیون کو بکثرت روپے دیتا تھا خصوصاً شعراء کے ساتھ خوب بذل و کرم کرتا، صاحب استعداد شعراء اپنے وطن سے دل برداشتہ اس کی بارگاہ مین پہنچتے، اور جن احسانات کی توقعات کے ساتھ آتے، وہ پوری ہوتین، افصح المتاخرین مرزا صائب تبریزی ایران سے کابل آیا تو اس کی (یعنی ظفر خان کی) گرمجوشی اور فیاضی نے اس کی صحبت مین اس کی دلبستگی ایسی ہوئی کہ مدتون ظفر خان کے ساتھ ہندوستان مین رہا، چنانچہ کہتا ہے،

خان خانان را به بزم و رزم صائب دیده‌ام

در سخا و در شجاعت چون ظفرخان نیست

ظفر خان کے ذوق شاعری کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ وہ اپنے عہد کے تمام شعراء مثلاً صائب، کلیم، قدسی، سیدای زرگری، سالک یزدی، سالک قزوینی، دانش اور میر صیدی وغیرہ کے کلام کو ایک بیاض مین ہر ایک کے دست خاص سے لکھوایا تھا، اور ہر ایک کی تصویر اس کے ساتھ منسلک کرائی تھی[۱]، وہ خود بھی صاحب دیوان تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کے دیوان سے مآثر الکرام جلد دوم (ص ۹۶) مین حسب ذیل اشعار منتخب کئے ہین؛

دلم بکوی تو امیدوار می آید ۔۔۔ نگاه دار که روزنت بکار می آید

در گوشهٔ میخانه سخن گفت و شنید است ۔۔۔ [illegible]

در بستان همه چون لاله و گل خود کام نشستند ۔۔۔ [illegible]

۱؎ مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۶۱، مجمع النفائس (؟)

شادم بدل تنگی خود کہ پیش من | قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است
گوشہ چشمی اگر ساقی بما دارد بجاست | عمرہا در گوشہ میخانہ خدمت کردہ ام

ظفر خان نے دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک لاہور، پنجاب، کشمیر اور آگرہ وغیرہ کی تعریف میں تھی، دوسری مثنوی کا نام میخانۂ راز تھا[1]

مرزا محمد طاہر آشنا۔ ظفر خان کا لڑکا تھا، اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی، شاہجہان نے اس کو بہت ہی کم عمری میں یعنی جب وہ صرف سات سال کا تھا منصب عطا کیا، اور جب سن شعور کو پہنچا تو ہزار و پانصدی کے منصب پر مامور ہوا، اور اسی کے ساتھ "داروغہ حضور" بنایا گیا، یہ عہدہ صرف خاندان کے معتبر ارکین کیلئے مخصوص ہوتا تھا، شاہجہانی عہد کے آخر میں وہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، شاہجہان نے اس کو ہمیشہ اپنا ندیم خاص بنا کر رکھا، آشنا نے اپنی عمر کا آخری حصہ کشمیر میں گذارا، عالمگیر کے زمانہ میں اس کو چوبیس ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا، باپ سے شعر و شاعری کا ذوق وراثت میں پایا تھا، مآثر الامراء میں ہے:

"در معنی بندی و سخن سنجی استاد است، صاحب مثنوی و دیوان"[2]

تذکرہ نصر آبادی کا مولف رقمطراز ہے:

"بڑا سمجھدار جوان تھا، لیکن طبیعت میں شوخی تھی، اپنے دوستوں مثلاً ابوطالب کلیم اور دوسرے شعراء کو اپنے گھر میں بلاتا، اور کھانے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں ملا دیتا، .... مجھ پر بھی وہ مہربان تھا، اور اس سے غائبانہ ملاقات تھی، کئی بار خط بھی لکھا، اپنا دیوان، خسرو کی غزلیات اور دوسری کتابیں بھی میرے پاس بھیجیں، شاعری میں اس کو

---

[1] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ص ۲۲۶، [2] مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۶۲،

بڑی قدرت تھی، آشنا تخلص کرتا تھا، سنا ہے کہ دو سال ہوئے اسکا انتقال ہوگیا ہے،
یہ لکھکر آشنا کی رباعیاں اور اشعار بھی نقل کیے ہیں، مثلاً شاہی آئینہ خانہ کی تعریف
میں وہ کہتا ہے:

حبذا این نشیمن والا | کہ بود رشک عالم بالا
دل زکف بردہ حسن دلجویش | طاق آئینہ چشم و ابرویش
کردہ بنای این نکو منزل | از یک آئینہ اش تمام چو دل

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

چشم آن لحظہ کہ در ہجر تو بیمار شود | خارپشت مژدہ ام غیرت گلزار شود
عقل ناچار کشد زحمت آلایش نفس | دایہ پرہیز کند طفل چو بیمار شود

ایک رباعی بھی سننے کے قابل ہے:

کم ظرف زعشق خرمن ہستی سوخت | پر حوصلہ نور زندگانی افروخت
کاہید خرد زعشق وافزود جنون | از باد چراغ مردہ آتش افروخت[1]

کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی،[2] ایک ساقی نامہ بھی اس کی طرف منسوب ہے، وہ جب
شاہی کتب خانہ کا نگران تھا، تو عبد الحمید لاہوری اور محمد امین قزوینی کی تاریخوں کا ایک
ملخص تیار کیا، جس میں شاہجہانی عہد کے پہلے تیس سال کے حالات تھے،[3] البتہ نے شاہجہان نامہ
کے نام سے اس کے اقتباسات جلد ہفتم میں دیے ہیں،

جہانگیری عہد کے جلیل القدر امیر اور شاہجہان کے مربی مہابت خان سپہ سالار کا لڑکا

---

[1] تذکرہ نصرآبادی صـ ۵۹-۵۸ [2] فہرست کتبخانہ شاہ اودھ صـ ۳۳۹ [3] برٹش میوزیم کیٹلاگ، فارسی
مخطوطات جلد اول صـ ۲۶۱

مرزا امان اللہ بھی صاحب علم اور صاحب سخن تھا، امانی تخلص کرتا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں اس کو سہ ہزاری منصب اور خانہ زاد خان کا خطاب ملا، شاہجہان نے اس کو پنجہزار سوار کا منصب اور خان زمان کا خطاب عنایت کیا، مختلف اوقات میں وہ کابل، بنگالہ، مالوہ اور دکن کا صوبہ دار رہا، شجاعت و سپہگری کے علاوہ علوم و فنون کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور تھا، اس کی کئی تصنیفات تھیں، تاریخ سلاطین عالم، مجموعۂ گنج بادآورد، اور ایک دیوان تھا[۱]، اس کی سخن سنجی کی داد تذکرہ نگاروں نے دی ہے، تذکرہ نصرآبادی میں ہے (ص ۵۹)

"شورش خالی از لطفی نیست"

آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں:

"در وادی شعر نہایت خوش سلیقہ است"

مرزا محمد طاہر نصرآبادی نے اس کے جو اشعار پسند کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

بر دور جام ما بنویسید نام او | تا نام ما بدور بماند ز جام ما
دوران اگر بکام نگردید گو نگرد | این بس کہ دور جام بگردد بکام ما

ہر نفس از گریہ می شویم دل افسردہ را | تشستشوا ز آب حیوان می دہم این مردہ را

(رباعی)

بیگانہ خودیم آشنا می خواہم | در پہلوی عندلیب جا می خواہم
چون غنچہ بہای شگفتن شدہ ام | تحریک نسیمی از صبا می خواہم

سلطان شادمان۔ پنجاب اور حسن ابدال کے درمیان بسنے والی قوم گکھر کے حکمران خاندان کی نسل سے تھا، مراۃ الخیال کا مصنف اس کو ایک "عالی فطرت" اور "نیکو بیان" شاعر کہتا ہے، اس کی زبان میں لکنت تھی، مگر شاہجہان کو اس کا کلام بہت پسند تھا اسی وجہ سے اس کو انعام و اکرام

[۱] مآثر الامرا، جلد اول ص ۷۴۸

سے مالا مال کرتا رہتا تھا[1]، جب تخت طاؤس تیار ہوا تو قدسی، کلیم اور دوسرے درباری شعراء کے ساتھ شاداں نے بھی ایک قصیدہ کہا جو پسند کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

صبحدم کز فیض گشتم ہمنشین آفتاب   نقش نام شاہ دیدم در نگین آفتاب
شاہ دین پرور شہاب الدین محمد بادشاہ   ثانی صاحب قران مہ قرین آفتاب
تا قرین آفتابش گفتہ ام ہستم خجل   زانکہ باشد سایۂ حق برتر ین آفتاب
مجز وصف سریرش بین کہ میکارم بذوق   تخم گلہاے مدیحش در زمین آفتاب
تخت شاہنشاہ ما زآب گہر پیدا کند   موج دریاے خجالت بر جبین آفتاب
صفحۂ اشعار من از وصف تخت بادشاہ   چون ید بیضا بود در آستین آفتاب
روے اورنگ شہنشہ زآب وتاب لعل ودر   خیرگی بخشند بچشم دور بین آفتاب
خوبی اعجاز مدح شاہ زانا زم کہ ساخت   از بلندی معنی من دلنشین آفتاب
شاد مان ظل شہنشہ بر جہان پاینده باد   تا بود نقش فلک در زیر زین آفتاب[2]

شیخ محمد محسن فانی[3] کشمیری ملا طاہر غنی کشمیری کے استاد تھے، جو ان کے علمی کمالات کی بہت بڑی دلیل ہے، مرآۃ الخیال میں ہے

"سالک مسالک نکتہ دان شیخ محسن فانی فاضل متبحر وصاحب جاہ وپاکیزہ روزگار وخوش گو وخوش صحبت بودہ" (ص ۲۵۴)۔

ید بیضا میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں

"از اہالی کشمیر است، درویشی صوفی مشرب صاحب ذوق بودہ، غنی کشمیری بخدمتش رسیدی"

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۵۲ میں ہے "شاداں باوجود لکنت زبان طبعی نازک داشتہ وصاحب قران ثانی بالکہ رش بحال او مرحمت بودہ مورد التفات خاطر میگردانید" [2] ایضاً ص ۲۵۳

کسب کمالات کردہ"۔

صبح گلشن (ص ۳۰۰) میں ہے:

"دی درا کثر علوم علم یکتائی می افراشت"

دارا شکوہ کے بھی ندیم خاص رہے، اور اس کے یہاں بڑی ثروت و عظمت حاصل کی، شاہ جہان نے الہ آباد کی صدارت تفویض کی، یہاں حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہٗ سے سلوک کی تعلیم پائی، اور تصفیۂ دل اور تزکیۂ باطن کی نعمت سے سرفراز ہوئے، مگر جب نذر محمد خان والی بلخ و بخارا کو شاہی فوجوں سے شکست ہوئی تو اس کے مال و اسباب میں شیخ فانی کا ایک دیوان بھی پایا گیا، جس میں اس کی شان میں ایک قصیدہ بھی تھا، شاہجہان کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور یہ شیخ فانی کو صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا، لیکن ان کے علم و فضل کی قدر کی، اور سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، فانی نے بقیہ عمر کشمیر میں گزاری، ان سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کے یہاں امرار اور تلامذہ کا ہجوم رہتا تھا، ان کے کلام میں بڑی رنگینی، روانی اور لطافت ہوتی تھی، مثال کے طور پر ہم ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں، جو انھوں نے شاہ جہان کی مدح میں کہا تھا، اس میں ہندی الفاظ اس طرح استعمال کیے گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے قصیدہ میں قبح کے بجائے حسن پیدا ہو گیا ہے، شاہ جہان کی فیاضی، کرم گستری اور ذرہ پاشی کے ساتھ ہندوستان کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے،

نو بہار آمد بسبز گلشن ہندوستان	زیبد ار طوطی بجاے پر برآرد برگ پان
چشم مردم از سواد ہند روشن می شود	کو تیار د کس متاع سرمہ را از اصفہان
در چمن ہر صبح مناجی کند راگ بسنت	نیست طوطی را بجز کلیان چو بلبل زبان
بسکہ دارد در چمن میلی گرفتاری بسر	زیبد ار قمری ز طوق خویش بندد آشیان

چنبیہ می گیرد چو نرگس دست گلچین را بزر | لالہ می بندد حنا چون گل بپای باغبان
گل ز شبنم ہار چنبیلی بگردن افگند | تا تواند شد حریف شاہ ہندوستان
باغ و صحرا سبز شد از فیض ابر نو بہار | شد ہمہ صحن زمین ہمرنگ بام آسمان
چشم نرگس از سواد ہند روشن می شود | در گلستان لالہ از سرمہ پر شد سرمہ دان
گرچہ گلہا ہم غزلہا خواندہ در وصف بہار | لیک نبود در چمن چون سبزہ کس رطب اللسان
بسکہ سوسن می کند یادہ زبان وصف چمن | دور نبود گر ز حیرت غنچہ را وا شد دہان
تا لب جو سبز شد از فیض ابر نو بہار | جدول زنگار دارد صفحۂ آب روان
سیم و زر دائم می گیرد ز چنبیلی دسبیل | نرگس از بہر نثار ثانی صاحبقران
بادشاہ قدردان شاہ جہان گر فیض او | گوشۂ باغ جہان شد رشک گلزار جنان
از ہوائے کرم در ہندوستانش پاک نیست | پر سرش سایۂ بال ہما شد سایہ بان
نیست تنہا بار بردار وقار او زمین | بستہ گردون ہم کمر در خدمتش از کہکشان
جذبۂ از کار فرگرفتن پیش او چون قرص نو | ہمت از حاتم گرفت و عدل از نوشیروان
ہیچ کس از سفرۂ احسان او بے بہرہ نیست | شد ز دود مطبخش آباد چندین دودمان
در زمان دولتش نبود عدو ہم بے نصیب | می کشد در چشم دشمن سرمہ از میل سنان[1]

شیخ فانی نے ایک مثنوی مصدر الآثار بھی لکھی، اس کا آغاز اس شعر سے کیا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم | تازہ نہالے است ز باغ قدیم[2]

محمد حسین آشوب کے بارہ میں غلام علی آزاد بلگرامی صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ماژندران سے آکر ظفر خان احسن کے دربار سے وابستہ ہوا، مگر لطف اللہ مہندس کی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ

---

[1] مراۃ الخیال صفحہ ۲۵۵ ، [2] ید بیضا صفحہ ۱۰۱ قلمی نسخہ دار المصنفین

وہ شاہجہانی دربار کے شعرا میں سے تھا، آزاد بلگرامی اس کے حسب ذیل دو شعر نقل کرتے ہیں، مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ دونوں شعر حسن بیگ رفیع کی طرف بھی منسوب ہیں،

سبزہ از فرگان من نیز مشق شادابی گرفت
نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود
گرد او گردم کہ باج از مردم آبی گرفت[1]

میر الٰہی ہمدانی - ہمدان کے علاقہ اسدآباد کے سادات میں سے تھا، اصفہان میں حکیم صفائی اور آقا رضی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ہندوستان آیا، اور شاہجہان کے دربار میں ملازم ہوا، آزاد بلگرامی اس کے کلام کے بہت مداح ہیں، لکھتے ہیں:

کلامش لطافتے و عذوبتے دارد، و مذاقہا را لذتے خاص می بخشد۔[2]

غنی کشمیری بھی اس کے شاعرانہ کمال کا معترف تھا، چنانچہ الٰہی کی وفات پر یہ تاریخ کہی، ع

برد الٰہی ز جہان گو ہر سخن

کلام کا نمونہ یہ ہے:

زمانہ بسکہ مرا خاکسار ہر دم کرد
ز آب دیدۂ من می توان تیمم کرد

رباعی

از دوریت اے تازہ گل باغ مراد
چون غنچہ چیدہ خندہ ام رفتہ زیاد

گریان چو پیالۂ پرم در کف مست
نالان چو سبوی خالیم در رہ باد[3]

امی شیرازی - نوشت و خواند سے بے بہرہ تھا، مگر شعر گوئی میں کافی شہرت حاصل کی، شاہجہان کے جود و سخا کی شہرت سنکر شیراز سے شاہجہان آباد آیا، اور شاہی دربار میں کئی قصائد پیش کئے، انعام و اکرام پاکر وطن لوٹ گیا،[4] اس کا یہ شعر روز روشن میں منقول ہے:

---

[1] ید بیضا ص ۱۰۸۔ [2] ماثر الکرام جلد دوم ص ۳۳۔ [3] ایضاً۔ [4] روز روشن میں ہے: امی شیرازی اگرچہ از نوشت و خواند (باقی حاشیہ ص ۱۹۳ پر)

تا دلم در صفت حسن غزل خوان شدہ است   وصف ابروئے تو سر مطلع دیوان شدہ است

باقیا نائینی شاہجہانی دربار کا ایک مقبول شاعر تھا، نام باقی، اور وطن نائین تھا، عراق میں حکیم شفائی، اور خراسان میں مرزا فصیحی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ہندوستان آیا، طالب آملی کی وساطت سے مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے دربار میں پہنچا، اور ایک قصیدہ پیش کر کے تقرب حاصل کیا، پھر شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا[۵]، اور جب شہزادہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو اپنی شاہانہ نوازش سے برابر سرفراز کرتا رہا، چنانچہ ۱۰۴۲ھ میں جشن نوروز کے موقع پر باقیا نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے قدسی اور کلیم کی طرح اس کو بھی روپے سے تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار۔۔۔۔۔ ہوئے[۶]، شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی ماہر تھا، چنانچہ معاصر مورخین ان فنون لطیفہ میں اس کے کمال کے مداح اور معترف ہیں، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے:

"باقیا نائینی را در شعر طبیعت روان و تصانیف فارسی او از آمیزش نغمات ہندوستانی تاثیر دارد"

عمل صالح (حصہ دوم ص ۲۳۰) میں ہے:

"سخنورے طبع روان دارد، و در تصنیف و تالیف نغمات بروش موسیقائے یونان و فارس بے نہایت ماہر است و تصانیف خود را کہ برونق ریختہ، طرز امیر خسرو و نغمہ ہوائے ہند بر آمیختہ لہذا مرغوب و مطبوع مسامع و طبائع افتادہ"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۲) بہ ہند رسید لیکن کام فکر بر جادۂ خوشحالی می گذاشت، در عہد شاہجہان بادشاہ بشاہجہان آباد رسیدہ، قصائد فصیحہ بحضور شاہی گذرانید و بجوائز مترقبہ متمتع گشتہ بوطن خود باز گردید" (ص ۱۷)

(حواشی صفحہ ہذا): [۵] میخانہ ص ۵۰۰، [۶] مآثر الکرام جلد دوم ص ۷۹

میخانہ کا مؤلف رقم طراز ہے (ص ۵۶۰)

"در رسالہ در علم موسیقی ترتیب دادہ کہ تا لغایہ کسے باین روش مرتب نساختہ"

تذکرہ نصرآبادی کا مصنف بھی اس کی سخن سنجی کا معترف ہے، اور اس کے تین شعر اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں (ص ۳۰۷)

زان زخم کوس نوبتِ کاسان از بہمن — می رساند زُہرہ وچرخ دگر ہم می زند

ہمہ حاصلِ جہان را بہ نشاط صرف کن — بہ کافر و مسلمان بنشین و صلح کل کن

رفتہ بہتر آنکہ مقصود عزیزان — باقیست کہ واماندہ درین مرحلہ تنہا

کچھ رندی و مستی کے اشعار بھی سنیے:

توبہ کردیم کہ تا بادہ نباشد نخوریم — تا کہ ساقی پسر سادہ نباشد نخوریم

بادہ تا میکدہ معمور نباشد نکشیم — روزہ تا روزی آمادہ نباشد نخوریم[۱]

لطف اللہ کے گنائے ہوئے شعراء کے علاوہ بہت سے اور بھی ارباب سخن بارگاہ شاہجہانی سے منسلک تھے، ان میں سب سے پہلے مرزا صائب پر نظر پڑتی ہے، صائب کی ولادت تبریز میں ہوئی، لیکن تعلیم اصفہان میں پائی، شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی کا شاگرد تھا، جہانگیر کے زمانہ میں تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی لیکن اس کی شاعرانہ صلاحیت کا جوہر شاہجہان کے زمانہ میں چمکا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک تاریخی قطعہ لکھا جس کے صلے میں شاہجہان نے اس کو بارہ ہزار روپے دیے، کچھ دنوں کے بعد منصب ہزاری اور مستعد خان کا خطاب بھی عطا کیا[۲] ۱۰۳۹ھ میں شاہجہان نے دکن کا رخ کیا، تو مرزا صائب اس کے ہمرکاب تھا، شاہی دربار میں ظفر خان احسن

۱؎ میخانہ ص ۵۶۰، ۲؎ مرآۃ الخیال ص ۱۴۰

سے ملاقات ہوئی، پھر دونوں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ اب بھی دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔
ظفر خان کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا تو مرزا صائب کو ساتھ لے گیا، ظفر خان کو مرزا صائب کی مداحی پر اور مرزا صائب کو ظفر خان کی شاگردی پر ناز تھا، سنہ ۱۰۴۲ھ میں صائب مشہد اقدس کی زیارت کو جانا چاہتا تھا تو شاہجہان نے زاد سفر کے لیے پانچ ہزار روپے عنایت کئے، صائب کے باپ کو اس سے ایسی محبت تھی کہ اس کی جدائی زیادہ دنوں تک گوارا نہ کی، اور خود ہندوستان آکر اس کو اپنے ساتھ وطن واپس لے گیا، ایران میں شاہ عباس ثانی نے اس کی بڑی قدردانی کی، اور ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن صائب کو ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں
جب نواب جعفر خان عالمگیر کے عہد میں وزیر اعظم مقرر ہوا تو مرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دور دستان را باحسان یاد کردن ہمت است　　ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خان نے پانچ ہزار روپیے اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچ ہزار اشرفیاں بھیجیں، سنہ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی، اس کے مزار پر اس کی ایک غزل کندہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو　　عالم پر است از تو و خالیست جائے تو

ایک صاحب سخن نے اس کے مزار کو ایک پر فضا مقام پر دیکھ کر یہ شعر بھی لکھ دیا ہے:

اے صبا آہستہ پا برہم گلہائے غنچہ نہ　　یاسمینا انند گلہا صائبا خوابیدہ است[1]

مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۸۹) میں لکھتے ہیں کہ ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہو گئی، اس وقیع رائے کے بعد کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں، مولانا شبلی کلمات الشعراء کے حوالے سے یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسن قبول حاصل ہو چکا تھا کہ سلاطین، امراء اور شاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے

[1] کلمات الشعراء ذکر مرزا صائب۔

کرتے تھے، اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھی جاتی تھیں[۱]،

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا صائب نے شعر و شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی سے تعلیم پائی،

اس کا پورا نام رکن الدین مسعود اور تخلص مسیح کبھی مسیحا اور کبھی مسیحی تھا، آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے لیکن کاشان میں توطن اختیار کر لیا تھا، طبابت خاندانی پیشہ تھا، اس لیے حکیم رکن کاشی کے نام سے بھی شہرت پائی، ایران میں شاہ عباس صفوی کا ندیم خاص تھا، مگر کسی سبب سے مکدر خاطر ہو کر اس نے شاہ ایران کے دربار سے قطع تعلق کر لیا، اور یہ شعر لکھا،

گر فلک یک صبحدم با من گران باشد سرش شام بیرون می روم چون آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا، اور اکبر و جہانگیر کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی، کچھ دنوں مہابت خان اور اس کے لڑکے امان اللہ کی خدمت میں بھی رہا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو حسب ذیل قطعہ لکھ کر بارہ ہزار روپے انعام میں حاصل کیے،

بادشاہ زمانہ شاہ جہان خرم و شاد و کامران باشد

ہر سال جلوس او گفتم در جہان بادشاہ جہان باشد

سنہ ۱۰۳۷ھ میں مشہد اقدس کی زیارت کی اجازت شاہجہان سے لی تو خزانہ عامرہ سے زاد سفر کے لیے پانچ ہزار روپے عنایت کیے گئے، زیارت کے بعد وطن کی طرف مراجعت کی، اور وہیں سنہ ۱۰۶۶ھ میں وفات پائی، شاہجہان غائبانہ طور پر بھی اس کو یاد کیا کرتا تھا، اور وقتاً فوقتاً تحفے بھیجتا رہتا تھا[۲]، ایک دیوان چھوڑا جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا صائب نے اس کے دیوان کا انتخاب کر کے حق شاگردی ادا کیا، میخانہ کا مولف اس کے محاسن شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[۱] شعر العجم حصہ سوم ص ۲۰۰ [۲] مآثر الکرام ص ۱۹۱-۹۲ ج ۲

اشعار دلپذیرش، بغایت رنگین و معانی سخنانیش بے نہایت متین است"۔ (صفحہ ۳۶)

غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی خزانۂ عامرہ میں اس کے اشعار کی فصاحت و بلاغت کی بڑی تعریف کی ہے،

سرخوش کلمات الشعراء میں رقمطراز ہے:

"در معنی یابی یدبیضا داشت بسیار خوش فکر است"

یہ لکھ کر طرز کلام کا یہ نمونہ پیش کیا ہے:

درمن آمیختہ تو تو اثر پیدا نیست	ہمہ شیر است درین کاسہ شکر پیدا نیست
آنچنان با تو یکے گشت وجودم اکنون	کہ ترا بے تو توان دیدن و بے من نتوان
تمام عمر ما باشاہد و سالہ گذشت	حباب وار مرا عمر در پیالہ گذشت
روز اول کہ درین ویرانہ نہادم قدم	بازمی بایست گشتن دہر دیواری نداشت
ہمچون نگین کہ بہر نگین دان شدست خلق	اورا خدا برائے کنار آفریدہ است

میخانہ میں اس کا ایک ساقی نامہ اور دوسرے اشعار بھی درج ہیں، مخزن الغرائب میں بھی اس کے دیوان کے طویل اقتباسات ہیں، مؤخر الذکر تذکرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں حکیم رکنا کاشی اس کی فیاضی کی بدولت ایک بڑی دولت حاصل کرکے وطن لوٹ گیا تھا، اور وہاں سے پھر آیا تو ایک سو پانچ سال کی عمر میں وطن واپس گیا، ہم رکنا کاشی کے دو بھائی حکیم قطبا اور حکیم نصیرا کا خاندان بھی شاہی جود و سخا سے فیضیاب ہوتا رہا، حکیم قطبا کا لڑکا ضیاء الدین رحمت خان شاہجہان اور عالمگیر کے منصبداری امراء میں سے تھا، اور ابو طالب کلیم کی لڑکی اس کے حبالۂ عقد میں تھی، (دیکھو مآثر الامراء جلد ۲ صفحہ ۲۹۶)

حکیم رکنا کاشی نے شیدا کے ذوق سخن کی داد دی ہے،

مسیحا را بشید ایان عالم الفتی باشد — بجز شید انگو ید شعر گو کس در زمین من

اور یہ دعویٰ موجب تعجب ہے، کیونکہ تمام ایرانی شعراء شیدا سے نالاں اور آزردہ خاطر رہے شیدا کو ایرانی شعرا کے احساس برتری سے چڑھ تھی، کشمیر پر اس نے نثر میں ایک کتاب لکھی ہے اس کے خاتمہ میں لکھتا ہے،

"اہل ایران ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے میری کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ہیں، وہ اسکو بھول گئے ہیں، کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے دنیا میں آئے تو سراندیپ کی زمین کو اپنی ذات سے مشرف فرمایا، اور اس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام ہندی ہیں، اور جن لوگوں نے ہند میں نشو ونما پائی ہے ان میں آدمیت زیادہ ہے، اصلی بات یہ ہے کہ ایرانی اور ہندی ہونا فخر کی سند نہیں ہے، آدمی کی عزت اس کی ذاتی عزت سے ہوتی ہے، اگر ایرانی طنز کریں گے کہ فارسی ہماری زبان ہے، تو اپنی زبان کو اپنے تالو میں نہ پائیں گے، اور اگر زبان ان کے تالو میں ہو بھی تو مذاق شاعری سے آشنا نہ ہوں گے چونکہ شاعری کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، مجبوراً ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، ظاہر بین لوگ جو صورت کو دیکھ کر معانی کا پتہ نہیں پا سکتے ہیں، میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہیں، میرے رنگین معانی ان کے خلعت کی طرح خوبصورت ہیں، اور ان کے اشعار میرے کپڑے کی طرح بدصورت، یہ میرے کپڑوں پر نظر رکھتے ہیں اور میں ان کے سامنے رنگین معانی پیش کرتا ہوں، جو کچھ کہ بے تکلفی سے کہا گیا وہ سچ ہے، اور سچ سے رنجیدہ ہونا عقلمندوں کا کام نہیں، (قرۃ الخیال ص۱۹۵)

ان ہی جذبات کی بنا پر اس نے ایرانی شعراء کی ہجو لکھی، طالب آملی کی مذمت کا ذکر پہلے آچکا ہے، الہی ہمدانی پر ایک قطعہ لکھا،

اے میر من کہ کردہ الٰہی تخلصت — از مزد لاہی ازچہ الٰہی شدن خطا ست

زین رطب و یابسی کہ بود در کلام تو | گر منکر کلام الٰہی شوم رواست[1]

قدسی نے ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع یہ ہے

عالم از نالۂ من بے تو چنان تنگ فضاست | کہ شنید از سرِ آتش نتواند برخاست

شیدا نے اس قصیدہ کے ہر شعر پر اعتراض کیا، اور ان اعتراضات کو منظوم کیا جن میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ بسنج | نقد ہر حرف بمیزان خرد بے کم و کاست
نالہ در سینہ ہوائیست کہ بے قصد رود | چونکہ از سینہ ہوا گیر شد از جنس ہواست
عالم از وی نشود تنگ ولیکن ز ملال | خلق عالم گزارد و تنگ نشیند رواست
خود گرفتم کہ جہان تنگ شد از نالۂ تو | کہ ز تنگی نظر از چشم نیارد برخاست
نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر | کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست
تنگی عالم از نالہ بکیفیت اوست | کہ جہان تنگ نداند و شدید و ہواست
تنگی جا ز کجا تنگی اندوہ کجا | بیشتر از تن و جان تفرقہ بہم پیداست[2]

اسی طرح کی اور بھی ابیات ہیں، مرآۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا کے یہ اعتراضات بہت مشہور ہوئے، مگر مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ شیدا نے اپنے اعتراضات میں ناانصافی سے کام لیا ہے، (ص ۴۴۲)

شاہجہاں بھی شیدا کی گستاخی اور بے باکی سے کئی بار رنجیدہ ہوا، ایک بار شاہجہاں نے اس سے پوچھا کہ "تم شعر اچھا کہتے ہو یا حکیم حاذق گیلانی" شیدا نے بادشاہ کے اس سوال کو ناپسند کیا، کیونکہ وہ حکیم حاذق گیلانی کو اپنا مقابل نہیں سمجھتا تھا، اور اس کی ہجو کر چکا تھا،

[1] ید بیضا ص۹۲، [2] مرآۃ الخیال ص ۱۴۸ - ۱۴۹

اس لیے جل کر بولا "ہم دو نون سے راے پاے واس بہتر کہتا ہے" راے پاے واس شاہی دربار کا ادنی ملازم تھا، جو مضحک اشعار کہا کرتا تھا، شاہ جہان اس جواب سے بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور شیدا کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا، ایک موقع پر شیدا کا یہ مشہور شعر شاہجہان کو سنایا گیا

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہرے　　حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے ام الخبائث شراب کی یہ توقیر اپنے قلمرو مین پسند نہین کی، اور فوراً شیدا کو شہر بدر کرنے کا حکم جاری کیا، شیدا نے اپنی برأت کے لیے پہلے جامی کا مندرجہ ذیل شعر استشہاد مین پیش کیا،

از صراحی دو بار قلقل مے　　پیش جامی به از چہار قل است

پھر ایک طویل قطعہ معذرت مین لکھا جس کے کچھ اشعار یہ ہین :

جہان پناہا شاہا بقدر جاہ و جلال　　نیافرید خدا چون ترا عدیل و نظیر
بوصف مے زدہ سر از من این مصرعۂ خوش　　سرگشتہ در دو زبان ہمہ صغیر و کبیر
اگرچہ لفظش عام است معنیش خاص است　　بخاص و عام بود شہرۂ ہمچو بدر منیر
چنین کہ ہیکش اسرار مولوی جامی　　کہ بست گفتہ او دور از در تقصیر
بوصف مے ز صراحی دو بار قلقل مے　　بہ از چہار قلش گفت و فارغ از تکفیر
مرا بہ کفر چہ نسبت بود کہ بہ ز مے　　سخن چنین کند و ہیچ نایدش بضمیر
مرا چہ شاہ براند کجا توانم رفت　　بگاہ راندن از کف کسی رود شمشیر[1]

اس قطعہ کو سنکر شاہ جہان نے شیدا کو معاف کر دیا، آخر عمر مین وہ کشمیر مین گوشہ نشین ہو گیا تھا، جہان اس کو شاہجہان کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا، اپنی علمی یادگار مین ایک مثنوی

[1] کلمات الشعرا سرخوش

موسوم بہ دولت بیدار اور ایک دیوان بھی چھوڑا، دیوان میں ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں اس کے کلام کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے:

"خیالش غریب و افکارش لطیف است، شعر بسیاری گفتہ (ص۴۴۴)

غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام جلد دوم (ص۸۵) میں تحریر فرماتے ہیں:

"صاحب ذہن رسا و فکر آسمان پیما بود شعر را بسرعت تمام می گفت، وبچشم زدن جواہر فراوان می سفت"

مگر خود شیدا کے معاصر منیر لاہوری نے اس کے کلام کی ہجو کی ہے،

شیدا گوید کہ شعر من لک بیت است — ہر نقطہ من بصفحہ بے شک بیت است
یک بیت درست نیست در دیوانش — از جفت بروت صاحب لک بیت است[1]

یہ ہجو شاید اسی افرا تفری کا نتیجہ ہے جس میں خود شیدا بھی مبتلا تھا، مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا بہت ہی ذی استعداد شاعر تھا، علم عروض میں اس کی مہارت کا ملہ ضرب المثل تھی، وہ ایسے شعرا کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، جو مقبول خاص و عام ہوتے تھے مگر فن شاعری سے بیگانہ تھے، ان کے کلام کے عیوب و نقائص کو بہت بے باکانہ طریقے سے آشکارا کرتا تھا، اسی لیے اس کی بھی ہجو کہی گئی،

شاہجہانی دربار کے شعرا میں حکیم حاذق گیلانی کی رعونت اور خود پسندی مشہور تھی، وہ حکیم ہمام گیلانی کا لڑکا تھا، اس لیے وراثت میں طبابت اور امارت کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق پایا، شاہ جہان نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر اس کو منصب ہزار و پانصدی ششصد سوار عطا کیا، اور اسی سال والی توران کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہاں سے واپسی کے بعد اس کو

[1] ید بیضا ص۶۳

عرض مکرر کی خدمت تفویض کی گئی، اور سہ ہزاری منصب دیا گیا، کچھ دنون کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی، مگر اس زمانہ مین بھی شاہی خزانہ سے بیس ہزار اور پھر بعد مین چالیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا، کچھ دنون درباری مورخون کے ساتھ اس عہد کی تاریخ لکھنے مین بھی شریک رہا، اس کے اشعار صاف اور پاکیزہ ضرور ہوتے تھے، مگر اپنی خود بینی کی بنا پر اپنے کو انوری سے بھی بہتر تصور کرتا تھا، اپنے دیوان کو بڑی زینت و آرایش کے ساتھ لکھوا کر ایک مرصع طشت پر رکھتا تھا، اور جب کسی مجلس مین جاتا اور عمائدین سلطنت اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھتے تو برہمی کا اظہار کرتا، دیوان کو ایک مطلا رحل پر رکھ کر اپنا کلام سناتا تھا، اس کے اس شعر کی داد تو آج بھی دی جا سکتی ہے

دلم بہیچ تسلی نمی شود حاذق | بہار دیدم و گل دیدم و خزان دیدم[1]

کچھ اور بھی سنیے

بوئے گل امشب ز دود شمع می آید مگر | بلبل آتشکدہ بر سر خاکستر پروانہ ریخت

زبہر تسبیح و سلم عار دارد | کہ سبحہ بر میان زنار دارد

من آن تسبیح را بر دست گیرم | کہ او ذاکر بود گر من بمیرم[2]

سعیدائی گیلانی شاعر بھی تھا اور اعلیٰ قسم کا صناع بھی، اس کو زرگری مین غیر معمولی کمال حاصل تھا، اسی لیے شاہجہان نے اس کو زرگر خانہ کا داروغہ مقرر کیا، اور بے بدل خان کا خطاب دیا، شاہجہانی عہد کا سب سے بڑا صنعتی کارنامہ تخت طاؤس اسی کے ہاتھون انجام پایا، یہ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے سات سال مین تیار ہوا، اس کا طول سوا تین گز، عرض ڈھائی گز، بلندی پانچ گز تھی، اس تخت کے اندرونی حصہ مین زیادہ تر میناکاری کا کام اور کچھ حصہ مرصع تھا، چھت کے بیرونی حصہ مین لعل و یاقوت جڑے ہوئے تھے، اور اس کو زمرد کے بارہ ستونون پر قائم کیا گیا تھا، چھت کے اوپر دو مرصع طاؤس بنائے گئے تھے

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۵۹۰، [2] تذکرہ نصر آبادی ص ۶۲

اور دونوں طاؤس کے درمیان ایک درخت نصب کیا گیا تھا، جو لعل، الماس، زمرد اور مروارید سے مرصع تھا، تخت پر چڑھنے کے لیے تین پائے کی ایک سیڑھی بنائی گئی تھی جو جواہرات سے آراستہ تھی، تخت کے گرد تکیہ لگانے کے لیے گیارہ مرصع تختے تھے جن میں سے درمیان کا تختہ جس پر بادشاہ ہاتھ رکھ کر تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا دس لاکھ روپے کی قیمت کا تھا، اور ان میں ایک لعل تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے تحفۃً جہانگیر کی خدمت میں بھیجا تھا، اس پر پہلے امیر تیمور، مرزا شاہ رخ، مرزا الغ بیگ کے نام کندہ تھے، شاہ عباس نے بھی اس پر اپنا نام لکھوایا، پھر جہانگیر نے اپنا اور اکبر کا نام کھدوایا، اس کے بعد شاہ جہان نے اپنا نام کندہ کرایا، عالمگیر کے اوائل دور حکومت میں اس تخت کی ترصیع و ترتیب میں اور اضافہ کیا گیا۔[۵] [illegible] بے بدل خان نے جب اس کو تیار کیا تو شاہ جہان نے خوش ہو کر بے بدل خان کو روپے میں تلوایا، اور جب آٹھویں سال جلوس کے جشن میں شاہجہان اس پر جلوہ افروز ہوا تو تمام شعراء نے قصیدے، نظمیں اور مثنویاں پیش کیں، حاجی محمد جان قدسی نے اس کی تاریخ اورنگ شاہنشاہ عادل نکالی، قدسی کی اس مثنوی کے کچھ اشعار یہ ہیں

زہے فرخندہ تخت پادشاہی　　　　کہ شد سامان بتائید الٰہی
فلک روزے کہ آنکہ گردش بکمل　　　　زر خورشید را بگداخت اول
بحکم کارفرما صنعتگر پاک　　　　بمیناکاریش مینائے افلاک
جز این تخت از زر و گوہر چہ مقصود　　　　وجود بحر و کان را حکمت این بود
ریاقوتش کہ در قیمہ بہا نیست　　　　لب لعل بتا نرا دل بجا نیست
برائے پایہ اش عمرے کشیدہ　　　　گہر افسر بسر خاتم بدیدہ
بجز جشن عالم از زر شد چنان پاک　　　　کہ شد از گنج خالی کیسۂ خاک

[۵] تفصیل کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۷۸ - ۸۰، مآثر الامرا جلد اول ص ۲۴۲

رساند گر فلک خود را بپایش　　دہد خورشید و مہ را زو بہایش
سرافرازی کہ سر بر پایہ اش شود　　زگردون پایۂ بر تخت افزود
اثر باقیست تا کون و مکان را　　بود بر تخت جا شاہ جہان را
بود تختی چنین ہر روز جایش　　خراج ہفت کشور زیر پایش
چو تاریخش زبان پرسید از دل　　بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل[1]

اس جشن میں ابوطالب کلیم، سلطان شادمان اور دوسرے شعرا نے بھی قصیدے کہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خود سعیدای گیلانی نے ۴۳ شعروں کا ایک قصیدہ کہا جس کے مختلف اشعار سے شاہجہان کے مختلف واقعات سلطنت کی تاریخیں نکلتی تھیں، اسکے کچھ حصے یہ ہیں:

خدای واحد بیچون جہان نمود عیان　　برای شاہجہان پادشاہ کل جہان
بداد و جود با حسان شہنشہ آفاق　　علیم و عالی و دانواز و ملک ستان
ہزار سال بمانا و آنکہ ہر دم ازو　　بود بدور جہان صد ہزار جہان شادان
بمدح شاہ جہان طبع این دو دانزدہ بیت　　زقسمت ازل او را ز دل بزبان
ازان دو دانزدہ ہر مصرعی نگاہ نگار　　کند تولد شاہ جہان پناہ بیان
باکبر آباد از جہد کامران بسریر[1]　　جلوس کرد و تا شد عالم شان
ہزار بود و چہل و سہ بسال از ہجرت　　کہ شد بدہلی پادشاہی و سپہ گران
بشو بہار بیا بر گلشن سرہند　　گل بہار آید با ہوا چو گل خندان
ز کامرانی نوروز عزم کردہ ازو　　سوی مدینہ لاہور بر جہان شادان
ہزار گونہ بود گل بکوہ ہر شہ منش　　ہزار چشمہ دلی بہ زچشمۂ حیوان

[1] مصرعہ ناقص معلوم ہوتا ہے، مگر اسی طرح منقول ہے،

بسوی ہند عنان زد و تاب شد با جاہ — جہاندہ برق نما ابرشے چو باد وزان
بداد وجود بدار الخلافہ آمد باز — فلک بدور رکاب و ملک بزد عنان
ہزار شکر بیفزود باز حسن جہان — ز نوبہار سریر جواہر الوان
بہر زمین کہ از آن سایہ فتاد فلک — بداد تا باید دستگاہ پایہ کان
جمال و رنگ ز اورنگ بادشاہ زمن — بداد گیتی صد رنگ بر زمین و زمان
خدیو ملک و ملل بادشاہ دین و دل — جہان کشاد با مداد قوت ایمان
جہان پناہا شاہنشہی و دریا دل — محیطی از کرم وجود لیک بے پایان
ز سہم گرز دستانت دل عدو جاوید — شود ہزیر زمین چو رگ جہندہ طپان
ازان بود سر دشمن برنگ سنگ سیاہ — کہ از برائے حسامت بود مدام فسان[1]

عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ (جلد اول حصہ دوم ص ۳۵۶) میں سعیدا ی گیلانی کی شاعری کی بڑی ستایش کی ہے، لکھتا ہے:

"از رسائی طبع و روانی فکر اکثری بنظم معانی می پردازد، لفظش ہموارہ دلنشین است، و مضامین نو آئینش،

اور مثال کے طور پر بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک غزل کے شعر ہم بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

سوارہ آن مہ زرین رکاب می آید — بچہرہ اشک ہزار آفتاب می آید
بآب تیغ تو دل می کشد ز آب حیات — چو تشنہ کو سوی آب از سراب می آید
کند عرق رخت اسے نازنین ز تاب نگاہ — بدور حسن تو از آتش آب می آید

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۹۲-۹۰

تو مست حسنے و من مست عشق ہیہات تنہا — چنین دو مستی کے از شراب می آید

شعراء کے ہاتھ شاہ جہان کی زر پاشیون کی مثالین بکثرت ملین گی، میر یحیی کاشی نے شاہجہان آباد کی تعمیر کی حسب ذیل تاریخ کہی،

شد شاہ جہان آباد از شاہ جہان آباد

تو شاہ جہان نے پانچ ہزار روپے انعام دئے، سنہ ۱۰۵۵ھ مین ایک موقع پر شاہجہان نے اسکو ایک سو اشرفیان عنایت کین،[1] کلمات الشعراء مین ہے کہ اس نے شاہ جہان کے حکم سے بادشاہ نامہ کو منظوم کرنا شروع کیا، اس مین ایک شعر کہا کہ

سر راجپوتان جگت سنگہ بود — کہ بر شیشۂ فلک سنگ بود

شاہ جہان نے اعتراض کیا کہ جگت سنگھ کو اسکی حیثیت کے لحاظ سے سر راجپوتان کہنا صحیح نہین، پھر سنگہ اور سنگ کا قافیہ بھی درست نہین؛ قدسی نے جواب دیا کہ ہم مغل اس قسم کے الفاظ کی تفریق نہین کر سکتے،

مرزا رضی دانش مشہدی ہندوستان کے بادشاہون کی فیاضی سنکر وطن سے چلا تو اس ملک کے اشتیاق مین اس نے یہ شعر کہا،

راہ دور و حنا پا بستہ وطن دارد مرا — چو حنا شستیان رفتن بہندوستان خوش است

اس کے کلام کی نمایان خصوصیت شیرینی اور دلآویزی مشہور تھی، شاہ جہان کے دربار سے وابستہ ہوا تو اس نے سنہ ۱۰۶۰ھ مین ایک قصیدہ پیش کیا جس کا ایک شعر یہ ہے؛

بجوان ملک تو کشمیر را بہ گوہر است — خطی کہ گرد دست مبارکش پیداست

شاہجہان نے اس پر دو ہزار روپے عطا کئے، (۱۰۰۰) اس کا مرتبہ اور مرتبی

[1] ماثر الامرا جلد سوم ص ... [2] بادشاہ نامہ ... [3] کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

رہا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، کچھ دنوں شاہزادہ شجاع کے دربار میں ملازمت کی، اور عبد اللہ قطب شاہ والی حیدرآباد دکن کے خوان کرم کا بھی ریزہ چین ہوا۔[1]

مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی کچھ دنوں مشہد مقدس میں حصول سعادت کے لیے مقیم رہا اس لیے نام کے ساتھ مشہدی بھی لکھا جاتا ہے، نذر محمد خان والی بلخ کے دربار میں ملازم رہنے کے بعد ۱۰۵۸ھ میں ہندوستان آیا، شاہجہان کی خدمت میں باریاب ہوا تو خلعت اور تین ہزار روپے ملے، اور شاہی ملازموں میں داخل کر لیا گیا، ۱۰۶۶ھ کے جشن جلوس پر ایک مثنوی کہی تو ایک ہزار روپیہ انعام پایا، شاہجہان نے اس کو منصب پانصدی بھی عطا کیا، عالمگیر کے زمانہ میں کشمیر کا دیوان بیوتات مقرر ہوا تھا، اس کو شعر و شاعری میں بڑی شہرت حاصل تھی، اپنے اس شعر پر فخر کرتا تھا،

عمر گر خوش گذرد زندگی خضر کم است　　ور بنا خوش گذرد نیم نفس بسیار است

میر معز موسوی خان نے اعتراض کیا کہ بنا خوش صحیح نہیں یا تو ناخوش ہونا چاہیے یا ناخوشی، مرزا رفیع نے بادل ناخواستہ "بہ تلخی گذرد" بنا دیا، مگر خود کہتا تھا کہ شعر کا مزہ جاتا رہا،[2] کلمات الشعراء میں ہے کہ اس نے شاہجہان آباد پر ایک مثنوی بھی لکھی، تخت مرصع کی تعریف میں کہتا ہے:

اگر پاسبانش شود مست خواب　　بروئش فشانند ز یاقوت آب

شاہی عمارت کی تعریف کرتا ہے:

خدا رفعتش را بجائی رساند　　کہ نقش ز گوہر ز سنگش نماند

میر صیدی طہرانی، اصفہان سے ہندوستان آیا، اور ۱۰۴۹ھ میں شاہجہان کی ملازمت میں داخل ہوا، تو ایک قصیدہ شاہی خدمت میں پیش کیا، جس کا مطلع یہ ہے

---

[1] مآثر الکرام حصہ دوم ص ۸۸ - ۸۷ ۔ [2] ایضاً ۔ [3] کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ۔

زہے جہانِ خدا را سپہر عدل و کرم ‏ ‏ ‏ ‏ بزیر سایۂ قدرِ تو نیّرِ اعظم

شاہ جہان نے اس کے صلہ مین ہزار روپے دیے، اس نے شاہجہان کی شان مین بہت سے قصائد کہے، سرخوش نے کلمات الشعراء مین اس کو نازک خیال، بلند فکر، استاد فن اور کامل سخن کہا ہے، دیوان کے علاوہ کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

مارا بہ برگ سبز کجا یاد می کند ‏ ‏ ‏ ‏ آن گل کہ منع بوی خود از باد می کند

صیاد ما بنای تازہ کردہ است ‏ ‏ ‏ ‏ مرغی کہ پرشکستہ شد آزاد می کند

سوخت رشک شعلۂ شمعم کہ در راہ طلب ‏ ‏ ‏ ‏ از نظرہا کردہ پنہان جادۂ بیہودہ را

در بزم او مجال نشستن نیافتیم ‏ ‏ ‏ ‏ چون نرگس ایستادہ کشیدیم جام را

غباری وارد از خطاہ رخسارش کہ گر یکجا ‏ ‏ ‏ ‏ مصور جمع سازد وصورت خالی نمی گردد

عماد، فتحا، عسکری کاشانی، کیفی نومسلمان، ادراد ہم مرزا وغیرہ نے بھی شاہجہان کے جود و سخا سے متمتع ہوئے ... ہم ان کی تفصیل بیان کرنے سے اس لیے گریز کرتے ہین کہ ہم تیموری دربار کے شعراء کا کوئی تذکرہ لکھنا نہین چاہتے، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ تیموریون کی بزم مین ارباب سخن کی کیا قدردانی اور حوصلہ افزائی ہوئی، اور اس شاہانہ سرپرستی مین ان کا انداز کلام کیا رہا،

ہندو شعراء | شاہجہانی عہد کا سب سے ممتاز ہندو شاعر اور ادیب چندربھان برہمن تھا، لاہور مین پیدا ہوا، شروع مین میر عبد الکریم میر عمارت لاہور کے یہان ملازمت کی، پھر امیر الامراء افضل خان دیوان کل کے دربار مین ملازم ہوا، شاید اس کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا، افضل خان کی وفات کے بعد شاہجہان کے ایک امیر عاقل خان کی وساطت سے دربار مین پہنچا[1]، اور خط شکستہ مین ایک رباعی

[1] اسلامک کلچر اپریل ۱۹۴۰ء اس مضمون مین چہار چمن کا ایک اقتباس دیکر یہ بتایا گیا ہو کہ چندربھان برہمن ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا،

لکھکر شاہی خدمت مین پیش کی،

شاہے کہ مطیع او دو عالم گردد — ہر جا کہ سریست پیش او خم گردد

از بسکہ بدورش آدمی یافت شرف — خواہد کہ شرف نیز آدم گردد[۱]

شاہ جہان نے اس کو وقائع نویسی کے عہدہ پر مقرر کیا، اس عہدہ پر برہمن فخر کرتا تھا کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہو کر ہر روز کے واقعات و حالات سناتا تھا، شاہ جہان نے بھی اس کے فرائض منصبی سے خوش ہو کر ایک ہاتھی انعام مین عطا کیا تھا، بعض سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے اودے پور کے رانا کے پاس بھی بھیجا گیا، اسی زمانہ مین چہار چمن لکھکر نوروز کے موقع پر سرہند مین بادشاہ کی خدمت مین گذرانی، اس مین برہمن کے ذاتی احوال و کوائف کے علاوہ شاہی دربار کے مختلف جشنون، اس کی شان و شوکت، بادشاہ کے روزانہ معمولات اور شاہجہان آباد اور دوسرے شہرون اور صوبون کا ذکر ہے، دارا شکوہ برہمن کی نظم و نثر دونون کا مداح تھا، اس لیے اس کو اپنا میر منشی مقرر کیا، دارا جب قندھار کی مہم پر گیا تو برہمن بھی اس کے ساتھ تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامی سعد اللہ خان کی وفات کے بعد برہمن پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا اور دفتر شاہی کا میر منشی مقرر ہوا، اور رائے کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا، عالمگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس کی تخت نشینی پر یہ رباعی کہی،

شاہا عالم مطیع فرمان تو باد — بر ذرہ ادائے شکر احسان تو باد

چون ذات تو خلق را نگہبان باشد — ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

برہمن دارا کا حامی تھا، اس لیے ایک خط مین برہمن نے اورنگ زیب سے یہ شعر لکھکر اپنے قصورون کی معافی مانگی،

شنیدم پیر بعصیان چشم آن دارم — کہ جرم را بجوانان پارسا بخشد

[۱] کلام برہمن ص ۱۸۳

عالمگیر کے زمانہ میں وہ جہانگیر کے مقبرہ کی نگرانی کے لیے مامور کیا گیا تھا[۱]، برہمن صاحب دیوان بھی تھا، اور دارا سے اپنی شاعری کا خراج تحسین برابر حاصل کرتا رہا، شاہی دربار کی حوصلہ افزائی کی بنا پر برہمن نے اپنا دیوان ایران بھیج کر وہاں کے ارباب فن سے بھی داد طلب کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اپنے دیوان کے کچھ نسخے بھی وہاں بھجوائے، مگر ایرانی جب ہندوستان کے بڑے بڑے ارباب کمال کی ستایش کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے تو برہمن کو کب خاطر میں لا سکتے تھے لیکن خوشگو نے کلمات الشعرا میں اس کی تعریف کی ہے،

"طبعی درست داشت، شعر بطور قدما شستہ و صاف می گفت و سلیقہ انشا پردازی نیز داشت، در ہندوان غنیمت بود۔"

غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد اور ید بیضا میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، مرآۃ الخیال کے مولف نے برہمن کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں، مگر اس کی یہ غزل پسند کی ہے:

کنم ز سادہ دلی بند دیدہ مژگان را — بہ مشت خس نتوان بست راہ طوفان را
جگر فشان شدم باز جلوہ آن دارد — کہ لالہ زار کنم دامن و گریبان را
ہمیشہ زلف ترا اضطراب در کار است — چگونہ جمع کند خاطر پریشان را
شبے خیال تو آمد بخواب و آسودیم — دگر ز ہم نکشادیم چشم گریان را
برہمن از تو سخن بے دلیل می خواہم — کہ اعتبار نباشد دلیل و برہان را

منشآت برہمن جو چندر بھان کے رقعات کا مجموعہ ہے، عرصہ دراز تک مدارس میں زیر درس رہی اور یہ اس کی نثر نگاری کی مقبولیت کی دلیل تھی، اس کی اور تصانیف کے نام یہ ہیں، گلدستہ، تحفۃ الانوار، کارنامہ، تحفۃ الفصحا، مجمع الفقرا اور تحفۃ الوداد،

---

[۱] اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۵ء

اکبر و جہانگیر کی طرح شاہجہان بھی ہندو اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۴۱ھ مین ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی تو اس کو دو ہزار روپیے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا،[1] ہندی شعرا مین سندر اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا، اس کی تصانیف سندر سنگار، اور سنگھاسن بتیسی برج بھاشا مین مشہور ہین، ہندی کے مشہور شعرا چنتامنی اور راجہ شمبھو ناتھ سنگھ بھی اس کے دربار سے منسلک رہے، چنتامنی سہتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہجہان کی فرمائش پر کوند اکلب لتا لکھی، اس کتاب مین شاہ جہان، دارا شکوہ اور جہان آرا پر مدحیہ نظمین ہین،[2] ایک بار یمین الدولہ نے ترہت کے دو برہمنون کو دربار مین پیش کر کے عرض کیا کہ یہ دونون دس ہندی کبتین جو دس شاعرون نے تازہ کہی ہون اور کسی نے نہ سنی ہون ایک بار سنکر یاد کر لیتے ہین اور اسی وزن اور مضمون مین دس شعر فی البدیہہ کہہ دیتے ہین، امتحان ہوا تو سچ ثابت ہوا، شاہجہان نے دونون کو خلعت اور ہزار ہزار روپیے انعام دیے،[3]

امرا، | امرا جب کسی عہدۂ جلیلہ پر مامور کئے جاتے تو اس کا خیال رکھا جاتا تھا، کہ وہ نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے پختہ کار اور بیدار مغز ہون بلکہ مختلف علوم و فنون میں بھی ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہو، شاہجہان کے خسر یمین الدولہ خانخانان **آصف خان** سپہ سالار کو ہر قسم کے علوم خصوصاً معقولات مین بڑی ادرک حاصل تھا، اس کے القاب کا جزء "شعلہ افروز فطرت اشراقیان دانش آموز طبیعت مشائیان" تھا، خوش بیان، خوش نویس اور اعلیٰ قسم کا سیاق دان بھی تھا،[4]

شاہ جہان کے دیوان کل **افضل خان** علامی شکر اللہ شیرازی کا شمار جید علما مین کیا گیا ہے، جب وہ دیوان کل کے عہدہ پر فائز ہوا، تو کسی نے تاریخ کہی، ع شد فلاطون وزیر اسکندر ۱۰۳۱ھ

---

[1] خافی خان ج ۱ ص ۴۰۶، [2] کیئی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، [3] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۲۶۹،

[4] مآثر الامرا جلد اول ص ۱۵۸،

معقولات، منقولات، ہیئت، ہندسہ اور حساب میں اس کی اعلیٰ قابلیت مشہور تھی، فصاحت میں حسان وقت کہلاتا تھا، شاہ جہان کہا کرتا تھا کہ افضل خان کی زبان سے کسی نے کوئی برا کلمہ نہیں سنا[1]

سعد اللہ خان کو عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں علامۃ الوریٰ اور فہامۃ العصر لکھتا ہے وہ معقولات و منقولات کا ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھا، اس کی تقریر کی فصاحت اور تحریر کی بلاغت کی بھی بڑی شہرت تھی، دربار میں پہنچکر اس نے جس طرح رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اس کا ذکر عمل صالح میں اس طرح ہے۔

رمضان ۱۰۵۰ھ میں موسوی خان صدر کل کی سفارش سے بادشاہ کے حضور میں (سعد اللہ خان نے) شرفیابی حاصل کی پہلی مجلس ہی میں بادشاہ کی کمال شناسی اور قدر دانی کی وجہ سے اس کی استعداد کا مرتبہ نمایاں ہوگیا، اور بادشاہ کی دقیقہ رسی کے باعث اس کا کمال ظاہر ہوا، اس کی (یعنی سعد اللہ خان کی) دقت طبع، جدت فہم، کثرت فراست، استنباط دقائق، دریافت حقائق، اور تحصیل علم وہبی وکسبی وغیرہ کا حال اہل علم پر ظاہر ہوگیا، چونکہ بادشاہ شریعت کی ترویج، اکابر دین کی تقویت، علما و صلحا کی تعظیم و تکریم، طلبہ کی تربیت و اہتمام میں ہمیشہ رغبت ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کی خاص مہربانی کی وجہ سے جس میں آب حیات کی خاصیت ہے اس نے (یعنی سعد اللہ خان نے) حیات جاودانی پائی، مناسب روزینہ خلعت اور گھوڑے سے سرفراز ہوکر ملازمان شاہی کے زمرہ میں منسلک ہوا، اور بادشاہ کے حسن تربیت اور اس کی مہربانی کی برکت سے ایک سال میں ایک ہزار دو سو سوار کا منصب خان کا خطاب، عرض مکرر کی خدمت اور غسل خانہ کی داروغگی کا عہدہ عطا ہوا، روز بروز اس کا

[1] مآثر الامرا جلد اول ص۱۱ و بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ دوم ص۳۳۹ و ج ۲ ص۵۵

اقبال بڑھتا گیا، بادشاہ کی نظر عنایت نے اس کی ذاتی استعداد کی مدد کی، اور اس کی سعادت کا ستارہ قابلیت اور اقبال کے مشرق سے کمال کے مطلع پر نکلا، رفتہ رفتہ بادشاہ کی خاص مہربانی سے اس نے اس قدر ترقی کی کہ دوسرے سال تین ہزار منصب، دو ہزار سوار اور خانسامانی کی خدمت سے سربلند ہو کر انجمن میں ہمدم و دمساز اور خلوت میں محرم و ہمراز ہو گیا، اور چوتھے سال بادشاہ کے فیض تربیت سے اس کے اقبال کا درخت طوبی کی طرح بڑھکر ہندوستان کی وزارت کے باغ کا زینت ہوا، اور ساتویں سال ہفت ہزاری ہفت سوار پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب اور دس کرور دام کا انعام، اور علامی و فہامی کا خطاب ملا۔"

(جلد دوم ص ۳۳۷، ترجمہ آزاد ہے)

محمد امین میر جملہ بہترین شاعر بھی تھا، امیر الامراء علی مردان خان کے دربار کی علم پروری مشہور تھی، نواب قاسم خان، ظفر خان احسن، عنایت خان آشنا، اور مرزا امان اللہ امانی کا ذکر پہلے آچکا ہے،

فضلاء | ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ان کے بارہ میں آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں:

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور اس زمانہ کے لوگوں کے لیے موجب افتخار ہیں یقیناً تمام درسی علوم میں ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا، اور کمیت و کیفیت اور حسن قبول میں استفدر علمی یادگاریں انکی طرح کسی نے دنیا میں نہیں چھوڑیں، سیالکوٹ جو لاہور کے ملحقات میں ہے ان کا مولد ہے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، جب ان کے سن شعور کا زمانہ ہوا تو طالب العلمی شروع کی، اور زیادہ تر ملا کمال الدین کشمیری سے جو سیالکوٹ میں رہتے تھے فیض حاصل کیا، اور تھوڑی سی مدت میں بدر کامل ہو کر چمکے اور دنیا کو اپنے علمی فیوض و برکات سے بھر دیا، جہانگیر کے زمانے میں ضروری معاش پر قناعت کرکے اپنے

وطن ہی مین زندگی بسر کی لیکن جب شاہ جہان کا زمانہ آیا اور علما و شعرا کی گرم بازاری ہوئی تو وہ اس کے دربار مین حاضر ہوئے، اور جب جب دربار مین باریابی حاصل کرتے تھے صلۂ گران پاتے تھے، دو مرتبہ روپے مین تولے گئے اور وزن مین جس قدر روپیہ چڑھا ان کو مل گیا،[1] اور چند گاؤن بطور جاگیر کے انعام مین پائے، اب وہ نہایت اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے وطن مین مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے علم کی اشاعت کرنے لگے، اونکی تصنیفات عرب و عجم مین پھیلی ہوئی ہین، اور وہ یہ ہین، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ تنقید تلویح، حاشیہ مطول، حاشیہ شریفیہ، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح عقائد تفتازانی، حاشیہ حاشیہ خیالی، حاشیہ شرح شمسیہ، حاشیہ حاشیہ عبدالغفور، تکملہ حاشیہ عبدالغفور، حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی، درہ ثمینہ در اثبات واجب تعالی، حواشی در کنار حکمۃ العین، حواشی در کنار شرح ہدایہ حکمت، حواشی در کنار مراح الارواح، ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ مین وفات پائی، اور سیالکوٹ مین مدفون ہین" (مآثر الکرام دفتر اول ص۲۰۳)

ملا محمد فاضل، بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کر کے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب "عدالت اردوئے کیہان" سے وابستہ ہوئے، آخر عمر مین درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، شاہجہان کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا، (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری ص۳۴۳ ج ۱ حصہ دوم)

عبدالسلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ مین مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیساتھ منسلک رہتے تھے،

قاضی محمد اسلم، ہرات مین پیدا ہوئے، مگر کابل مین سکونت اختیار کی، خراسان کے مشہور

---

[1] مزید تائید کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۴۱

بزرگ مولانا خواجہ کوہی کی نسل سے تھے، جہانگیر کے عہد مین لاہور آئے، اور یہان شیخ بہلول کے حلقۂ درس مین شریک ہوئے، پھر اکبر آباد پہنچے، اپنے عزیز مولانا میر کلان محدث (نبیرہ مولانا خواجہ کاہی) کی وساطت سے جہانگیر کے دربار مین باریابی حاصل کی، جہانگیر نے ان کی دین داری اور پرہیزگاری سے متاثر ہو کر، کابل کا منصب قضا تفویض کیا، اس کے بعد جہانگیر ہی کے عہد مین شاہی لشکر کے قاضی ہوئے، شاہجہان نے ان کو اپنے زمانہ مین بھی اسی عہدہ پر مامور رکھا، اور منصب ہزاری عطا کیا، اس خدمت کو ۵۵ سال تک انجام دیتے رہے، شاہجہان ان کی بڑی قدر کرتا تھا، اس نے اپنا امام خاص بھی بنایا تھا، سنہ ۱۰۵۰ھ مین ان کو روپیے مین تلوایا، جو وزن مین ساڑھے چھ ہزار تھے، ایک بار گھوڑے سے گر گئے، تو چار مہینے صاحب فراش رہے، شفا پائی تو کابل گئے، شاہجہان نے دس ہزار روپیے انعام مین دیے، سنہ ۱۰۶۱ھ مین وفات پائی، مزار لاہور مین واقع ہے، ان کے لڑکے میر محمد زاہد بھی جید عالم تھے، شاہجہان نے کابل مین واقعہ نویس کے عہدہ پر مامور کیا، عالمگیر کے زمانہ مین شاہی لشکر کے محتسب رہے، پھر کابل کی صدارت تفویض کی گئی، سنہ ۱۱۰۱ھ مین کابل مین عالم جاودانی کو سدھارے، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح تہذیب علامہ دوانی، حاشیہ تصور و تصدیق ملا قطب الدین رازی، اور حاشیہ شرح ہیاکل ان کی تصانیف ہین ان کی ایک اور تالیف رسالہ میر زاہد معقولات مین درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے، (مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۷-۹ و بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۴)

قاضی محمد سعید کرہرودی، کچھ دنون تک داروغہ داغ رہے، پھر عرض مکرر کی خدمت انجام دی، آخر مین بیوتات کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے، پھر مکہ معظمہ گئے، وہان سے

کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، تو شاہجہان نے دارا شکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔

ملا عبد اللطیف سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق میں یگانۂ روزگار تھے، دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے مقرر تھے، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہان نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیے، اور اجازت دی کہ وطن جاکر علوم دینیہ کا درس دیں،

میر محمد ہاشم گیلانی، منقولات، معقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، بارہ سال حرمین شریفین میں رہ کر تعلیم پائی، منقولات میں شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبد الرحیم حسانی اور ملا علی نہرم ملا عصام الدین کے شاگرد تھے، اور معقولات میں میر نصیر الدین حسین اور مرزا ابراہیم ہمدانی سے تحصیل کی، طب حکیم علی گیلانی سے پڑھی، شاہجہان نے ان کی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی صدارت "بالنیابت" کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگ زیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہان کے نام معنون کیا،

شیخ محمد، اکبری عہد کے مشہور طبیب حکیم الملک کے پوتے تھے، مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے وہاں سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، پرہیزگاری، نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہان نے انھیں دار السلطنت کا میر عدل مقرر کیا،[1]

ملا فرید دہلوی، یمین الدولہ آصف خان کے حسن اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجموں کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جس کا نام زیچ شاہجہانی رکھا، اس میں زیچ الغ بیگ کے بعض مسامحات بھی دکھائے گئے ہیں، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی، تو اس نے عام استفادہ کی خاطر ہندوستان کی زبان میں ترجمہ کے لیے حکم دیا،[2]

---

[1] مذکورہ بالا علماء کے حالات کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۲ از عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۶ - ۳۴۹،

[2] عمل صالح ج ۱ ص ۳۶۱،

میر محمد صالح مشکین قلم، میر عبد اللہ زرین رقم کا لڑکا تھا، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی، شاہجہان نے چند ورق دیکھے، تو بہت پسند کی، پانچ ہزار روپے اور ایک ہاتھی انعام مین دیا،[۱]

اس عہد کے اور دوسرے علما و مشائخ کے نام یہ ہین، شیخ عبد الحق دہلوی، ملا یوسف، ملا عبد السلام لاہوری، مولانا محب علی، سید محمد رضوی، میان میر، سید جلال خواجہ خاوند محمود، خواجہ اسحٰق وہبی حجازی، ملا شاہ بدخشی، ملا خواجہ، شیخ بلاول قادری، شیخ پیر، میر حسام الدین بدخشی، شیخ ابو المعالی اور شیخ ناظر، ان کے فیوض و برکات کا ذکر عبد الحمید لاہوری کی تاریخ بادشاہنامہ جلد اول حصہ دوم مین ملے گا،

مورخین شاہان مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق تھا، اس لیے ہر حکمران کے دورِ حکومت مین تاریخ نویسی کا باضابطہ محکمہ قائم تھا، شاہجہان نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کے لیے متعدد اہل قلم کی خدمات حاصل کین، چنانچہ اس کی فرمائش سے جو تاریخین مرتب ہوئین وہ مندرجۂ ذیل ہین،

۱۔ بادشاہنامہ از محمد امین قزوینی،

۲۔ بادشاہنامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳۔ بادشاہنامہ از محمد وارث،

۴۔ شاہجہان نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین بن ابو الحسین قزوینی ایران سے آکر پانچوین سنہ جلوس مین شاہجہانی دربار مین منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہان اپنے دربار کے تاریخ نویسون کے کام سے خوش نہین تھا، وہ ایک لائق اہل قلم کی تلاش مین تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ

---

[۱] خافی خان جلد اول ص ۴۰۵،

حالات لکھکر پیش کیے، شاہجہان اس کی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۵ھ یعنی ۹ سنہ جلوس میں قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اس کی پیدایش سے ابتک اس عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کیے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا، عمل صالح میں اسکی فضیلت و قابلیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"مرزا امینا در اصطلاحات زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فن انشا را بقانون می شناسد، شاہد سخنش از لباس تکلف مبرا است و صاحب طبع و ذہن مستقیم و فکر رسا، سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود و بعد ازان بخدمت جمع وقائع می پرداخت مردے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود"

عبدالحمید لاہوری، عبدالحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابوالفضل کا شاگرد تھا، اس لیے اسی کے طرز انشا میں لکھنے کی مہارت پیدا کی لیکن زمانہ کی نامساعدت سے پٹنہ[1] میں آکر عزلت نشین ہوگیا تھا، اس کے ادب و انشا کی خبر شاہجہان کو ملی، تو اس نے اس کو دربار میں طلب کیا، شاہجہان چاہتا تھا کہ ابوالفضل کی "اکبرنامہ" کے طرز پر اس کی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ اسی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے عبدالحمید کو تاریخ نویسی کے لیے مامور کیا، عبدالحمید خود لکھتا ہے:-

"بوسیلۂ بعضی از ملازمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبدالحمید لاہوری المولد والمنشا، کہ دل رمیدہ را از اختلاط این و آن و خاطر شوریدہ را از ارتباط فلان و

[1] ایلیٹ ج ۷ ص ۳، برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۲۵۹ [2] ایلیٹ پٹنہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہے، لیکن اورینٹل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگ نے صاف طور سے بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھہ ہے، پٹنہ کاتب اور پڑھنے کی غلطی ہے، ملاحظہ ہو کیٹلاگ ج ۷ ص ۲۷

یہان، و اپرداختہ در معمورہ پٹنہ بزاویۂ تنہائی، و بمقولۂ بے نوائی در ساختہ است، روش سخن پردازی و طراز انشا طرازی شیخ ابوالفضل نیک فرا گرفتہ، اگر نگارش معالی و مکارم این دولت والا و گذارش محامد و مآثر این سلطنت دست بالا، بدو باز گذاشتہ آید، آئینہ این نامۂ منیف و این تصنیف شریف بیشبہ کہ در خاطر دور بین صواب گزین مرکوز است نگاشتہ بود۔"[1]

تصنیف شاہجہان کی بیس سال کی حکومت کی تاریخ عمل صالح کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہجہان اس کی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اس کو روپے مین تلوا کر انعام عطا کیا۔[2]

محمد وارث، آخر مین کبر سنی اور ضعف کے سبب عبدالحمید اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، اسلیے اسکے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعد اللہ خان دیکھتے تھے، بعد علاء الملک طونی المخاطب بہ فاضل خان جو شاہجہانی عہد مین خانسامان کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ مین وزیر ہوا، اس پر نظر ثانی کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا۔[3]

مرزا جلالا طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۶ھ مین آیا، شاہجہان کے مورخین مین داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ دشمنون نے اس کے خلاف سازش کی، اور وہ اس خدمت سے محروم کردیا گیا "نگارش فتح کانگڑہ" اسی کے نتائج قلم کا نتیجہ ہے، اس مین شاہجہان کی شاہزادہ فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر مین چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے۔[4]

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۱۰ [2] عمل صالح [3] ایضاً ج ۳ ص ۱۲۱ [4] اس عہد کی اور بھی متعدد تاریخیں ہیں مثلاً محمد صالح کی عمل صالح جو چھپ چکی ہے، اور محمد صادق خان کی شاہجہان نامہ، انگریزون نے دونون کا ترجمہ کیا ہے مگر ان کا چونکہ کوئی تعلق شاہی دربار سے نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کتاب مین ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا۔

خوشنویس | تیموریون نے اپنے دور مین فن خطاطی کو بھی بڑی ترقی دی، اکبری عہد کے خطاطون کا ذکر کیا جا چکا ہے، جہانگیر کو مصوری کے ساتھ اس فن سے بھی گہری دلچسپی تھی اور اس نے اپنے تمام لڑکون کو اس کی خاص طور پر تعلیم دلائی، شہزادہ خسرو کی خوش خطی مشہور تھی، سلطان پرویز کلام اللہ کی کتابت مین اکثر مشغول رہتا، خود شاہجہان خط نستعلیق کا بڑا ماہر تھا، اس کی سرپرستی مین سید علی خان الحسینی جواہر رقم، عبدالباقی حداد یاقوت رقم، محمد مراد شیرین قلم، میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم، ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری، مقصود علی، میر محمد کاشی، حافظ عبدالرحمٰن رشیدائی، عبداللہ، شکر اللہ، محمد معیم، محمد جعفر، کفایت خان، درایت خان، محمد اکبر اور محمد موسیٰ نے نستعلیق تعلیق، نسخ اور شکستہ لکھنے مین بڑا کمال پیدا کیا، شاہجہان میر عماد الحسینی قزوینی کی خطاطی کا بڑا دلدادہ تھا، میر عماد ہندوستان نہین آیا، لیکن شاہجہان کی خدمت مین جب کوئی اس کی خطاطی کا کوئی نمونہ نذر کرتا، تو شاہجہان اس کو انعام مین یکصدی منصب عطا کرتا تھا، عبدالرشید دیلمی میر عماد کا بھانجہ اور شاگرد بھی تھا، وہ ہندوستان آیا تو دارا کا استاد مقرر ہوا، جس کے بعد اس نے دربار مین بڑا رسوخ حاصل کیا، تذکرۂ خوشنویسان کے مولف نے اس کو ملک خطاطی کا پیغمبر کہا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ فن اسی کے ساتھ ختم ہو گیا، اس کے ممتاز شاگردون مین داراشکوہ کے علاوہ، محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدای اشرف، عبدالرحمٰن اور میر حاجی وغیرہ تھے،[1]

کتب خانہ | شاہی کتب خانہ کا داروغہ بعض اوقات خوشنویسون ہی مین سے مقرر ہوتا تھا، چنانچہ ۱۰۵۶ھ تک اس خدمت کو عبدالرحمٰن رشیدائی نے انجام دیا تھا، اس کے بعد میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم اس عہدہ پر متعین ہوا،[2]

درسگاہین | ان درسگاہون کو جو اکبر و جہانگیر اور ان کے امرا نے قائم کین شاہجہان

---

[1] تذکرہ خوشنویسان ص ۹۰-۱۰۵ ؛ [2] شاہجہان نامہ ص ۵۰۵ ج ۲

نے نہ صرف یہ کہ ان کو بجنسہ قائم رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے جوار میں اس نے ایک مدرسہ دارالبقا نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول ومنقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے[1]

اس مدرسہ کا فیض عرصہ تک جاری رہا، کچھ عرصہ کے بعد اس کی عمارتیں مرمت طلب ہو گئیں، تو صدرالدین خان بہادر صدرالصدور شاہجہان آباد نے ایک کثیر رقم خرچ کر کے از سر نو تعمیر کرائیں، اور وہاں کے طلبہ کے کھانے اور کپڑے کے اخراجات خود ہی برداشت کیے۔

[1] آثار الصنادید از سید احمد خان باب تیسرا ص ۱۲



عالمگیر

جسمانی ہمت اور جفاکشی کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی
مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا، اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات،
معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا، بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف
اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا، اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں
سے محبت کرتا رہا، اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں، جن کو اس نے
اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا، تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں
کر سکتے، کہ وہ ایک مشغول حکمران ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور
مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گذارتا، اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ،
احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا،
اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ
وہ ہمیشہ اپنے ایک خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی
کے علاوہ وہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی
کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ
فتاویٰ عالمگیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام سے منسوب ہے اور جس
نے اس کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا۔

ملاحظہ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار

یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سوانح نگار کے ہیں جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور مستحق خیز مقصد قرار دیا ہے، مگر اورنگ زیب کے علمی کمالات کے لیے مذکورہ بالا تعریفی کلمات بادل ناخواستہ شاید اس لیے لکھ دیے گئے ہیں کہ اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر فرمانروا کے آفتاب علم پر خاک ڈالنے کی کوشش بے سود ہوتی،

اورنگ زیب کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، جن ارباب علم وکمال سے اس نے فیض حاصل کیا، ان کے نام یہ ہیں:-

مولانا عبد اللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعد اللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبد القوی، دانشمند خان،[۱]

مولانا عبد اللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، اور علامی سعد اللہ کا ذکر پہلے آچکا ہے مولانا عبد اللطیف کے بارے میں اورنگ زیب کہا کرتا تھا کہ میرے تمام استادوں میں ان کا حق زیادہ ہے، کیونکہ وہ میری تعلیم میں کسی قسم کی مداہنت اور تساہل کو راہ نہ دیتے تھے،[۲]

ملا موہن کا اصلی نام محی الدین تھا، قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، نو سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا، حضرت شاہ عبید بن بہرہ شیخ وجیہ الدین گجراتی سے شرف بیعت حاصل کیا، شاہجہان کے دربار سے منسلک ہوئے، تو اورنگ زیب کی تعلیم کی بھی خدمت ان کے سپرد ہوئی، ۱۰۷۶ھ میں ۷۴ سال کی عمر میں وطن ہی میں وفات پائی،

۱؎ اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اور اساتذہ پر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے سابق رفیق دار المصنفین (حال پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی) نے مقدمہ رقعات عالمگیر (سلسلہ دار المصنفین) میں نہایت فاضلانہ [illegible] کیا ہے،

۲؎ مرآۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین، ورق ۱۹۳

مولانا سید محمد قنوجی ریاضی اور ادب کے ماہر تھے، عالمگیر نے امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم ان ہی سے پڑھی، تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بھی عالمگیر نے ان سے استفادہ جاری رکھا، اور ہفتہ میں تین روز اس کے یہاں علمی مجلس ہوتی جس میں مولانا محمد قنوجی ضرور شرکت کرتے، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں بھی وہ شریک رہے[1] ۱۰۹۰ھ میں وہ اجمیر جاکر عالمگیر سے ملے تھے، اس کا ذکر مآثر عالمگیری کا مؤلف اس طرح کرتا ہے:-

"بیس محرم کو جامع الکمالات میر محمد قنوجی تخنگاہ سے آستانۂ شاہی پر حاضر ہوئے، اور شرف یابی سے شادکام ہوکر ایک ہزار روپیہ دو خوان میوہ کے عطیات سے سرفراز ہوئے"[2]

عالمگیر اپنے بعض اہم خانگی کام ان ہی کی نگرانی میں انجام دلاتا تھا، مثلاً شاہجہاں کی تجہیز و تکفین شاہی غسل خانہ میں ہوئی، تو وہ بھی موجود رہے، شاہزادہ محمد اعظم کا نکاح ان ہی کی وکالت میں انجام پایا[3] ان کے لڑکے سید احمد خان کو عالمگیر نے محتسب کے عہدہ پر مامور کیا تھا،[4]

ملا جیون ان کا اصلی نام شیخ احمد تھا، صدیقی تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، کلام پاک حفظ کرکے اپنے عہد کے تمام ممتاز علماء سے تعلیم پائی، ملا لطف اللہ کوڑہ جہان آبادی سے فاتحۂ فراغ پڑھا، حافظہ بڑا قوی رکھتے تھے، ایک بار کوئی قصیدہ سن لیتے تو وہ پورا یاد ہوجاتا درس کی کتابوں کی عبارت بغیر دیکھے پڑھتے، عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اس نے ان سے بہت سی کتابیں پڑھیں، اور پھر زندگی بھر ان کا احترام کرتا رہا، ان سے اسی طرح ادب سے پیش آتا جس طرح بچے باپ سے پیش آتے ہیں، ملا صاحب کے بھولے پن اور عالمگیر کی سعادت مندانہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۴، [2] مآثر عالمگیری ص ۱۴۵ اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ [3] ایضاً ص ۳۷، ۵۲-
[4] ایضاً ص ۶۵،

اطاعت گذاری کے قصے اور لطیفے آج بھی مجلسون مین بیان کئے جاتے ہین، ملا صاحب کی پوری عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف مین گذری، حرمین شریفین کی زیارت کو گئے تو مدینہ مین ربیع الاول ۱۱۰۸ھ مین منار کی شرح نور الانوار کے نام سے لکھنی شروع کی، رجادی الاول ۱۱۰۵ھ کو یہ شرح ختم کی، اور کسی کتاب سے مدد نہ لی، ان کی تفسیر احمدی آجتک مشہور ہے، ۱۱۳۰ھ مین دہلی مین وفات پائی، مگر امیٹھی مین دفن ہین[1]

شیخ عبد القوی برہان پوری اپنے علم وفضل، سچائی اور سلامت روی کے لیے مشہور تھے، اس لیے اورنگ زیب کے استاد مقرر ہوئے، اورنگ زیب نے جب زمام سلطنت سنبھالی تو ان کو ہزار و پانصدی[2] کا منصب عطا کیا، اور اس کے مقرب خاص رہے، وہ ان کو اخوند کہا کرتا تھا، اور خلوت مین بلاکر ان کے مشورون سے مستفید ہوتا تھا، اسی لیے جلوس کے چوتھے سال اعتماد خان کا بھی خطاب دیا، تفسیر کے عالم ہونے کے علاوہ شرعی احکام [illegible] فقہی جزئیات کا بھی بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب مین بھی بہت سخت تھے، حضرت سرمد کی برہنگی کا سوال اٹھا تو عالمگیر نے ان ہی کو حضرت سرمد سے بازپرس کرنے کا حکم دیا، اور جب وہ ان کے سامنے لائے گئے، تو اپنی برہنگی کی وجہ یہ بتائی کہ شیطان قوی ہے اور پھر یہ رباعی پڑھی

خوش بالائے کردہ چنین پست مرا	چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش	دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

شیخ عبد القوی مطمئن نہین ہوئے، مزید یہ کہ حضرت سرمد کی حسب ذیل رباعی سے ان کو انکار معراج کا بھی مجرم قرار دیا،

---

[1] تذکرہ علمائے ہندی ص۱۴۸ [2] مراۃ العالم مین ہے کہ دو ہزار و پانصدی کا منصب ملا (ورق ۲۹۷)

آن کو سر حقیقتش یاور شد　　خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بفلک　　سرمد گوید فلک با حمد در شد

اور اس کے بعد دوسرے فقہا کی رائے لیکر حضرت سرمد کے قتل کا حکم صادر کیا

شیخ عبدالقوی ایک جاسوس کے جرم کی تفتیش کے سلسلہ میں قتل ہوئے تو عالمگیر اپنے محبوب استاد کی موت پر بڑا متاسف اور دلگیر ہوا، ان کی اولاد کو اپنی نوازشوں سے سرفراز کرتا رہا[1]

دانشمند خان خطاب، نام ملا شفیعائی، اور وطن یزد تھا، ایران میں معقولات ومنقولات کی تعلیم پاکر تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آئے، مگر تجارت کرنے کے بجائے شاہی فوج سے منسلک ہوگئے، لیکن اس ملازمت سے بددل ہوکر وطن واپس جانے لگے، شاہجہان کے مقربین نے ان کی استعداد ولیاقت کا ذکر اس سے کیا، تو اس نے فوراً شاہی فرمان بھیجکر ان کو دربار میں طلب کیا، وہ سورت پہنچ چکے تھے لیکن شاہی حکم پاکر لوٹے، دربار میں پہنچے تو شاہجہان نے ان کی لیاقت کو جانچنا چاہا، ایک روز علمی مجلس منعقد کرائی، جس میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور پر مدعو کیے گئے، شاہجہان کی فرمائش سے ملا شفیعائی یزدی اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی میں علمی مذاکرہ شروع ہوا، بادشاہ نے علامی سعد اللہ کو حکم مقرر کیا، بحث ایاک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر پر تھی، ملا عبدالحکیم اور ملا شفیعائی نے اہم نکتے بیان کیے، اور جب بحث ختم ہوئی تو علامی سعد اللہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس کا علم زیادہ گہرا اور وسیع ہے، شاہجہان ملا شفیعائی کی فصاحت گفتار سے خوش ہوا اور شاہی ملازمین کے زمرہ میں داخل کر لیا، وہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے میر بخشی کے عہدہ پر مامور ہوئے، اور دانشمند خان کے خطاب اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۲۹ - ۲۲۷، مرآۃ العالم ورق ۲۹۸

نے سرفراز کئے گئے۔ شاہجہان کے آخری زمانہ حکومت میں کسی سبب سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جب اورنگ زیب تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو پھر شاہی لطف و کرم سے نوازے گئے۔ میر بخشی اور مختلف عہدوں کی خدمت ان کے سپرد ہوتی رہی، پنجہزاری منصب بھی عطا ہوا۔ فرحت الناظرین میں ہے کہ عالمگیر بادشاہ ہونے کے بعد بھی ان سے خاص خاص کتابیں پڑھا کرتا تھا، امام غزالی کی احیاء العلوم ان ہی سے آخر تک پڑھی۔ دانشمند خان کے بارے میں مآثر الامراء میں ہے:

"امیر موصوف اپنے زمانہ کے بڑے فضلاء میں سے تھے، نیک نفسی اور نیک اندیشی میں مشہور تھے۔ ان کے بعد اب تک ایسے لوگوں میں جنھوں نے فضیلت اور امارت کو ایک ساتھ جمع کر لیا تھا کوئی ان کے درجہ کا نہیں پیدا ہوا۔[۵]

۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔

اورنگ زیب کو علوم دینیہ سے فطری رغبت تھی۔ لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھا۔ عالمگیر نامہ میں ہے:

از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ و حاوی گشتہ تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عزیز و فقہ شریف حنفیہ است۔ از بس بمارست در اتب شرعیہ و استکشاف عقائد اصلیہ و مسائل شرعیہ اشتغال ورزیدہ اند، فوت حافظۂ اشرف، مخزن این حقائق شدہ و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چون احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر و رسائل و مولفات علمائے باطن و ظاہری بمطالعہ ہمایون

---

[۵] مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۲ - ۳۰ نیز دیکھو مراۃ العالم قلمی ورق ۲۹۰، داقتباس فرحۃ الناظرین، لاہور ص ۸۱

رسید مل ..... عضلات وکشف اسرار آن فرمودہ اند وبالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت وسروری تمہید مراسم دین پروری ومعدلت گستری باین شرائف اشتغال پیوستگی دارند[1]

اسی چیز کو مآثر عالمگیری کا مصنف ان مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے،

قبلہ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ وتفسیر وحدیث کی تحصیل ہے، جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے منظومات اور شیخ زین الدین وقطب الدین محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا، اور یہ کتابیں اکثر مطالعے میں رہتی تھیں[2]

اورنگ زیب حافظِ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت تیموری بادشاہوں میں صرف اسی کو حاصل تھی، اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا جب وہ اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں تھا، اور یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی ۱۰۷۱ھ میں حفظ کرنا شروع کیا، اور ۱۰۷۲ھ میں ختم کیا، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى سے ابتدا کی اور لوحِ محفوظ سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا:

تو حامیٔ شرع و حامی تو شارع ۔۔۔ تو حافظِ قرآن و خدا حافظ تو[3]

مآثر عالمگیری میں ہے:۔

حضرت کے فضائل میں سب سے اہم وعظیم الشان امر حفظ قرآن مجید کی سعادت ہے، اگرچہ ابتدا ہی سے قبلۂ عالم کو اکثر سورتیں قرآن مجید کی حفظ تھیں، لیکن تمام وکمال کلام پاک کے حفظ سے بعد جلوس بہرہ اندوز ہوئے، حضرت کو قرآن پاک بہت اچھا

---

[1] عالمگیر نامہ ص۱۰۹۸، [2] مآثر عالمگیری ص۵۳۰، [3] عالمگیر نامہ ص۱۰۹۲ و مرآۃ العالم قلمی نسخہ۔

یاد تھا، اور اس امر مین بے حد اہتمام فرماتے تھے کہ کلام الٰہی کو نہایت صحت کے ساتھ لکھین، قصۂ عالم کے شروع حفظ کی تاریخ خود قرآن کریم کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ہے، اور ختم کلام مجید کا سنہ لَوحِ محفوظ کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے، (۱۰۸۴ھ)

اورنگ زیب فن خطاطی مین ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اس نے سید علی خان الحسینی جواہر رقم[1] اور عبد الباقی حداد (عبد اللہ) سے سیکھا، چنانچہ اسکو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے مین کامل مہارت تھی، منشی کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے :-

از رتبۂ خط و حسن تحریر آن شہنشاہ فلاطون فطنت سکندر نظیر کہ صفحات روزگار و اوراق دفاتر لیل و نہار از ان زینت پذیر است خامہ نکتہ پرداز جادو فن را چہ یارائے دم زدن بقدرت کلک بدائع آثار معنی استادی و سحر نگاری راجنان بر کرسی نشانیدہ اند کہ دست استادان اقلیم سبعہ خط بدان نتوانند رسید و بر شجرۂ فیض انامل در بار نہال موزون قلم را در خوشنویسی شاخ دیگر بخشیدہ کہ یکتایان صنعت خط از تتبع آن شیوہ جز خجلت ثمری نتوانستہ چید، خط نسخ آن حضرت کہ رقم نسخ خط یاقوت و صیرفی تواند بود، در غایت پختگی و مزہ و متانت و اسلوب است و کمال قدرت در نوشتن آن دارند، و اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتابت کلام اللہ از ضمائم عبادات و کرائم عادات آن شہنشاہ دین پناہ است ...... خط نستعلیق آنحضرت بے شائبہ اطرای مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دران رتبہ است کہ قطعہائے کہ در عین ایام ذوق و سرگرمی مشق قلم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہائے خوب استادان کہ عمر گرانمایہ صرف تحصیل آن سرمایہ ساختہ بتکمیل امرے دیگر نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبصر مشتبہ می شود، و شکستہ نستعلیق در غایت مفرداری و صفا متانت و پختگی می نویسند[2]،

[1] تاریخ خوشنویسان سنہ ۵۵ : [2] ایضاً ۱۲۵، [3] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۲-۱۰۹۳

مآثر عالمگیری میں ہے:

"قبلۂ عالم خط نستعلیق و شکستہ بھی بہت خوب لکھتے تھے، ان خطوط میں حضرت کو کمال حاصل تھا"[۱]

بختاور خان مرآۃ العالم میں لکھتا ہے:

"در نوشتن اقسام خطوط مہارت اندوختہ"

اورنگ زیب نے خطاطی کا فن محض ذاتی زیب و زینت کے لیے نہیں سیکھا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے حصول سعادت دین کے ساتھ ساتھ کسب معاش دنیا بھی کیا کرتا تھا، وہ فرصت کے اوقات میں عموماً صبح کو پانچ بجے سے سات بجے تک اور سہ پہر کو ۲ بجے سے ۴ بجے تک کلام مجید کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا جس کا سلسلہ اس نے ایام شہزادگی سے لے کر آخر عمر تک جاری رکھا، عالمگیر نامہ میں ہے: (ص۱۰۹۲)

"شہزادگی کے زمانہ میں بہت سے مخطوطات اور قلم خلیفہ کے ساتھ ایک مصحف مکہ کو بھیجا تاکہ وہاں اس کی تلاوت ہو، تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد تا بہ مشاغل کی کثرت کے باوجود مصحف کی کتابت اور عبادات و وظائف کے لیے کچھ وقت الگ کر لیا تھا، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اور مصحف کی تکمیل کی، ان دو مصحفوں کے علاوہ پنج سورہ اور دوسری قرآنی سورتیں بھی لکھیں۔ (یہ عبارت اصل کی تلخیص ہے)

مآثر عالمگیری میں ہے کہ عالمگیر نے دو مصحف مدینہ منورہ بھیجے:

قبلۂ عالم خط نسخ نہایت خوب تحریر فرماتے تھے، اور اس کی کتابت پر حضرت کو خاص قدرت حاصل تھی، جہاں پناہ نے دو قرآن مجید اپنے قلم خاص سے تحریر فرما کر مبلغ سات ہزار روپے ان کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت میں صرف فرمائے

۱؎ مآثر عالمگیری ص۵۳۲ و مرآۃ العالم

دونوں نسخے مدینہ منورہ میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ہدیۃً رکھے گئے[1]،

اورنگزیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ایک نسخہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی ملکیت میں ہے، دوسرا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دیوانی حیدرآباد کے پاس ہے، تیسرا نواب صاحب مانگرول کے پاس ہے، جس کا عکس جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے شائع بھی کردیا ہے، مگر یہ نسخہ مشکوک ہے، ایک پنج سورہ وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے[2]،

اور عبرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ملک اور سب سے بڑی مملکت کے شہنشاہ نے کلام پاک کے انہی نسخوں کے ہدیہ کی رقموں کو اپنی آخرت کی نجات کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے:

"چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد آیا بیگ محلدار است بگیرند، و صرف کفن این بیچارہ نمایند، و سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در حرف خاص است، روز وفات بفقرا دہند"[3]

عالمگیر نے سلوک و طریقت کی بھی تعلیم پائی، اس سلسلہ میں وہ حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعلیمات سے متاثر تھا، اسی لیے ان کے فرزند ارجمند حضرت محمد معصوم قدس سرہ کے رشد و ہدایت سے مستفید ہوتا رہا[4]، عہد اکبری میں بعض علمائے سوء کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے عام مسلمان اسلامی شعائر

---

[1] مرآۃ العالم میں ہے: "و دو قرآن مجید بخط خاص اقدس بصورت ترتیب پذیرفتہ، و مبلغ ہفت ہزار روپیہ بر لوح و جدول آن صرف شدہ، بہ اماکن شریفہ ترسیل یافتہ" [2] تفصیلات کے لیے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف ندوی دیباچہ، [3] احکام عالمگیری ص۱۳، طبع ثانی، بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی

[4] خزینۃ الاصفیا ص،

سے بیگانہ ہوکر کفر وضلالت کی طرف مائل ہو گئے تھے، ان کی زندگی بدعت، شرک اور زندقیت سے ملوث ہو گئی تھی، بعض صوفیہ نے اپنے کو نیدگان دین کہکر طریقت و معرفت کے نام سے تصوف کی ایسی تعلیم دی تھی جس سے شریعت کے تمام قوانین نظر انداز کر دیے گئے تھے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے علم جہاد بلند کرکے اسلام اور پیروان اسلام کی زندگی کو مشرکانہ رسوم، ملحدانہ عقائد، اور غیر شرعی رجحانات سے پاک وصاف کیا، اور ایک بار پھر کتاب وسنت کے احکام کی تجدید کی، ان کی تعلیم تھی کہ ہر مسلمان خواہ وہ بادشاہ ہو یا ادنی رعایا، عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، عارف ہو یا سالک، اپنے عقائد کو کتاب وسنت کے مطابق صحیح کرے[1]، اور کتاب وسنت سے جو علوم مستفاد ہیں ان میں سے وہی معتبر ہیں جن کو بزرگان نے سمجھا اور اخذ کیا ہے، ورنہ ہر بدعتی اور ہر گمراہ اپنے عقائد فاسدہ کی بنیاد کتاب وسنت ہی پر رکھتا ہے، پس قرآن وحدیث سے جو شخص جو معنے سمجھے وہ سب معتبر نہیں ہیں[2]، اعتقاد صحیح وہی ہے جس کو علمائے اہل سنت نے کتاب وسنت اور آثار سامنے سے سمجھا ہو، اگر بالفرض کشف والہام سے جمہور علما کے خلاف کسی نص کے معنے معلوم ہوں تو اس کا اعتبار نہیں بلکہ اس سے پناہ مانگنا چاہیے[3]، نجات ابدی اور فلاح سرمدی اسی میں ہے کہ ان ہی علما کا تتبع کیا جائے جنھوں نے صحابہ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمہ ہدایت سے فیض اٹھایا ہے، بعض عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، مگر جو عارف ایسا سمجھتا ہے وہ جاہل ہے، عبادت کی حقیقی ضرورت عارفوں کو ہے مبتدیوں کو اس کے دسویں حصہ کی بھی حاجت نہیں[4]، شریعت کی پابندی کے بغیر اعمال کی اصلاح قلب کی سلامتی ممکن ہے جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے وہ ملحد ہے، اگر اس کو کچھ باطنی

---

[1] مکتوب ۱۹۳ دفتر اول [2] مکتوب ۱۹۳ [3] مکتوب ۲۸۶ دفتر اول، [4] مکتوب ۲۶۷ دفتر اول

احوال حاصل ہون تو وہ اس کے حق مین استدراج ہے، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہین تو ایسے تمام علوم کو حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے[1] طریقۂ سنت سے ہٹ کر جو ریاضتین اور مجاہدے لوگ کرتے ہین، ان کا کچھ وزن و اعتبار نہین، ایسی ریاضتین تو یونان کے فلسفی اور ہندوستان کے برہمن اور جوگی بھی کرتے ہین، لیکن ان کو گمراہی اور خسارہ کے سوا کچھ حاصل نہین ہوتا،[2] نامشروع طریقون سے جو احوال وکیفیات مترتب ہون وہ استدراج ہین، احکام شرعیہ کے اثبات مین صرف کتاب و سنت کا اعتبار ہے، اور قیاس و اجماع امت بھی مثبت احکام ہین، ان چار ادلہ شرعیہ کے بعد کوئی ایسی دلیل نہین جس سے احکام ثابت ہون[3]

ہم نے حضرت مجدد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا بہت سرسری خاکہ پیش کیا ہے، عالمگیر نے ان تعلیمات کی تمام جزئیات کا خود بھی مطالعہ کیا تھا، پھر حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کی بیعت اس کے حق مین سونے پہ سہاگہ ثابت ہوئی، وہ عالم دین اور حافظ قرآن تو پہلے ہی سے تھا پھر حامی دین اور پابند شریعت بننے مین اس کو کیا دیر لگ سکتی تھی، ہندوستان کے اس مسلمان بادشاہ کی جو قلمی تصویر ماثر عالمگیری کے مولف نے پیش کی ہے اس کو ہم ہو بہو ہدیہ ناظرین کرتے ہین:

حضرت خلد مکان اپنی فطری سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی احکام وشعائر کے بے حد پابند تھے، قبلۂ عالم حنفی المذہب سنی تھے، اور اسلامی فرائض خمسہ کی پابندی اور نیز ان کے اجرا مین بے حد کوشان رہتے تھے، حضرت ہمیشہ باوضو رہتے، اور کلمۂ طیبہ اور نیز دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پر جاری رہتے تھے، نماز اول وقت مسجد مین جماعت کے ساتھ ادا فرماتے، اور تمام سنن و نوافل کو بے حد خلوص وحضور قلب سے

---

[1] مکتوب نمبر ۳۰ دفتر اول [2] مکتوب نمبر ۲۱ [3] مکتوب نمبر ۵۵

ادا فرماتے تھے، ایام بیض کے روزون کے بے حد پابند تھے، اور ہفتے مین دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے، جمعہ کی نماز بھی مسجد مین تمام مسلمانون کے ساتھ ادا فرماتے مقدس شب ہاے اسلامی مین بیداری و عبادت مین بسر فرماتے، اور انوار فیض الٰہی سے جو فارغ دین دولت ہو کر اپنی دینی شعاع سے اہل علم کو منور فرماتے تھے،

قبلۂ عالم حق طلبی کے شیدائی تھے، حضرت کا معمول تھا کہ دولت خانے کی مسجد مین تمام رات اہل اللہ کے ساتھ سرگرم گفتگو و ذکر رہتے، اور خلوت مین کبھی تکیہ و مسند پر جلوہ افروز نہ فرماتے تھے،

زکوٰۃ شرعی ادا کرنے مین خاص اہتمام فرماتے اور قبل جلوس جو زکوٰۃ اپنی ضروریات زندگی کے حساب مین سے ادا فرماتے، اس کے علاوہ عہد حکومت مین مصارف ذاتی کے لیے جو چند مواضع خاص فرمائے تھے، ان کی زکوٰۃ بھی خود ادا فرماتے، اور اولاد امجاد کو بھی تاکید فرماتے کہ نصاب زکوٰۃ کامل طور پر ادا فرمائین،

رمضان کا مقدس مہینہ اداے صوم و پابندی سنن و تراویح وغیرہ عبادت دینی مین بسر ہوتا تھا، ماہ صیام مین دو پہر رات گذرنے پر بیدار اور علماء و اولیا کے ساتھ ذکر و عبادت مین مشغول رہتے تھے،

رمضان کے آخر عشرے مین مسجد مین اعتکاف فرماتے، حج بیت اللہ جس کے ادا کرنے کے بے حد مشتاق و گرویدہ تھے، اگرچہ بظاہر تو ادا نہ فرما سکے، لیکن اس کا کافی تدارک فرماتے اور حجاج کے ساتھ جو خاص رعایتین کی جاتی تھین، ان کو نگاہ مین رکھنے کے بعد یہ امر یقینی ہے کہ خلد مکان ہر سال حج کبریٰ کا ثواب حاصل فرما لیتے تھے،

آپ نے عہد معدلت مین ہر سال، اور کبھی کبھی دوسرے اور تیسرے سال کے بعد حرمین شریفین

کے زائرین و مجاورین کے لیے رقم کثیر ارسال فرماتے، اور حجاج کا ایک گروہ کثیر بادشاہ کی نیابت مین طواف حج و سلام رسانی وغیرہ خدمات عبادت مین ہمیشہ مصروف رہتا ....

حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی ذات پاک تمام صفات حسنہ کی جامع تھی، قبلۂ عالم نے ابتدائے سن تمیز سے تمام مکروہات و محرمات سے شدید پرہیز فرمایا، اور منکوحہ عورتون کے سوا کسی غیر محرم کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا،

بارگاہ شاہی مین نغمہ و سرود کے کامل استاد ہر وقت موجود رہتے اور باکمال سازندے اور اہل نشاط کا ایک گروہ دربار مین ہر وقت حاضر رہتا تھا، لیکن قبلۂ عالم اس طرف بہت کم توجہ فرماتے تھے، ابتدائے عہد معدلت مین تو کبھی کبھی نغمہ و سرود سن بھی لیتے تھے، لیکن آخر مین اس سے بالکل تائب ہو گئے تھے، ارباب نشاط کے گروہ مین سے جو شخص ہمیشہ سرود سے توبہ کر لیتا، حضرت اس کو مدد معاش کے طور پر کچھ جاگیر عطا فرماتے تھے، مرزا مکرم خان صفوی نے جو فن موسیقی کا بہترین ماہر تھا، قبلۂ عالم سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کی بابت حضرت کی کیا رائے ہے؟ قبلۂ عالم نے فرمایا کہ جو اس کے اہل ہین ان کے لیے حلال ہے، مرزا نے عرض کیا کہ پھر حضرت اہل ہونے کے باوجود کیون اس سے پرہیز فرماتے ہین، قبلۂ عالم نے جواب دیا کہ تمام راگ راگنیان بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج کے مزہ نہین دیتین اور مزامیر بالاتفاق حرام ہین، حرمت مزامیر کی وجہ سے مین نے نفس سرود سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی،

حضرت نے کبھی غیر مشروع لباس زیب تن نہین فرمایا، اور چاندی اور سونے کے برتنون کے استعمال سے ہمیشہ پرہیز فرماتے رہے،

بادشاہ دین پناہ کی مجلس مین کبھی غیبت و کذب کا چرچا نہین ہوا اور حاضرین

دربار کو حکم تھا کہ اگر کسی شخص کا عیب بیان کرنا ناگزیر ہو جائے تو اس کو ایسے مناسب الفاظ میں بیان کریں کہ گفتگو عیب جوئی میں نہ داخل ہونے پائے....

بادشاہ رعیت نواز نے کبھی کوئی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا جو رفاہ عام کے منافی ہو اور کبھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہوئے جو مخلوق خدا کی پریشانی کا باعث ہوا ہو، زنان بازاری اور دیگر فواحش کے شیدائی دارالحکومت سے خارج کر دیے گئے تھے، اور تمام ممالک محروسہ میں اسی قسم کے احکام جاری تھے، احتساب کا محکمہ قائم تھا، اور عاملان احتساب ہر شخص سے بازپرس کرتے تھے، اور تمام ممالک محروسہ میں سلطنت کی وسعت کے باوصف احکام شرعی جاری و نافذ تھے،

قبلۂ عالم نے کبھی اپنے نفس سے مغلوب ہو کر محض ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے کسی فرد کو قتل نہیں کرایا، اور نہ کسی غیر کو اس سنگین جرم کے ارتکاب کی ہمت ہوئی، جہان پناہ اپنی قدر دانی و پایہ شناسی سے سادات علماء و اولیاء کی تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور اس طرح اپنے فیض باطن سے بہترین طریقے پر اہل عالم کی رہنمائی کا فریضہ ادا فرماتے تھے،

غرض کہ حضرت کے عہد معدلت میں دین متین کا آوازہ بلند ہوا، اور جس طرح ملک ہندوستان میں شریعت اسلامی کا کامل لحاظ رکھا گیا، اس کی نظیر فرمانروایان سابق کے کارناموں میں قطعاً معدوم ہے" (۸۵-۳۸۲)

کتاب و سنت کے احکام کی احیاء و ترویج کے لیے عالمگیر نے **فتاوی عالمگیری** کی تدوین کرائی، جس کو اس کے حربی فتوحات ہی کی طرح ایک عظیم الشان کارنامہ کہا جا سکتا ہے، اس نے اپنے زمانہ حکومت میں محسوس کیا کہ حنفی مذہب کے فقہی مسائل مخلوط طور پر تمام کتابوں

مین پھیلے ہوئے ہین، کہین ایک جگہ مرقوم نہین، اور کوئی خاص کتاب جو تمام مسائل پر حاوی ہو، موجود نہین، اسلیے جب کوئی فقہی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو اس پر فتوی دینے کے لیے تمام کتابون کی چھان بین کرنی پڑتی تھی، جو ایک دشوار طلب اور صبرآزما کام تھا، انہی مشکلات کا لحاظ کرکے عالمگیر نے تمام ہندوستان کے ممتاز علمار کے ایک گروہ سے فرمایش کی کہ فقہ کی تمام کتابون سے مفتی بہ مسائل کا انتخاب کرکے ایک کتاب تیار کرین، عالمگیرنامہ کا مولف اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ مین لکھتا ہے:

چونکہ بادشاہ سلامت کو اس کا خاص خیال ہے کہ تمام مسلمان ان دینی مسائل پر عمل کرین جن کو حنفی مذہب کے علمار دا کابر واجب العمل سمجھتے ہین، لیکن یہ مسائل فقہ اور فتاوے کی کتابون مین فقہار وعلمار کے اختلاف کی وجہ سے روایات ضعیفہ اور اقوال مختلفہ سے مل جل گئے ہین، اور اسی کے ساتھ وہ کسی ایک کتاب مین موجود بھی نہین ہین اور جب تک مبسوط کتابین جمع نہ کی جائین اور ایک شخص کو احکام علم فقہ مین کامل مہارت حاصل نہ ہو، وہ مفتی بہ مسئلہ کو ان سے اخذ نہین کرسکتا، اس لیے بادشاہ سلامت کے دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ پایہ تخت کے علمار کی ایک جماعت شاہی کتبخانہ کی اُن فقہی کتابون کو جو ایک مدت مین تمام اطراف عالم سے جمع کی گئی ہین سامنے رکھکر نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان مسائل کو ایک کتاب مین جمع کرین تاکہ ہر شخص اس کتاب سے مسئلہ مفتی بہا کو آسانی سے معلوم کرسکے اور اسلام کے قاضی اور مفتی بہت سی کتابون کے جمع کرنے اور پڑھنے سے بے نیاز ہوجائین، اس کام کی ذمہ داری اور اس کا اہتمام شیخ نظام کے سپرد کیا گیا کہ تمام علمار کے اتفاق رائے سے ان مسائل کو ایک کتاب مین جمع کرین، علمار و فضلار کا ایک گروہ جو پایہ تخت مین موجود تھا،

اس کام مین مشغول ہوا، اور ہندوستان کے اطراف مین جو شخص علم فقہ مین شہرت اور کمال رکھتا تھا شاہی فرمان کے روسے طلب کرکے ان کا شریک کار بنایا گیا، اور یہ تمام علما، وفضلا معقول وظیفہ کے ساتھ اس کام مین مشغول ہو گئے، اور اس کام کیلیے جن کتابون کی ضرورت تھی وہ شاہی کتب خانہ سے ان لوگون کے حوالے کی گیئن، اور ہر سال اس کام کے اسٹاف کے لیے ایک بہت بڑی رقم خزانہ شاہی سے صرف کی جاتی تھی کہ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو دنیا تمام فقہی کتابون سے بے نیاز ہو جائیگی اور اس کا ثواب بادشاہ سلامت کے نامہ اعمال مین درج ہوگا، (ص ۱۰۸۷)

فتاویٰ عالمگیری مصر مین چھ جلدون مین چھپ گئی ہے، ہر جلد مین تقریباً پانچسو صفحے ہون گے، اس مین فقہی مسائل کے استنباط کے سلسلہ مین جن کتابون اور انکے ماخذ سے مدد لی گئی ہے، ان کے نام اتنے کثیر ہین کہ ان کو گنایا نہین جا سکتا ہے، اور یہ تمام کتابین شاہی کتب خانہ مین موجود تھین، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتب خانہ مین مذہبی علوم وفنون کا ذخیرہ کس قدر وسیع تھا، علما کے وظائف مین بھی کثیر رقم خرچ ہوئی، آٹھ سال کی مدت مین جب یہ کتاب تیار ہوئی تو اس پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے، مآثر عالمگیری کے مولف کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب نے علما، وطلبہ کو تمام کتب فقہ سے بے نیاز کر دیا" اور آج بھی اسلامی فقہ پر اس سے زیادہ مفصل، واضح، اور مبسوط کتاب کوئی اور نہین ہے

فتاویٰ عالمگیری کی تدوین وترتیب کا نظام بہت ہی باضابطہ تھا، تمام فقہی ابواب مختلف حصون مین تقسیم کر دیے گئے تھے، ہر حصہ کے لیے ایک صدر اور اس کے معاونین ہوتے تھے، تمام علما کے گروہ کی صدارت **شیخ نظام** برہان پوری کو تفویض کی گئی، شیخ صاحب عالمگیر کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے چالیس سال تک اس کے ساتھ رہے،

عالمگیر کے دل میں ان کے تبحر علمی کی وجہ سے انکی بڑی عزت اور وقعت تھی، وہ خلوت میں بلا کر ان سے احیاء العلوم پر مذاکرہ کرتا تھا، شاہزادہ سلطان کا عقد راجہ کشتوار کی لڑکی سے ان ہی نے پڑھایا، اور جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو شاہی حکم کے بموجب ان ہی نے شاہزادہ کو حضرت قطب الاولیاء خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں پیوند خاک کیا[1]، دربار میں ان کے لیے کورنش و تسلیم کی کوئی پابندی نہ تھی[2]، فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و جمع کے زمانہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ ہفتے میں تین روز کچھ حصہ عالمگیر کو پڑھ کر سناتے تھے، عالمگیر کی نظر میں جب کوئی مسئلہ کھٹکتا تو اس پر شیخ صاحب سے بحث و تمحیص کرتا[3]، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین اور دوسری خدمات کے سلسلہ میں عالمگیر نے شیخ صاحب کو غیر معمولی شاہانہ الطاف و اکرام سے نوازا، مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ ۱۰۹۶ھ میں قبلۂ عالم نے شیخ نظام کو مقرب خان سے سرفراز فرما کر شش ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب عطا فرمایا اور خلعت خاص و شمشیر و خنجر مروارید، سپر مرصع و علم و نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور تیس عربی و عراقی گھوڑے اور دو ہاتھی بھی مرحمت کئے" (ص ۳۰۹)۔ عالمگیر شیخ صاحب کے لڑکوں کو بھی اپنی نوازشوں سے سرفراز کرتا رہا، شیخ داؤد، شیخ ملک منور اور شیخ عبد اللہ کو خطابات اور چار ہزاری مناصب عطا کئے، (ص ۲۰۹)۔ اور شیخ ابو الخیر کو داروغہ جائے نماز مقرر کیا (ص ۱۹۷)، شیخ عبد اللہ کچھ دنوں داروغۂ دواخانہ بھی رہے (ص ۱۸۰)

اورنگ زیب کے استاد مولانا میر محمد قنوجی بھی فتاویٰ کی ترتیب میں شریک رہے، ان کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، تقریباً پچاس علماء نے اس عظیم الشان کو اختتام تک پہنچایا،

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۱۰۹، ۱۰۰۔ [2] مراۃ العالم ورق ۲۹۷ [3] مراۃ العالم ورق ۲۹۷، و انفاس العارفین مرتبہ شاہ ولی اللہ صاحب (ص ۱۸۲) میں ہے کہ شیخ صاحب اس کام کیلئے روزانہ عالمگیر کی خدمت میں جاتے تھے،

ان مین سے بعض مشاہیر کا ہم اجمالی طور پر ذکر کرتے ہین[۱]

ملا محمد جمیل، جون پور مین ۱۰۵۵ھ مین پیدا ہوئے، ان کے دادا ملا شمس تھریا اور والد ملا عبدالجلیل اور دو چچا ملا صادق اور ملا خلیل اپنے عہد کے مشاہیر فضلا مین سے تھے، ملا جمیل بھی اپنے صوری فضائل اور باطنی کمالات کی وجہ سے اپنے زمانہ مین بہت مشہور ہوئے، دہلی کے تمام علما، ان کے علم و استعداد کے معترف تھے، اسی لیے فتاوی عالمگیری کی ترتیب مین شریک کیے گئے، مطول، شرح جامی کے ایک باب عطف، اور دوسری کتابون پر حاشیے لکھے، فقہ مین ایک رسالہ تحریر کیا، تصوف مین تنبیہات کے نام سے انکی ایک تصنیف ہے،

قاضی محمد حسین جونپوری، شاہجہان کے زمانہ مین جونپور کے قاضی تھے، عالمگیر نے ان کو منصب عطا کر کے الہ آباد کا قاضی مقرر کیا، ساتوین سنہ جلوس مین شاہی فوج کے محتسب کے عہدہ پر مامور ہوئے، مراۃ العالم کے مؤلف کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے احکام دینیہ کی بہت ترویج ہوئی، عالمگیر ان کے علم و فضل سے متاثر تھا، اسی لیے فتاوی عالمگیری کی تدوین مین ان کا حصہ بھی رہا، مراۃ العالم مین ہے، (ورق ۲۰)

یعنی از فتاوی عالمگیر شاہی باہتمام او زینت اتمام یافت،

عالمگیر کے تیرہوین سنہ جلوس مین وفات پائی،

ملا حامد جونپوری، میر محمد زاہد اور دانشمند خان کے شاگرد تھے، عالمگیر کے دربار مین شہزادہ اکبر کی تعلیم و تربیت ان ہی کے ذمہ تھی، مراۃ العالم کے مولف کا بیان ہے کہ

[۱] ہمارے ادارہ کے رفیق حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی نے معارف [illegible] و [illegible] اور [illegible] کے متعدد نمبرون مین "مولفین فتاوی عالمگیری" کے عنوان سے ایک مبسوط اور مفید مقالہ لکھا ہے، اس سلسلہ مین ملک کے اور اہل قلم نے بھی بعض مفید معلومات فراہم کیے ہین، ہم نے ان سے بہت مدد لی ہے،

فتاوی عالمگیری کی ترتیب وتالیف میں شریک رہے، (ورق ۳۰۱) شاہ ولی اللہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم صاحب فتاوی کی تصحیح میں ملا حامد کے معاونین میں تھے، شاہ صاحب اپنے علم وفضل، عبادت، ریاضت، زہد، تقوی اور تورع کے لحاظ سے ہندوستان کے مایۂ ناز علما میں سے گذرے ہیں، انہی کے خاندان سے علمی وروحانی فیوض وبرکات کا سرچشمہ پھوٹا ہے، جس سے آج تک ہندوستان کے ارباب علم اور اصحاب دل سیراب ہو رہے ہیں، ملا حامد شاہ صاحب کے ہمدرس رہ چکے تھے، اس لیے فتاوی کی تدوین میں ان کی معاونت بھی چاہی، اور مالی معاوضہ کی بھی امید دلائی، شاہ صاحب شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے، مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاوی کی ترتیب میں شریک ہو گئے لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابو القاسم نے دربار سے یہ تعلق کسی حال میں بھی پسند نہیں کیا، اور جب شاہ صاحب کا دربار سے قطع تعلق ہو گیا تو عالمگیر نے کچھ زمین دینی چاہی لیکن اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، عالمگیر ان سے ملنے کا برابر مشتاق رہتا، مگر شاہ صاحب بادشاہوں اور امرا کے گھر جانا اپنے روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک مخلص کے ذریعہ شوق ملاقات کا پیام بھیجا، مگر وہ عالمگیر کے دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے، بلکہ ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کا جوتا لپٹا ہوا رکھا تھا یہ عبارت لکھ کر شہنشاہ ہندوستان کے پاس بھیجدی،

اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیر کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالی فرماتا ہے وَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا إِلَّا قَلِيلٌ یعنی دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے تم کو قلیل ترین چیز ملا ہے، اگر بالفرض مجھے دو گے تو وہ جزء لایتجزی ہوگا، اس ٹکڑے کے لیے جو پھر ٹکڑا نہ ہوسکے گا، میں اپنے نام کو خدا تعالی کے دفتر سے کیوں کٹواؤں

چشت کے بعض ملفوظات مین مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر مین لکھ لیا جاتا ہے،

حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے (انفاس العارفین ص۶۹)

شاہ ولی اللہ صاحب اس خط کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہین کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا، تو اس نے اپنی جیب مین رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو اپنی جیب مین رکھ لیتا، فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا،

شیخ وجیہ الدین گوپاموی اپنی تحریر کی دلکشی، تقریر کی دلآویزی، ذہانت کی تیزی اور ضمیر کی صفائی کے لحاظ سے ممتاز عالم سمجھے جاتے تھے، پہلے داراشکوہ کے ساتھ رہے، داراشکوہ کی موت کے بعد عزلت نشینی اختیار کر لی، مگر جوہر شناس عالمگیر نے ان کو دربار مین بلا کر منصب عطا کیا، فتاویٰ کا ربع حصہ ان ہی کی نگرانی مین تالیف کیا گیا، دس فضلاء ان کی مدد و اعانت کے لیے مامور تھے، مراۃ العالم کے مولف نے اس سلسلہ مین ان کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

درترتیب وتالیف ربع از فتاویٰ عالمگیر شاہی مامور شد، و دہ کس دیگر از فضلا بمد د واعانت او متقرر شدند او ودرآن کار مساعی جمیلہ بکار بردہ (ورق ۱۰۳)،

عالمگیر کے چودہوین سنہ جلوس مین وفات پائی،

شیخ رضی الدین، مآثر عالمگیری مین ہے:-

شیخ رضی الدین بھاگلپور بہار کے شرفا مین تھے، یہ فاضل مولفین فتاویٰ عالمگیری مین شامل تھے، اور تین روپیہ یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی، شیخ رضی الدین علاوہ ایک فاضل متبحر ہونے کے فن سپاہ گری مین کامل تھے، اور بہادری دلیری وغیرہ کمالات مین بھی ان کو کافی دستگاہ تھی، حضور پر نو

کے محتسب قاضی محمد حسین مقرب درگاہ مسمی بختاور خان نے ان کے کمالات وہمہ گیر قابلیت سے قبلہ عالم کو آگاہ کیا، بادشاہ ہنر پرور نے ان کو ایک صدی منصب داد مقرر فرمایا، رفتہ رفتہ حسین علی خان کی اعانت وامداد اور اپنی سلیقہ شعاری سے رتبہ امارت وخانی پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔" (ص۹۶)

اور دوسرے علما، جو فتاویٰ کی ترتیب، تدوین اور تصحیح میں عالمگیری دربار سے وابستہ رہے، ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں، سید علی اکبر سعد اللہ خان، سید نظام الدین ٹھٹھوی، جلال الدین محمد، مولانا محمد شفیع، ملا وجیہ الرب، مولانا محمد فائق ملا محمد اکرم، ملا محمد غوث، امیر میران علامہ ابو الفرح معروف بہ سید معدن، ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہور، اور قاضی سید عنایت اللہ مونگیری وغیرہ۔

عالمگیر نے فتاویٰ کا فارسی ترجمہ بھی کرایا، اور یہ کام مولانا چلپی عبد اللہ رومی نے انجام دیا، ان کے بارہ میں مراۃ العالم میں ہے:-

"چلپی عبد اللہ رومی علوم ظاہری اور معارف باطنی سے بہرہ ور ہیں، صوفیہ کی مصطلحات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، عربی، فارسی اور ترکی عبارت خوب لکھتے ہیں، اور اکثر فنون میں یگانہ اور بے مثل ہیں، تصوف اور حکمت میں ان کی اچھی تصنیفات ہیں، فردوس آشیانی کے عہد میں روم سے ہندوستان آئے، فقیرانہ زندگی کے عادی تھے، علامی سعد اللہ خان ان کی ضروریات پوری کرتے تھے، اس عہد (یعنی عہد عالمگیری) میں ان کو روزانہ وظیفہ ملتا ہے، ان کے لیے نوکری معاف کر دی گئی ہے، فتاویٰ عالمگیر شاہی کے ترجمہ پر مامور ہیں۔" (ورق ۱۰۰)

یہ فارسی ترجمہ شاید مقبول نہیں ہوا، اسی لیے اس کا کوئی نسخہ پایا نہیں جاتا،

اور دوسرے علما،

فتاویٰ عالمگیری کی جامعیت اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمگیر کا عہد باکمال علماء و فضلا کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، ان مولفین فتاویٰ کے علاوہ علوم و فنون کے اور مسند نشینون نے بھی شاہی دربار کو زینت بخشی، جن مین سے کچھ اور کا ذکر یہان پر درج کیا جاتا ہے،

ملا محمد یعقوب، اپنے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور فطرت عالی کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، درس و تدریس کے سلسلہ مین بہت سی کتابون پر حواشی لکھے، تفسیر بیضاوی پر بھی حاشیہ تحریر کیا، اس حاشیہ کے متعلق مراۃ العالم کا مولف لکھتا ہے:-

> درین اوقات بر تفسیر قاضی بیضاوی حاشیہ مرقوم نمود کہ اہل استعداد و ارباب فہم را از حواشی دیگر مستغنی گردانیدہ و تحقیقات ارجمند و تدقیقات بلند درآن مندرج ساختہ، (ورق ۳۰۰)،

ان کے علم و فضل اور ذہانت و راستبازی سے متاثر ہو کر عالمگیر نے ان کو میر عدل مقرر کیا تھا،

شیخ سلیمان منیری، معقولات و منقولات کے جید عالم تھے، عالمگیر کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے عزت و حرمت کے ساتھ اس کے دربار سے وابستہ رہے، اپنی بادشاہت کے عہد مین عالمگیر نے ان کو داروغہ اردوئے معلی کے عہدہ پر فائز کیا، وہ ان مین دو مرتبہ ملک کے لاتعداد مستغیثون اور دادخواہون کو شاہی خدمت مین پیش کرکے ان کے حالات عرض کرتے، اور مظلومون کے حقوق دلاتے، دیانتدار ہونے کے علاوہ نہایت بردبار خلیق اور خندہ جبین تھے، فریادیون کے ہجوم، دادخواہون کے اژدحام، ان کے شور واو

نرم وگرم گفتگو سے کبیدہ نہیں ہوتے تھے، ان کا معاصر مراۃ العالم کا مولف رقمطراز ہے کہ کمزوروں اور غریبوں کی درخواستوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں، اور دوارو غگی کی خدمت کو حسن وخوبی سے بجالاتے ہیں، کثرت مشاغل کے باوجود رات کو طلبہ کو درس بھی دیتے ہیں

شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی، مراۃ العالم کے مصنف کا بیان ہے کہ وہ عقلی و نقلی علوم کے کمال، ذکاوت وذہانت، اصابت رائے، فصاحت اور خوش بیانی میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، اپنے والد مولانا عبدالرشید سے جو اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں تھے تحصیل علم کی، اور عنفوان شباب ہی میں درس وتدریس میں مشغول ہو گئے تھے، جو ذ سنہ جلوس میں عالمگیر اکبر آباد گیا، تو دربار میں شیخ عبدالعزیز کا تذکرہ آیا، اور ان کی بعض تحریریں اس کی نگاہ سے گذریں، اس نے بڑے اشتیاق اور لطف سے شیخ صاحب کو دربار میں بلایا، اور الطاف خسروانہ سے عرض مکرر کے منصب پر مامور کیا، شاہی دربار میں اشراف کو اور ائمہ مین کے جو خطوط آتے تھے ان کے جواب کی خدمت ان کے سپرد تھی، عربی فارسی انشاء میں یگانہ عصر سمجھے جاتے تھے، متداول کتابوں پر جو انشی بھی لکھے، جس سے اہل علم ان کی قوت فکر اور جودت طبع کے معترف ہوئے، عربی، فارسی اور ہندی میں شعر بھی کہتے تھے، ان کے اشعار آبدار کی رنگینی اور مضمون آفرینی کی تعریف مراۃ العالم میں کی گئی ہے، (ورق ۳۰۰)

ملا قطب ہانسی، ملتان کے نواح کے رہنے والے اور شیخ عبداللطیف برہانپوری کے مخصوص مریدوں میں سے تھے، عالمگیر کی شہزادگی کے زمانہ میں برہانپور میں اس سے ملے، اور اسی وقت سے گہرے تعلقات قائم ہوگئے، عالمگیر جب تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ دام پیش کئے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام

سے موسوم کیا، اس گاؤں کا نام قطب آباد رکھا گیا۔[۱]

شیخ قطب برہانپوری، متورع، عابد اور زاہد ہونے کے علاوہ حافظ قرآن تھے، عالمگیر رمضان المبارک میں ان ہی کی امامت میں تراویح پڑھا کرتا تھا، ان کو عربی اشعار بھی بہت زیادہ یاد تھے، کچھ دنوں شہزادہ محمد اعظم کے استاد بھی رہے۔[۲]

ملا عوض وجیہ، مآثر عالمگیری میں ہے:۔

ملا عوض اخیسیکت کے باشندے تھے، یہ مقام مضافات سمرقند میں داخل ہے، ملا عوض وجیہ میر عوض تاشکندی کے حلقۂ درس کے بہترین طالب العلم تھے جو اپنے تمام ہم سبق طلبہ پر سبقت لے گئے، ملائے مرحوم نے ایک مدت تک بلخ میں درس دیا، اور حضرت فردوس آشیانی کے عہد معدلت میں ۱۳ جلوس شاہجہانی میں اعلیٰ حضرت کی فضیلت پناہ بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت فردوس آشیانی نے ملا عوض وجیہ کو مفتی لشکر کے عہدہ پر مقرر فرمایا، عہد مبارک عالمگیری میں ملا عوض محتسب لشکر مقرر فرمائے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ ملا عوض نے بے حد اتقا و پرہیزگاری کے ساتھ احکام شرع کی پابندی کی، اور عوام کو اس راہ پر قائم رکھنے و نیز بدعات کا قلع قمع کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا، اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ ملائے مرحوم کے ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا، ملا نے خدمت احتساب سے علیحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی، اور ان کے فیض کمال کا ہر صاحب علم کو اعتراف ہے" (ص ۱۰۶)، ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی،

ملا عبد اللہ سیالکوٹی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے تھے، مآثر عالمگیری کے

[۱] مرأۃ العالم ورق ۱۰۳۱، [۲] ایضاً ص ۱۰۳۱

مولف کا بیان ہے کہ علاوہ عالم و فاضل ہونے کے صاحب عرفان بھی تھے، اور اپنے اخلاق و اعمال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے، عالمگیر نے ان کے اوصاف سنے تو ان سے ملنے کا مشتاق ہوا، چنانچہ ۱۰۸۰ھ میں حسن ابدال سے پیام شوق ملاقات لکھ بھیجا، اور جب عالمگیر لاہور پہنچا تو ملا عبداللہ بھی لاہور تشریف لائے، عالمگیر ان سے مل کر بہت محظوظ ہوا، خلعت خاص دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی دے کر وطن رخصت کیا، آخر عمر میں ملا صاحب فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے تھے، ۱۰۹۳ھ میں عالمگیر کو اجمیر کے قیام کے زمانہ میں ملا صاحب کی عسرت کی خبر ملی، تو اس نے ملا صاحب کو عہدۂ صدارت پر مامور کرنا چاہا، مگر اس بے نیاز عارف نے یہ کہلا بھیجا کہ "اب زمان فراق ہے نہ کہ وقت تحصیل شہرۂ آفاق"، عالمگیر کو ملا صاحب کا جواب بے حد پسند آیا، اجمیر میں ملا صاحب عالمگیر سے ملنے آئے، اور پھر وطن جا کر رحلت فرمائی، مآثر عالمگیری کے مولف کا لکھنا ہے کہ "شہریار فاضل نواز اور معارف پرور کو ملا مرحوم کی وفات کی خبر ملی، تو ان کے چار لڑکوں اور بیوی کے لیے خلعت تعزیت ارسال کیا اور ان کے وظائف میں بھی اضافہ کیا"[۱]، ملا عبداللہ نے ہدایہ پر حاشیہ لکھا جو بہت مقبول ہوا،

قاضی عبدالوہاب، شیخ محمد طاہر بوہرہ کے پوتے تھے، شاہ جہان کے زمانہ میں اپنے مولد پٹن میں مفتی مقرر ہوئے، پھر اورنگ زیب کی دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس سے وابستہ ہوئے، جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو ان کو قاضی عسکر بنایا، پھر قاضی القضاۃ ہوئے، مآثر الامراء میں ہے کہ

در علم فقہ و اصول مہارت تمام داشت (جلد اول ص ۲۴۵)،

وہ اپنے فرائض کو بڑی دینداری اور بے باکی سے انجام دیتے تھے، عالمگیر کو خود بھی شرعی

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۰۰ ۲ و ص ۱۶۲

امور کا لحاظ رہتا تھا، اس لیے قاضی عبدالوہاب نے بھی شرعی احکام کے نفاذ میں بڑی سختی کی جس سے بعض امراء ان سے بدظن ہو کر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے تھے، مگر عالمگیر کو ان کے زہد و تقویٰ پر برابر اعتماد رہا، مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ قاضی عبدالوہاب کے عہد قضا میں نظم و نسق میں شریعت کی اتنی پابندی رہی کہ پہلے نہیں ہو سکی تھی، عالمگیر کو درباریوں نے ان سے بدظن کرنے کی کوشش کی، مگر اس نے اپنے احترام میں فرق ظاہر ہونے نہیں دیا، شاہزادہ محمد اعظم، شہزادہ محمد اکبر، سلطان ایزد بخش ولد سلطان مراد بخش اور شہزادہ سلطان کا نکاح ان ہی نے پڑھایا[1]، شاہی الطاف و اکرام اور ذاتی حسن اہتمام کی وجہ سے ان کے پاس بہت بڑی دولت جمع ہو گئی تھی، ایک بار ایک حاسد امیر نے ان کے تین لاکھ روپیے راستہ میں لٹوا دیے تھے، اس بربادی پر صبر کیا، پھر بھی ترکہ میں ان کے چاروں لڑکوں کو دو دو لاکھ روپیے ملے[2]،

قاضی عبدالوہاب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام اسی عہدہ پر مامور کئے گئے، وہ اپنے تقویٰ و پرہیز گاری کے لیے مشہور تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد اس عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے، مآثر عالمگیری میں ہے:۔

قاضی شیخ الاسلام پسر قاضی عبدالوہاب اپنی ذاتی استعداد و فطرت سلیمہ کے تقاضے سے جذبۂ محبت الٰہی میں بے قرار ہوئے، اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے، ہر چند جہاں پناہ نے ان پر عنایتیں فرمائیں اور ترک خدمت سے انھیں منع کیا اور عہدۂ قضاء کو جو ایسے ہی مقدس و پاکیزہ نفوس کے لیے عطائے الٰہی کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا، لیکن قاضی صاحب نے اپنے ارادوں

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۳، ۷۹، ۸۰، ۸۳۔ [2] مآثر الامراء، جلد اول ص ۲۳۶

میں کسی طرح تبدیلی نہ کی[1]، بادشاہ نے مجبور ہو کر خود قاضی صاحب کی رائے سے سید ابو سعید کو جو عالی نسب سید اور قاضی عبد الوہاب کے داماد تھے، عہدۂ قضا مرحمت فرمایا، سید ابو سعید دار الخلافت سے بادشاہ کے حضور میں (احمد نگر) حاضر ہوئے، اور خلعت، شمشیر، جمدھر کے عطیہ و انعام سے خوش اور معزز کیے گئے" (ص ۱۶۸)

قاضی ابو سعید نے شہزادہ معز الدین کا نکاح سیدۃ النساء بیگم دختر مرزا رستم سے پڑھایا تو عالمگیر نے ان کو خلعت اور ایک ہزار روپے نقد مرحمت کیے[2] شیخ الاسلام کے لڑکے محمد اکرم کو عالمگیر نے احمد آباد کی صدارت دیکر شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا[3]

مولانا سید محمد بیجاپوری حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ العزیز کی اولاد اور بیجاپور کے برگزیدہ عالم اور بزرگ تھے ۱۱۰۰ھ میں عالمگیر سے ملے تو اس نے ان کو چھ ہزار روپے سالانہ کے وظیفہ سے مطمئن خاطر کیا[4]

[1] ۱۰۸۰ھ کے واقعات کے سلسلہ میں مآثر عالمگیری کا مولف لکھتا ہے "حجستہ خداوند نے دشمنوازی بندہ نوازی کے لحاظ سے شیخ الاسلام کے نام ایک اشتیاق آمیز فرمان ان کے برادر نورالحق کے ہمراہ ارسال ہوا، فرمان مبارک کا مضمون یہ تھا کہ شغل قضا سے مستعفی ہو کر اور سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد ایک بار بھی حضور میں نہیں آئے، اگر اس طرف توجہ کریں تو مناسب ہے، شیخ الاسلام اس وقت احمد آباد میں مقیم تھے حضرت کا منشا یہ تھا کہ اگر شیخ مذکور حضور میں آجائیں اور صدارت کی خدمت اختیار کریں تو یہ عہدہ جلیلہ ان کو تفویض فرمایا جائے شیخ کا ارادہ تھا کہ طواف کعبہ کا احرام باندھیں کہ وفعۃً مرض نے شدت اختیار کی اور مرحوم کو سفر آخرت طے کرنا پڑا، اللہ مغفرت کرے، (ص ۲۸۲) [2] مآثر عالمگیری ص ۱۶۲، و مآثر الامراء جلد اول ص ۲۴۴، [3] ایضاً ص ۱۱۵،

حاجی احمد سعید، قصبہ بہار کے رہنے والے تھے، اپنے والد بزرگوار مولانا محمد سعید اور اس عہد کے دوسرے اکابر علماء سے تحصیل علم کی، مرآۃ العالم میں ہے:-

"در علم فقہ مہارت کامل دارد"

شاہجہان کے زمانہ میں شاہی لشکر کے مفتی رہے، پھر حرمین شریفین کی زیارت کو گئے وہاں سے واپس ہوئے تو عالمگیر نے ان کو ہزار دو یا نصدی کا منصب عطا کیا، اور شاہی حرم کی سرکار میں دیوان کی خدمت تفویض کی گئی، [۱]

قاضی خلیل الرحمٰن، فدائی خان المخاطب بہ اعظم خان فوجدار گورکھپور کے زمانہ میں اس شہر کے قاضی تھے، اعظم خان نے عالمگیر سے ان کے علم، صلاح، تقویٰ، دیانت اور بزرگی کی تعریف کی، تو اس نے ان کو گورکھپور کا فوجدار مقرر کیا، [۲]

سید علی اکبر سعد اللہ خانی، علامی سعد اللہ خان کے ہم جلیس وندیم تھے، اس لیے نام کے ساتھ سعد اللہ خانی کا جز بھی لکھا جاتا تھا، مرآۃ العالم میں ہے:-

"اکثر فنون دانش ورزیدہ وبر غوامض ودقایق علوم آگہی داشت، در علم فقہ نیک متبحر است" [۳]

علامی سعد اللہ خان کے لڑکے لطف اللہ کے معلم بھی رہے، ان کے مکارم اخلاق سے متاثر ہو کر عالمگیر نے شہزادہ محمد اعظم کی تعلیم بھی ان کے سپرد کی، پھر لاہور کے قاضی مقرر کیے گئے، فرحتہ الناظرین میں ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں بھی شریک رہے، مگر مرآۃ العالم میں ان کی شرکت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،

---

[۱] مرآۃ العالم ورق ۲۹۹ [۲] مرآۃ العالم ورق ۳۰۰، فرحتہ الناظرین میں ان کا نام قاضی عبدالرحمٰن مرقوم ہے [۳] مرآۃ العالم ورق ۳۰۱

ملا محمد اکرم لاہوری، مراۃ العالم میں ہے کہ بڑے لائق معلم تھے، صلاح، حلم، بردباری، تقویٰ اور پرہیزگاری ان کے نمایاں اوصاف تھے، اس لیے جہانگیر نے ان کو شاہزادہ کامگار محمد کی تعلیم کے لیے مامور کیا[1]، مآثر عالمگیری میں ہے کہ موروثی مفتی تھے، قاضی عبداللہ کے انتقال کے بعد اردوئے معلی کے قاضی مقرر ہوئے[2]،

حافظ ابراہیم، عالمگیر نے قرأت و تجوید ان ہی سے سیکھی، شہزادہ محمد سلطان کی تعلیم ان ہی کے ذمہ تھی، وہ اس کو کلام پاک بھی پڑھایا کرتے تھے[3]،

ملا شرف الدین لاہوری، مراۃ العالم کا مولف لکھتا ہے:۔

فضیلت درست داشتہ، و بفصاحت و طلاقت لسان و حسن خلق موصوف بود۔

لاہور کے مفتی کے عہدہ پر مامور تھے، ان کے صاحبزادے ملا محمد باقر بھی صوری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ تھے، عالمگیر ان سے بھی خسروانہ نوازشوں سے پیش آتا تھا،

ملا عبدالباقی جونپوری ملا محمد جونپوری مصنف شمس بازغہ کے لائق شاگرد تھے، ان کے علمی فضل و کمال کی ستایش ان الفاظ میں کی گئی ہے،

در اکثر علوم علی الخصوص در منقولات یگانہ بود و بدقت فکر و غور مطالعہ از فضلائے زمانہ گوے مسابقت می ربود۔

ایک بار عالمگیر کے دربار میں آئے تو اس نے نوسو روپے سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں ان کو عطا کیا، اس کے بعد وطن میں رہ کر تمام عمر وطن ہی میں درس و تدریس میں گذار دی[4]،

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری کو ان کے والد بزرگوار سید عبدالغنی کی جگہ پر عالمگیر

[1] مراۃ العالم ورق ۳۰۱، [2] مآثر عالمگیری ص ۴۸۱، [3] مراۃ العالم ورق ۳۰۱، [4] ایضاً ۳۰۲

[5] ایضاً ورق ۳۰۲

نے سورج گڑھا اور گجرا (مونگیر) کا قاضی مقرر کیا تو اس نے محکمۂ قضاۃ کی سند عطا کرتے وقت اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو حمائل اور چالیس بیگہ زمین عنایت کی،[1]

قاضی ملا محب اللہ بہاری، موضع کرا، علاقہ بہار شریف (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور دوسرے علماے روزگار سے تعلیم پاکر دکن گئے، جہاں عالمگیر نے شاہی ملازمت میں شامل کر لیا، لکھنؤ اور حیدرآباد میں قاضی رہے، پھر عالمگیر نے اپنے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کی تعلیم کے لیے مامور کیا، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا، اور فاضل خان کا خطاب ملا، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی، اور محلہ چاند پورہ بہار شریف میں دفن ہوئے، منطق میں سلم العلوم، افادات، اصول فقہ میں مسلم الثبوت، جزء لا یتجزیٰ کے بیان میں الجواہر الفرد رسالہ مغالطۂ عامۃ الورود ان کی تصانیف ہیں، ان کی استعداد و قابلیت مصنف تذکرہ علمائے ہند کے صرف ایک جملہ سے ظاہر ہوگی،

"بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم،" (ص ۱۷۵)

سید سعد اللہ، شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، پینتیس[۳۵] سال تک اپنے نانا سے درس لیتے رہے، علم ریاضی کے ساتھ ساتھ معقولات و منقولات کی بھی تعلیم پائی، راہ سلوک طے کی، پھر حرمین جاکر بیت اللہ کی زیارت کر گئے، جہاں بارہ سال تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا، شریف مکہ بھی ان کی بزرگی کا معترف تھا، اور ان سے اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا، عرصہ تک حجاز، عجم اور ہند کے لوگ ان کی تعلیم و عرفان سے متمتع ہوتے رہے، مگر بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ہندوستان واپس آگئے، اور شہر سورت میں قیام پذیر ہوئے،

[1] شاہی فرمان کے لیے دیکھو معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء

عالمگیر کو جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا، تو ان کی مدد خانقاہ کے لیے اور دو گاؤں جس کی آمدنی سات آٹھ ہزار روپے سالا کو ان کی ذات سے بڑی عقیدت تھی، دست خاص سے ان کو خط لکھا کرتا محض خلق اللہ کی نفع رسانی کی خاطر ہر خاص و عام کی سفارش شاہی بارگاہ میں کرے

عالمگیر نے ان کو لکھا کہ وہ صرف درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لیے سفارش کیا کریں مگر انھوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی [۱]

عالمگیر کو ایسے تمام مشائخ کے ساتھ جو شریعت کے پابند تھے بڑا والہانہ لگاؤ رہا، دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس نے حضرت عبد اللطیف برہانپوری کی خدمت میں پہونچکر کچھ گاؤں پیش کیے، مگر انھوں نے یہ گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا، اور یہ شعر پڑھا،

شاہ ما را دہ دہد منت نہد   رازق ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سنکر متاثر ہوا، مگر اس نے عرض کیا کہ ہم فقرا اور اہل اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لیے کرتے ہیں، گاؤں پیش کر کے احسان کرنا مقصود نہیں حضرت عبد اللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے، تو گوشہ نشینوں اور متوکلوں کے لیے وظائف مقرر کرو، مظلوموں کو ظالموں سے بچاؤ، کمزوروں کو ان کے حقوق دو، وغیرہ وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا ہے [۲] بادشاہت کے زمانہ میں بھی عالمگیر نے حضرت عبد اللطیف سے بہت ہی نیازمندانہ تعلقات قائم رکھے،

[۱] منتخب اللباب از خافی خان جلد دوم ص ۶۰۵، [۲] مقدمہ رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۱۴۴

دست خاص سے رقعہ تحریر کرتا تھا۔[1]

ینی کے لیے رخصت ہوتے وقت اورنگ زیب حضرت شیخ برہان کی ا برہان پور حاضر ہوا، شیخ برہان بادشاہ اور امرا سے ملنا اپنے مسلک کے سمجھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک وواردو کو دیکھکر شیخ برہان نے نام پوچھا، اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، ۔۔ نہ اور لوگوں کی طرح اس کو کوئی تبرک دیا، اورنگ زیب دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے، تو لے لو ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، مگر تیسرے دن اورنگ زیب پھر ان کے پاس گیا، وہ نماز کے لیے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے، کہ اورنگ زیب مودبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھکو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا آپ باطنی توجہ فرمائیں، شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اورنگ زیب سے کہا بادشاہی مبارک ہو،[2]

اولیاء اللہ کی بے رخی سے عالمگیر کبھی دل گیر نہ ہوتا، ملا قطب الدین شہید سہالوی سے کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی، مگر ہر بار ملا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا،[3] حضرت شیخ بایزید نے ایک روز جامع مسجد میں تمام لوگوں کے سامنے عالمگیر سے پوچھا کہ اس کی

۱؎ منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۵۵ ۔ ۲؎ ایضاً ص ۵۵۵ ۔ ۳؎ فرقۃ الناظرین ص ۸۰۔

لڑکیوں میں بعض نا کتخدا کیوں ہیں؟ یہ پوچھا، تلقین کی خاطر ایک وعظ کہا، عالمگیر نے ان کی نصیحتوں کو خاموشی سے سنا[۱۵]، میر مرتضیٰ و اخوند ملا تانی کو اس نے اس لیے پسند کیا کہ وہ شرعی اور مذہبی امور میں حق گوئی سے کام لیتے تھے، اسی لیے ان کو شہزادہ کام بخش کی اصلاح و تربیت کے لیے مامور کیا[۱۶] حضرت میر نصیر الدین ہروی سے اصلاح و تقوی اور عارفانہ فضیلت سے متاثر ہوا، اس نے ان کی خدمت میں کچھ گاؤں پیش کئے، مگر انہوں نے جاگیر قبول کرنا پسند نہیں کیا[۱۷]

عالمگیر کا ذوق ادب : عالمگیر نے چار زبانیں سیکھیں، عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی، وہ ترکوں سے ترکی ہی میں باتیں کرتا تھا، عالمگیر نامہ کا مولف لکھتا ہے کہ

ترکی چغتائی را بغایت خوب می داند (۱۰۹۵)

اور ہندوستان کے ایسے باشندوں سے جو فارسی نہیں بول سکتے تھے، وہ ضرورت کے وقت ان ہی کی زبان میں گفتگو کر لیتا تھا[۱۸] مگر اس کا انشا پردازانہ جوہر فارسی نثر لکھنے میں چمکا، بابر اور جہانگیر کی طرح اس کے قلم میں بھی غیر معمولی قوت تھی، اور اگر حکمرانی کرنے کے بجائے کوئی کتاب لکھتا تو بلاشک و شبہ ایک معجز نگار اور سحر پرداز ادیب ہوتا، سلطنت کے کاروبار کی مشغولیتوں ہی میں وہ شہزادوں اور خاص خاص لوگوں کو رقعے لکھتا جو ظاہر ہے کہ منظر عام پر لانے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے، مگر یہی رقعات جب اکٹھے کر لیے گئے تو اس کے ادب و انشار کی داد ہر زمانہ کے اہل کمال نے دل کھول کر دی، وہ آیات قرآن مجید، احادیث نبوی اور سعدی، حافظ، نظیری اور نظامی کے اشعار اس برجستگی اور خوبی سے اپنے رقعات میں استعمال کرتا ہے کہ وہ سب ادبی شہ پارے بن گئے ہیں، جن کو پڑھنے میں

۱۵ منتخب اللباب، جلد دوم ص ۵۵۲ ۔ ۱۶ ایضاً ص ۵۵۲ ۔ ۱۷ ایضاً ص ۵۵۷ ۔ ۱۸ عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

بڑی گھلاوٹ اور لطافت محسوس ہوتی ہے، عالمگیرنامہ کا مولف اس کے انشا کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"نکتہ دانی معنی شناسی، ربط اور مناسبت فطری اس پایہ کی ہے کہ نثر و انشا کے معنی طراز، سخن سنج اور نکتہ پرداز فصاحت پیشہ لوگ ان کی تعلیم و ارشاد کے فیض سے مستفید ہوتے ہیں، کسی بلیغ منشی سے جب کوئی منشور لکھواتے ہیں تو مقصود کی تلقین اس حسن و خوبی سے فرماتے ہیں کہ اگر یہ منشی ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر منشور لکھتے ہیں تو غور و فکر سے مستغنی رہتے ہیں، منشور کا مسودہ جب آپ کے مطالعہ میں آتا ہے تو قلم بدایع رقم ایسی اصلاحوں سے مزین کر دیتا ہے، کہ ادیب اسے دیکھتے ہی اپنے عجز و قصور کا معترف ہو کر ان سے سخن طرازی اور اسلوب و قواعد سیکھتا ہے۔" (ص ۱۰۹۵)

مآثر عالمگیری میں ہے:-

فن خوشنویسی کے علاوہ جہاں پناہ کو فن انشا میں بھی خاص مہارت تھی، اور نثر نگاری و انشا پردازی میں ید طولی حاصل تھا، جہاں پناہ نثر نہایت خوب تحریر فرماتے تھے۔ (صفحہ ۳۸۹)

یہ تو درباری مورخین کے بیانات ہیں، لیکن بیسویں صدی کے ممتاز انشا پرداز اور نکتہ سنج ادیب بھی اس کے ادب کی تعریف اسی گرم جوشی کے ساتھ کرتے ہیں، مولانا شبلی رقمطراز ہیں:

"عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا، اس کی انشا پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے، اس کے رقعے باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرہ، قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ اور جغرافیانہ اطلاعوں کی یادداشت ہیں تاہم ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشین ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں۔" (مضامین عالمگیر ص ۱۴۳)

مولانا آزاد "بادلِ ناخواستہ" لکھتے ہیں، کہ

"عالمگیر نے دل مقتدر اور زبان قادر البیان پائی تھی، اسلیے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا، یا سامنے لکھواتا تھا، کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا، وہ پچاس برس سلطنت کر کے ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا، اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے، کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشورِ سخن بھی زیر قلم، دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی ملک رانی کے پیچوں میں الجھے ہوئے ہیں، مگر عبارت صاف ہے، اور لفظ لفظ میں محاورے کا نمک دیا ہوا ہے، تمام انتظامی ہدایتیں اور اکثر اخلاقی نصیحتیں ہیں کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اس کی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دوں تو مضائقہ نہیں، اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین اور اس کے عالی عبارت اسکی جتنی پڑھنے میں سہل ہے اتنے ہی لکھنے میں دشوار ہے۔"[1]

(عالمگیر کے خطوط کی ہمہ گیری کے متعلق سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرتب "رقعات عالمگیری" کی رائے ہے، کہ)

(اورنگ زیب کے خطوط ..... گلہائے رنگا رنگ کے بہترین مجموعہ ہیں، کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے، تو کہیں سیاسی و معاشرتی واقعات پر تنقید، کہیں شوقِ وصال بے چین کیے ہوئے ہے، تو کبھی دردِ فراق نے مضطر کر رکھا ہے، کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے، تو کہیں کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے، تو کہیں تنبیہہ، اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر، کہیں عتاب ہے، تو کہیں عنایت، کبھی گرمجوشی

---

[1] نیرنگِ خیال۔

ہے، تو کبھی سرد مہری، کبھی الزامات کی صفائی ہے، تو کہیں دوسرے کے خلاف شکایت، غرضکہ وہ کونسی چیز ہے جو اس مجموعہ میں نہیں ہے، پھر وہ کونسی شے ہے جس میں حقیقت نگاری کے ساتھ کمال ادب کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔[1]

عالمگیر کا ذوق شعری | عالمگیر کے دربار میں کوئی ملک الشعراء نہیں تھا، اس سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ عالمگیر کو شعر و شاعری سے نفرت تھی، اس لیے اس عہدہ کو اپنے دربار سے ختم کر دیا، مگر اہل نظر یہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں، جب کہ اس کے اکثر خطوط اشعار اور لمبی لمبی نظموں سے مزین نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر بعض نمونے ملاحظہ ہوں، ایک خط میں لکھتا ہے:-

خان جہان بہادر درگذشت، انا للہ وانا الیہ راجعون، سبحان اللہ آدمی چہ قدر غافلست؟ و نفس تا کجا بروغالب، ؟ درین ایام صوبہ داری دکھن می خواستند دیچہ و نگرمی آنند وسے آن کردیہ؟ آرے کار نفس بدتر ازین است، سے

کشتن این کار عقل و ہوش نیست	شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست
عالمے را لقمہ کرد و درکشید	معدہ اش نعرہ زنان ہل من مزید
دوزخ است این نفس و دوزخ اژدہاست	کو بدریا ہا نگردد و کم و کاست
ہفت دریا را در آشامد ہنوز	کم نگردد و سوزش این خلق سوز
سنگہا و کافران سنگ دل	اندر آیند اندران خوار و خجل
ہم نگردد و ساکن این چندین غذا	تا زحق آید مرا ورا این ندا

[1] مقدمۂ رقعات عالمگیر از نجیب اشرف ندوی ص ۵۶-۵۵، ہم نمونے کے لیے اورنگزیب کے رقعات کو یہاں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ مولف ہذا نے اورنگزیب کے خطوط پر ادبی حیثیت سے نہایت ہی مبسوط ناقدانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے، ملاحظہ ہو مقدمۂ رقعات عالمگیر ص ۵۵ تا ۹۰

سیر گشتی سیر گوید نے ہنوز　　این است آتش اینت آتش زیست نوز

حق قدم بروے نہد از لامکان　　آنگہ او ساکن شود از کن فکان

چونکہ جزء دوزخ است این نفس ما　　طبع کل دارد ہمیشہ جزءہا

این قدم حق را بود کو را کشد　　غیر حق خود کے کمان او را کشد

قوتے خواہم ز حق دریا شگاف　　تا بسوزن بر کنم این کوہ قاف

او تعالیٰ توفیق کرامت کند و ازین نیزہ دوزہ رہائی بخشد، بحرمۃ محمد و آل محمد علیہم الصلاۃ والسلام[1]

ایک بار شہزادہ بیدار بخت (خلف اکبر محمد اعظم) نے اپنی محبوبہ بیگم شمس النساء صبیہ سید ممتاز خان کو غصہ کی حالت میں پاجی کی لڑکی کہا، خود دار بیگم نے شہزادہ سے بولنا چھوڑ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی۔ تو بیدار بخت کو اس دلچسپ انداز میں خط لکھا،

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت　　ناز کم کن کہ درین باغ بسے چون تو شگفت

گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولیکن　　ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت

بآن نور الابصار واضح باد کہ در ایام جوانی کہ اصطلاح پوچ مصاحبان شاہجہانی دیوانی می گویند ما را ہم دران ایام این تعلق با شخصیکہ نہایت تسخر داشت بہم رسیدہ بود تا حیات محبت او را بانجام رسانیدیم وگاہے، آزردہ نکردیم دیگر آن کہ با سادات لفظ پاجی گفتن محض پاجی گریست، کسے اگر سید را پاجی بگوید البتہ پاجی خواہد شد، اگر از نوشتۂ محلدار و ناظر رضامندی آن سیدہ نشود عتاب، بلکہ عقاب گرفتار خواہید شد، جزاءً بما کانوا یعملون،[2]

شاہزادہ محمد اعظم کو ایک موقع پر تنبیہ کرتا ہے،

عجب از آن فرزند کہ صحبت ما ہیچ اثر نہ کردہ؟ از احتیاط دور دیدنی ہزار مرحلہ دور افتادہ

---

[1] وقائع عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی ص ۹۰-۸۹، [2] ایضاً ص ۹۰،

الحذر در سوء الظن بخاطر نیاورده و از آیت ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکۃ بہرہ نیافتہ؛

مرغے کہ زیرک است دریں بوستان سرا ۔۔۔ گل را خیال چنگل شہباز می کند

خون می چکد ز زخم نمایان ز خندہ اش ۔۔۔ کبکے کہ بے ملاحظہ پرواز می کند

مردے در تہوری و بے باکی نیست بلکہ در خود شکنی ست

کمال مردی و فرزانگی ست خود شکنی ست ۔۔۔ بہوس دستنا کسے را کہ ایں کمان شکنند

ایک دوسرے رقعہ میں لکھتا ہے :۔

بفرزند عالیجاہ عرضداشت کند کہ ایشان استشفاع تقصیر اعتبار خان کردہ اند، احتمال قوی کہ سید سعد اللہ در دلش فوشتہ باشند بنویسید کہ عبد القادر بیدل دریں مقام دو مصراع دلچسپ گفتہ

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از در حق بہر استقبال می آید[۵۱]

سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملا شاہ اور فانی کشمیری کے دواوین عالمگیر خاص طور سے پڑھتا تھا، اور ان کے اشعار زبانی یاد رکھتا تھا، بخشی الممالک مخلص خان نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا، جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، عالمگیر صائب کے ایسے اشعار پڑھ کر بہت محظوظ ہوا، جو معرفت و تصوف میں ڈوبے تھے، اور اس دیوان کو محبوب رکھنے لگا، اس کی مندرجہ ذیل غزل ایک مدت تک اپنی محفل میں بار بار پڑھا کرتا تھا،

خم چو گردید قد افراختہ می باید رفت ۔۔۔ پل بریں آب چو شد ساختہ می باید رفت

ہر چہ در کار بود ساختنش خود ساز نیست ۔۔۔ گوشہ کار جہاں ساختہ می باید رفت

ایں سفر نیچو سفرہائے دگر صائب نیست ۔۔۔ رخت ہستی ز خود انداختہ می باید رفت[۵۲]

[۵۱] وقائع عالمگیری ص ۱۲۲،
[۵۲] مآثر عالمگیری ص ۳۸۳

جو شعر اس کو پسند آتے تھے ان کو وہ خود اپنی بیاض مین لکھ لیتا تھا، اور اکثر اوقات اپنے لڑکون کی بیاض مین بھی بالالتزام لکھواتا تھا، ایک رقعہ مین لکھتا ہے،

بہدایت اللہ زرین رقم بگوئید، کہ این رباعی در بیاضے کہ بپادشاہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بنویسد ؎

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش
من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش
اے وائے من و دست من و دامن خویش[1]

علالت اور حتی کہ بستر مرگ پر بھی عالمگیر کی زبان پر شعر ہوتے تھے، ۱۱۱۶ھ مین ایک بار بیمار پڑا، تو ضعف کی حالت مین یہ شعر ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا،

بہشتاد و نود چون در رسیدی
بس سختی کہ از دوران کشیدی

دران جا چون بصد منزل رسانی
بود مرگے بصورت زندگانی

امیر خان نے جو اس وقت اس کے ساتھ تھا، عالمگیر کو شعر پڑھتے سنا تو عرض کیا کہ نظامی گنجوی نے ان ابیات کی تمہید مین یہ بیت کہی ہے،

پس آن بہتر کہ خود را شاد داری
دران شادی خدا را یاد داری

عالمگیر نے اس شعر کو کئی بار سنا، پھر اپنی بیاض مین لکھوایا، اور مدت تک یاد رکھا،[2] بستر مرگ پر یہ شعر اکثر اس کے ورد زبان رہتا تھا،

بیک لحظہ، بیک ساعت، بیک دم
دگرگون می شود احوال عالم[3]

یہ تعجب سے سنا جائے گا وہ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتا تھا لیکن ہم کو اسکا صرف ایک شعر مل سکا۔

---

[1] رقائم عالمگیر ص۵۔ [2] آثار عالمگیری و واقعات سنہ ۱۱۱۶ھ۔ [3] واقعات سنہ ۱۱۱۸ھ

غم عالم فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم　　چسان در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیابان را[1]

ان شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک درست ہے، کہ عالمگیر کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ عملی اور کارفرما دل و دماغ لیکر آیا تھا، وہ تفریحی مشاغل کا شیدا نہ تھا، اس کی سنجیدہ اور متین طبیعت شعرا کی مبالغہ طرازیوں، خوشامدانہ مداحیوں، اور جھوٹی بناوٹی باتوں کو نہیں پسند کرتی تھی، چنانچہ مراۃ العالم میں ہے:

در مراتب نثر و انشا دستے تمام داشت و در مہارت نظم ہم بہرہ تمام اما بمودار مستشہد صادق کریمہ والشعراء یتبعہم الغاوٗن متمسک گشتہ توجہ باستماع شعر ندارند تا بشنیدن اشعار چہ رسد الا شعر کہ متضمن موعظت باشد

نہ کردہ بہر رضائے خدائے عز و جل　　نہ چشم سوئے غزال و نہ گوش سوئے غزل

مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے،

جہان پناہ اگرچہ نظم و نثر کے سمجھنے اور لکھنے میں کمال قدرت رکھتے تھے لیکن بیفائدہ اشعار، اور خصوصاً کاذب مدح سرائی کے سننے سے پرہیز فرماتے تھے نصیحت آمیز اشعار سے البتہ بے حد ذوق تھا،[2]

ایک بار سلطان شادمان نے اسکی مدح میں مندرجہ ذیل قصیدہ اس کے سامنے پڑھا،

آن کیست کز حلقۂ دولت نشان دہد　　در خواب اگر رود بطریق کمان دہد

آب حیات خضر کہ عمریست جاودان　　تا کے بحسرت لب لعل تو جان دہد

فکر سخن طراز کہ خضریست فی المثل　　خود در عدم رود چو نشان زان میان دہد

ابر قلم کہ آب سیہ می چکد از و　　رنگ سخن ز وصف لب یگل رخان دہد

---

[1] بحوالہ بادشاہ نامہ عالمگیری از ذکاء اللہ ص ۵ ،۷ م　[2] مآثر عالمگیری ص ۳۸۹

قد تو در خرام بگلگشت بوستان | صد پیچ و خم ز شرم بسرو چمان دهد
آنجا که اوست نالهٔ عاشق کجا رسد | گر بال جبرئیل بمرغ فغان دهد
از چشم جانستانش چو خواهم حیات نو | مژگان جواب من بزبان سنان دهد
گر دل ستاند از نگه عشوه آفرین | صد دل عوض ز طرهٔ عنبرفشان دهد
چون شیشهٔ شراب که با محتسب دهند | کس دل چرا بدست تو نامهربان دهد
نازم بچهره که بهنگام می ز عکس | رنگینی بهار بفصل خزان دهد
هر چیز را بجا صفتی آفریده اند | کی سرمه در گلو اثر زعفران دهد
من خود بدرد یار خوشم ورنه روزگار | کی این قدر الم بدل شادمان دهد
چشمش بابروان و مژه گشت عالمی | کس ترک مست را زچه تیر و کمان دهد
زلفش مزوریست مکن اعتبار او | از عشوه گر دلی بتو شب در میان دهد
مضمون دلنشین که رسد از جهان غیب | یاد از طراوت سخن باستان دهد
مرد آن بود که گر همه عالم بدو دهند | دل کم دهد بشادی و غم تا که جان دهد
ما جان بنقد مهر و وفا داده ایم و بس | دیوانه نیستیم که جانی نسیان دهد
شاید مراد من که نخواهم ز آسمان | اورنگ زیب عادل گیتی ستان دهد
شاهی که از برای سر دشمنان دین | بهر نثار گوهر تیغ میـــان دهد
بهرام صولتی که ز بیمش سپهر گریز | گردون عنان خود بره کهکشان دهد
تا ارض را سکون و سما در تحرک است | تا چتر آفتاب ز مشرق نشان دهد
زیبنده باد بر سر او رنگ سلطنت | تا ابر و مهر راتب دریا و کان دهد

باوجودیکه اورنگ زیب اپنی مدح سرائی مطلق پسند نہ کرتا تھا، اور شاعروں کی قصیده

خوانی کو فعل عبث سمجھتا تھا، چنانچہ شادمان کو آئندہ مدح سرائی سے منع کر دیا، لیکن قصیدہ کے بعض بعض اشعار کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے بہت پسند کیا، اور بار بار پڑھوا کر سنا، مراۃ الخیال میں ہے،

"سلطان شادمان قصیدہ مشتمل بر مدح گفتہ بسمع مبارک رسانید و بعض ابیاتش پسند خاطر فیاض افتاد، و بتکرار استماع فرمودند"[۵۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس ذوق شعری کے ملک الشعراء کا عہدہ عالمگیر نے کیوں تخفیف کر دیا، دیکھنا یہ ہے کہ اس کے دربار کے ممتاز ترین شعراء کون تھے، نعمت خان عالی، عاقل خان رازی، ملا اشرف ماژندرانی اور موسوی خان وغیرہ وغیرہ کیا ان میں کوئی ایسا تھا جو فیضی طالب آملی، قدسی اور ابو طالب کلیم کا مدمقابل ہو سکتا تھا، اگر ان میں کسی کو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کر کے ان نادرۂ روزگار شعراء کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا، تو کیا عالمگیر کے علم و ادب کے بلند اور اعلیٰ ذوق پر حرف نہ آتا، ان میں سے کسی ایک میں بھی فیضی کا جوش بیان اور استعارات کی شوخی، یا طالب آملی کی تشبیہات کی ندرت، یا قدسی کا جوش و خروش، یا کلیم کی مضمون آفرینی اور خیال بندی پائی جاتی ہے؟ مولانا شبلی رقمطراز ہیں کہ مرزا صائب کے بعد بھی لوگوں نے طبع آزمائیاں کیں لیکن وہ شمار کے قابل نہیں، وہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایران میں شاعری مرزا صائب پر ختم ہو گئی، ہندوستان میں بھی یہ کہنا صحیح ہے، کہ شاہجہانی دور میں فارسی شاعری اوج کمال پر پہنچ کر زوال کی طرف مائل ہوتی گئی، بعد کے شعراء پرانی شراب کو صرف نئی بوتلوں میں انڈیلتے رہے،

شعراء یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ عالمگیر کا دربار شعراء سے خالی ہو گیا تھا، اس کے دربار میں بھی شعراء تھے وہ ان کے اشعار سنتا، اور موقع بموقع اپنے جود و سخا سے ان کو فیضیاب کرتا تھا، مگر وہ مفت خوری

---

[۵۱] مراۃ الخیال ص ۲۵۲، ۲۵۳

کا قائل نہ تھا، اور نفس شاعری کو ذریعہ معاش ٹھہرانا پسند نہ کرتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس نے دربار کے شعرا، کو بھی ان کی استعداد و لیاقت کے مطابق کسی منصب و دیگر روزی کمانے کا ذریعہ فراہم کیا، اس نے نفس شاعری کا منصب قائم رکھنا پسند نہیں کیا،

دربار کے متوسلین شعرار کی تعداد تو زیادہ ہے، مگر ہم یہاں پر صرف تھوڑے سے ارباب سخن کا ذکر کرتے ہیں

نعمت خان عالی، عالی تخلص تھا، اور مرزا محمد علی نام، حکیم فتح الدین شیرازی کا لڑکا تھا، مرزا محمد ہندوستان ہی میں پیدا ہوا، لیکن صغر سنی میں باپ کے ساتھ شیراز چلا گیا، اور وہیں تعلیم پائی، ہندوستان آیا تو ملا شفیعائی یزدی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا، یہاں طب کا آبائی پیشہ اختیار کیا، پھر اورنگ زیب نے اپنے ملازمان خاص میں داخل کر لیا، اورنگ زیب نے جب حیدرآباد فتح کیا، تو اس نے یہ تاریخ کہی،

از نصرت پادشاہ غازی ‏ ‏ گردید دل جہانیان شاد
آمد بقلم حساب تاریخ ‏ ‏ شد فتح بجنگ حیدرآباد

اورنگزیب نے خوش ہو کر اس کو خلعت و انعام عطا کیا[1]

سنہ ۱۰۹۸ھ میں اس کو نعمت خان کا خطاب ملا، اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، آخر عہد میں اورنگزیب نے اسے مقرب خان کے خطاب سے سرفراز کیا، اور جواہر خانہ نگین دولت کا داروغہ بنایا، شاہ عالم کے زمانہ میں دانشمند خان ہوا، اور بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیرآباد کہا، اس کی مختلف تصانیف کا ذکر آگے آئیگا، لیکن یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اس کی کتاب وقائع نعمت خان میں عالمگیر کی ہجو ملیح بھی ہے، احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں:

[1] مآثر عالمگیری، واقعات سنہ ۱۰۹۸ھ

بے حد شوخ، بے باک، حاضر جواب اور لطیفہ گو تھا، محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوا، بادشاہ قابل دوست اور جوہر شناس تھا، اس کو بکاولی کا منصب دیکر نعمت خان کا خطاب دیا، مگر اس نے اپنے ولی نعمت کے حق نمک کا خیال نہین رکھا، اور ہجو ملیح لکھی

نمکِ سودۂ الماس شبیہ است بہم　　　　ہر کہ این را بغلط خورد دگر جان نبرد

آخر اپنی نامناسب اور ناشایستہ باتون سے لوگون کی نظرون سے گر گیا۔ اس کی غزلون کے اشعار مین تو کوئی لطف نہین، بلکہ بے مزہ اور پھیکے خالی ہین، مگر اس کی مثنوی، ہجو اور نثر پسندیدہ ہے،[1]

اورنگ زیب نعمت خان عالی کی دریدہ دہنی سے واقف تھا، لیکن اس سے وہ قصداً اغماض کرتا تھا، ایک بار کامگار خان نامی ایک امیر کی شادی کے موقع پر نعمت خان عالی نے ایک ہجو لکھی، تو امیر نے اورنگ زیب اس کو تنبیہ کرنے کی درخواست کی لیکن اورنگ زیب نے لکھا:

خانہ زاد سادہ لوح (کامگار خان) می خواہد کہ ما راہم درین رسوائی شریک سازد کہ او ہر چہ خواہد در باب ما بگوید، و بنویسد، و شہرۂ عالم سازد، و بیشتر ہم در باب ما مقصر نبود،[2] تلافی باضافہ و انعام شدہ کہ دیگر ارتکاب ننکند، باوجود این خود کی نکردہ زبان بریدن و گردن زدن مقصد نیست، باید سوخت، و باید ساخت، رفیق کا ہم اتفاق و لا بغار فلت[3]

میر غلام علی آزاد اس کے بارے مین لکھتے ہین، کہ

---

[1] مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین اعظم گڈھ، [2] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ فتح دکن کے موقع پر تاخیر ہوئی تو بعض امرا نے اورنگ زیب سے واپس جانے کی درخواست کی، اورنگ زیب واپس جانے کے خلاف تھا اس موقع پر نعمت خان عالی نے طنزیہ کہا:- بنشسته جہان قوی کرہ او شنشش بود کارے دگر ے نیست خدا یار دارد عالمگیر مفتش پڑا، [3] رقعات عالمگیر ص ۶۶،

"حاوی فنون دافر بود و جامع علوم فنکاثر...... مرزا محمد در نظم و نثر قدرت عالی دارد

خصوص در وادی نثر طلسم حیرت می بندد"

مآثر الامرا کا مصنف اس کو ہمیشہ حاجی کے نام سے یاد کرتا ہے، اور لکھتا ہے،

"ہیچ یکے از زبانش نرستہ"[1]

عالمگیر نے نعمت خان عالی کے لڑکے حکیم حاذق کو حکیم الملک کا خطاب دیا محمد شاہ کے عہد

میں یہ خطاب حکیم الملوک ہو گیا، اور پنجہزاری منصب بھی ملا۔[2]

عاقل خان رازی، میر عسکری نام، خوافت کا رہنے والا تھا، شاہجہان کے عہد میں ہندوستان

آیا، اور شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں ضلع دار مقرر ہوا، ایام شاہزادگی میں اورنگ زیب

کی ایک کنیز (جسکے اندر پرستان خاص) کا انتقال ہو گیا اس سے اورنگ زیب روز "تازہ بتازہ

اور نو بنو" گانے سنکر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر اورنگزیب بہت ہی غمگین ہوا اسنا

غم غلط کرنے کے لیے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے

پوچھا کہ اندوہ و ملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی؟ اورنگ زیب نے جواب میں

یہ شعر پڑھا:-

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست　　در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سنکر عرض کیا، کہ

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود　　ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

---

[1] مآثر الامرا جلد سوم ص ۵۷۰، اس کے (حاجی کے) نمونے مخزن الغرائب میں ملاحظہ ہوں، کلیات

نعمت خان عالی کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ہے، کلام کے کچھ نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی ص۱۳۰

پر بھی درج ہیں، [2] مآثر الکرام ص ۱۳۱

اورنگزیب نے شعر سنا تو اس پر رقت طاری ہو گئی، اور اس کو بار بار پڑھتا رہا۔[1]

میر عسکری حضرت برہان الدین رازی کا معتقد تھا، اس لیے رازی تخلص کرتا تھا، جب اورنگزیب دکن سے دارا سے لڑنے چلا، تو قلعۂ دولت آباد میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑا، میر عسکری اس شہر کا نگہبان ہوا، اورنگ زیب جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو عاقل خان کا خطاب دیا، اور میوات کا فوجدار مقرر کیا، لیکن چند مہینے کے بعد میر عسکری صحت کی خرابی کی وجہ سے خانہ نشین ہو گیا اس مدت میں اس کو ۵۰۰۰ روپیہ ملتے رہے، ۱۰۷۷ھ میں پھر ملازمت شاہی میں منسلک ہوا، اور داروغہ حرم خاص مقرر ہوا، جس پر بہت ہی معتمد امیر مامور ہوتا تھا، اس زمانہ میں اورنگزیب کے عنایات و اکرام سے برابر فیضیاب ہوتا رہا، ۱۰۸۸ھ میں اس کو ایک شاہی خلعت عطا کیا گیا، اور ڈاک چوکی کا داروغہ مقرر ہوا، لیکن اس عہدہ سے مستعفی ہو گیا، ۱۰۸۹ھ میں اس کا ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہوا، ۱۰۹۰ھ میں بخشی دوم کے عہدہ پر مامور ہوا، ۱۰۹۱ھ میں اسکو دہلی کی صوبہ داری سپرد کی گئی، اس عہدۂ جلیلہ پر اپنی وفات تک فائز رہا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ عاقل خان کی خدمات، دیانتداری اور اخلاص کی وجہ سے عالمگیر اسکی خودرائی و خود بینی و خودآرائی سے چشم پوشی کر کے عمدہ اور اہم خدمات اسکے سپرد کرتا تھا۔[2]

ظفر نامۂ عالمگیری، ایک دیوان، مرقع تصنیفات رازی، اور چند مثنویاں، نغمات العشق، مرآۃ الحقیقۃ، شمع و پروانہ، اور مہر و ماہ اس کی یادگاریں ہیں، ظفر نامۂ عالمگیری میں [illegible] عالمگیر کے واقعات جنگ بیجاپور سے میر جملہ کی وفات تک درج ہیں، مرقع تصنیفات رازی میں مولانا جلال الدین رومی کی طرز پر ایک مثنوی ہے، مرآۃ الحقیقۃ اس کے مرشد شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے [illegible]

۱؎ مرآۃ الخیال [illegible]

کا قصہ ہے، مہر و ماہ میں ایک ہندوستانی قصہ منظوم ہے[1]، مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ مثنوی مولانا روم کے دقائق کو حل کرنے میں وہ اپنے کو یکتا خیال کرتا تھا[2]، اس کے غزل کا رنگ یہ ہے

خشک کنم ز سوز دل دیدۂ اشکبار را　　　چند در آب افگنم آئینہ نگار را

منتظران یار را جلوہ ہر صورتی نکوست　　　سرمہ بود غبار رہ دیدۂ انتظار را

قبلہ مست می کند خانۂ مے فروش را　　　آنکہ بکعبہ می برد سالک ہوشیار را

پاے طلب براہ نہ شرط ادب نگاہ دار　　　چونکہ تو کردی اختیار تہمت اختیار را

چند غمی جہان خوری دل چہ نہی برین چمن　　　باد خزان چو در پے است جلوہ این بہار را

بست گرہ ز خون دل نافہ آہوے ختن　　　تا بگشاد آن غزال طرۂ مشکبار را

ساقی مست را ز پا ساغر بیہشی دہد　　　این مے اگر نمی چشی بس کہ کشتی خمار را[3]

ملا محمد سعید اشرف مازندرانی، ملا محمد صالح مازندرانی کے لڑکے اور ملا محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے اوائل حکومت میں ہندوستان آئے، ان کی استعداد و قابلیت کو دیکھکر عالمگیر نے ان کو زیب النسا کا اتالیق مقرر کیا، ۱۰۹۴ھ میں زیب النسا سے اجازت لے کر اصفہان واپس گئے، پھر واپس آئے تو شہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ عظیم آباد میں رہے، شہزادہ انھیں بہت ہی محبوب رکھتا تھا، باوجود کبرسنی کے انھیں اپنے پاس برابر بٹھائے رہتا تھا، آخر عمر میں بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے کہ مونگیر پہنچکر مالک حقیقی سے جا ملے، یہیں ان کی قبر بھی ہے، ان کے دیوان میں قصائد، قطعات، غزلیات کے علاوہ مثنویات بھی ہیں، ان کی بعض غزلوں کے پسندیدہ اشعار یہ ہیں،

[illegible] گردد　　　[illegible] گردد

[1] [illegible] ص ۱۴۹ - ۱۳۰

[2] [illegible]

ساقیا ساغر بگردش آر تمکین واگذار — کشتی دریا کنان را لنگر و در کار نیست

گشت مستغنی ز وصل اشرف بیاد عارضش — ہمچون آن حافظ کہ مصحف را تمام از بر نوشت

در جوانی روش حالت پیری دارم — چون گل زرد بہارم بخزان می ماند

رفتہ رفتہ ابر و را بر طرف ساز و غضب — آب را چندانکہ جو شانند کمتر می شود[۱]

روشن ضمیر، ایران کا مشہور شاعر تھا، ہندوستان آیا تو عالمگیر نے اس کی سرپرستی کی اور رفتہ رفتہ شاہی منصبداروں میں داخل ہوگیا، جب اورنگزیب شہزادہ شجاع سے لڑ رہا تھا تو ضمیر نے مندرجۂ ذیل تاریخ لکھ کر پیش کی۔

اے حرز تو سورۂ تبارک بادا — پیوستہ ترا تاج مبارک بادا

جستم ز پے مسکون فتحت تاریخ — دل گفت شود فتح مبارک بادا

اورنگزیب کو یہ تاریخ بہت پسند آئی، اس نے انعام میں پانچہزار روپے مرحمت کئے[۲]

عالمگیر نے جب کلام پاک حفظ کیا تو اس موقع پر روشن ضمیر نے یہ تاریخ لکھکر گذرانی۔

محی الدین و مصطفیٰ حافظ تو — صاحب سیفی و مرتضیٰ حافظ تو

تو حامی شرع و حامی تو شارع — تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

عالمگیر نے خوش ہو کر اس کو انعام میں سات ہزار روپے عطا کئے[۳]، وہ کچھ دنوں تک بندر سورت کا واقع نگار اور بخشی کے عہدہ پر بھی مامور رہا[۴]۔

ضمیر ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا مگر اپنی ذہانت اور جودت سے ہندی کا بلند پایہ شاعر ہوا، ہندی میں اس کا تخلص ہتی تھا، خافی خان اس کو امیر خسرو ثانی کہتا ہے، مراۃ الخیال کا مولف ضمیر کی مجلسوں میں شریک رہا ہے،

---

۱ مآثر الکرام ج ۲ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹۔ ۲، ۳ منتخب اللباب از خافی خان جلد دوم ص ۔ ۴ مراۃ الخیال ص ۲۲۸

وہ لکھتا ہے :-

مرزا روشن ضمیر آسمان فضل وکمال کے بدر منیر تھے، بڑے صاحب استعداد و بلند فطرت تھے۔ لطائف خسروی کو عربی اور فارسی میں رائج کیا، اور ہندی کے علم میں اس فن کے استادوں سے آگے بڑھ گئے تھے، ہندی کے اکثر اساتذہ ان کے سامنے تعظیم بجالاتے تھے، فن موسیقی میں اسقدر کمال حاصل کیا تھا، کہ بڑے بڑے ماہرین ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے، چودہ ہزار راگنیوں سے اہل صحبت کو محظوظ کرتے تھے، عربی، فارسی اور ہندی گیت بنا کر طرح طرح سے گاتے تھے، (ص ۲۲۸)

نغمے اور رقص پر ہندی زبان میں پارجاتک ایک مشہور کتاب ہے، ضمیر نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔[1]

رفیع خان باذل کا خاندان مشہد سے ہندوستان شاہجہاں کے زمانہ میں آیا، اس کا چچا مرزا محمد طاہر، وزیر خاں عالمگیر کے زمانہ میں برہان پور، اکبرآباد اور مالوہ کا صوبہ دار رہا، رفیع خاں باذل شاہجہاں آباد میں پیدا ہوا، جوان ہوا تو عالمگیر کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر سرکار بانس بریلی کا فوجدار مقرر ہوا، بڑا قادر الکلام شاعر تھا، فردوسی کے شاہنامہ کی تقلید میں غزوات نبویؐ پر ایک مثنوی حملۂ حیدری لکھی جس میں ماثر الامراء کے مؤلف کے بیان کے مطابق چالیس ہزار اور ماثر الکرام کے مصنف کے مطابق نو ہزار اشعار تھے۔[2]

التفات خان نقدہ صفاہانی طاہر نام مرزا محمد طاہر تھا، اصفہان کا رہنے والا تھا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، مخلص خان کے ذریعہ سے شاہی ملازمت اور منصب حاصل کیا، پہلے التفات خان پھر ملتفت خان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، مضافات اورنگ آباد

[1] ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین، [2] ماثر الامراء جلد سوم ص ۴۶۶ و ماثر الکرام جلد دوم ص ۱۴۳

مین بیڑ کا فوجدار مقرر ہوا، نثر لکھنے مین غیر معمولی مہارت رکھتا تھا، اور ایک ہی وقت مین تین کاتبون کو مختلف عبارتین لکھواتا اور ربط و تحریر کو قائم رکھتا، بلکہ خود بھی کتابت کرتا جاتا تھا

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

مکن گویا بعرض مدعا یارب زبانم را — بہ بند از موی چینی تا بہ قانون فغانم را

شہید نکہتم پوشیدہ ام بعد از فنای خود — برنگ مردۂ فیروزہ نیلی در عزای خود

شہرت حسن تو شد از کشتۂ دیدار تو — از نسیم نالۂ بلبل بشگفد گلزار تو[1]

حکیم محمد کاظم صاحب، عالمگیر کے خاص طبیبون مین سے تھا، ہزاری منصب بھی شاہی دربار سے عطا ہوا تھا، اس نے متعدد مثنویان لکھین، جن مین سے کچھ کے نام یہ ہین، آئینہ خانہ، پری خانہ، ملاحت احمدی، صباحت یوسفی، کمال محمدی، کلیات کو انفاس مسیحی کے نام سے ترتیب دیا تھا، اس کو مصحف شریف کی طرح رحل پر رکھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا، اس نے خود ستائی اور خود بینی مین خود ہی مسیح البیان کا خطاب اختیار کر لیا تھا، اس کے متعلق سرخوش کے جستہ جستہ فقرے یہ ہین:-

"اکثر شعر بطرز مولوی روم می گفت، دیوانے ضخیم پر از رطب و یابس ترتیب دادہ، بہ طبع و استادی خود مغرور بود، از غایت بہ خود غلطی اکثر شعر پوچ و بے معنی می گفت و از مردم چشم تحسین می داشت"

اس کی کچھ رباعیان ملاحظہ ہون:-

بر بالا خط کشیدگان سنبل موست — گل را بگلاب شستگین صفحہ روست

عالم ہمہ اوست لیک نتوان گفتن — شہ را بسر انگشت نمودن نہ نکوست

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۴۵

ما را بخدای خویشتن راہے ہست | در ظلمت تن نور شہنشاہی ہست
چشمک زدن ستارہ بے چیزے نیست | در پردۂ عنبرین شب ماہی ہست

تحسین، غلام علی نام تھا، عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوکر اس کے لڑکے شہزادہ معظم کا ندیم خاص رہا، ۱۰۸۱؁ھ میں شہزادہ لاہور سے عالمگیر کے پاس جارہا تھا کہ راستے میں تحسین سے ترشروئی کے ساتھ گفتگو کی، جس کو وہ برداشت نہ کرسکا، اور راستہ ہی میں جان بحق ہوگیا، اس کے کلام کا رنگ یہ ہے:۔

تب و تاب مہر نبس ترم شد دل کہسار | توان کشود رگ سنگ را بہ نشتر خار
خندہ از یاد لبش چون گنبد مینای من | آب حیوان ریزد از ہر قطرہ صہبای من
مست بیباکم من و یارم بدوش دیگر ست | گردن مینا ست خم از بار عصیان ہای من
در خاک فرو بردہ خیال لب یارم | یاقوت برآید چو کنی سنگ مزارم[1]

صہبائی، نام عبد الباقی، مراۃ العالم میں ہے کہ وہ شاہی ملازموں کے زمرہ میں داخل تھا، مگر ملازمت کی نوعیت معلوم نہیں ہوسکی، خط نستعلیق کا بھی ماہر تھا، مراۃ العالم کے مؤلف کے بیان کے مطابق اس کا کلام نشاط بخش اور شور انگیز ہوتا ہے، اسکے دو شعر یہ ہیں:

لب فرو بستیم از مستی و مدہوشی نیست | سخنی نیست کہ شرمندۂ خاموشی نیست
ز دست سرکشی شانہ سینہ چاک شوم | کہ کاکل تو در آغوش او بہ بوگیرد

مرزا محمد علی ماہر اکبرآبادی۔ اپنے عہد کے اساتذہ فن میں شمار کئے جاتے تھے، کلیم، قدسی اور میر یحییٰ وغیرہ کی صحبت میں ان کے ذوق سخن کا نشو و نما ہوا، کچھ دنوں دانشمند خان شفیعا یزدی کے ہم جلیس رہے، پھر دارا شکوہ نے ان کو اپنے یہاں طلب کر لیا، اور مرید خاص

---

[1] فرحۃ الناظرین ص۳ و مراۃ العالم۔

کا خطاب عطا کیا، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ عالمگیر کے دربار سے بھی وابستہ رہے یا نہیں، مگر اسکی مدح میں ظہوری کے تتبع میں ایک رسالہ گل اورنگ لکھا جس کا انداز یہ ہے :-

در عہد صبی بمقتضای سن اگر ببازی گنجفہ دست کشادی شمشیر سرداگردی وزد سرخ و سفید بخرج دادی تا از مرکب ساز سرکارش نام سیاہی با داغ نشنیدہ یا دام چو پستہ خندان در پوست نگنجیدہ ۵

آزاد از بہر مشق شاہ مدام — چشم خوبان سیاہی با دام

در عہد خوش نویسی اش اندیشہ یاقوت را مناسبتی بنقطہ نویسی نمی بیند، محرران دفتر ہمایونش یاقوت را قطرہ نمی تو لیسند"

مرزا محمد علی ماہر کی طبیعت میں قناعت پسندی اور درویشی تھی، اس لیے ترک دنیا کرکے عزلت نشین ہوگئے، کلمات الشعرا کا مولف محمد افضل سرخوش ان کا محبوب شاگرد تھا، ایک روز سرخوش نے استاد سے عرض کیا کہ دانشمند خان بخشی اور ہمت خان تن بخشی آپ پر مہربان ہیں ان کے ذریعہ سے کیوں نہیں کسی منصب کی کوشش فرماتے ہیں، مرزا محمد علی ماہر نے جواب دیا کہ اب مشہور ہو چکا ہے کہ میں نے دنیا چھوڑ کر فقیری لے لی ہے، اگر دنیا کی طرف رغبت کروں گا تو میرا حال اس ہندو عورت کی طرح ہوگا جو شوہر کے مرنے پر جلنے کو جاتی ہے مگر آگ دیکھکر بھاگنا چاہتی ہے تو بھنگی اس کے سر کو لکڑیوں سے کچل کر اس کو جلا دیتے ہیں، چنانچہ آخر وقت تک صبر و قناعت ہی کے ساتھ زندگی بسر کی، انکے دیوان کو سرخوش نے مرتب کیا تھا، ماہر نے متعدد مثنویاں بھی لکھیں جن میں ایک مثنوی جامع نشاتین ہے، یہ تحفۃ العراقین کی بحر میں ہے، سرخوش نے اپنے استاد کے جن اشعار کو خاص طور سے پسند کیا ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں،

چشم چگونہ دیدن رویت ہوس کند — نظارہ بر چراغ تو کار نفس کند

می کشد معشوق از پہلوی عاشق دلبری | از پر خود شمع را پروانہ می سازد پری
تا بدل گردیدہ ام خورسند عالم از من است | در قناعت مور دانہ یک دانہ حبیب عنقا خرمن است
بسکہ در ہجر تو چون نال قلم کاہیدہ ام | از تنم صد پیرہن بالیدہ تر پیراہن است
دود یار سوز و انہ اند و فغان بلند کشد | مے دود آتشہ در سوختن سپند کشد

محمد افضل سرخوش، ۱۰۵۰ھ مین کشمیر مین پیدا ہوا، اس کا باپ محمد زاہد شاہجہانی امیر عبداللہ خان زخمی کی سرکار مین ملازم تھا، سرخوش بھی اس امیر کے ملازمون کے زمرہ مین داخل ہوا، پھر اس کی وفات کے بعد نواب بخشی الممالک روح اللہ خان کی وساطت سے عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوا، وہان سے اس کو منصب ملا، اور ۱۱۰۰ھ مین حسن ابدال مین مشرفی عدالت کے عہدہ پر مامور ہوا، سرخوش نے عالمگیر کے دربار سے اپنی وابستگی کو فخر و امتیاز کے ساتھ لکھا ہے:-

خادم درویشان بلکہ خاکپای ایشان محمد افضل سرخوش از خانہ زادان شاہ عالمگیر است

آخر مین شاہجہان آباد مین خوشحالی اور عزلت نشینی کی زندگی بسر کی، چہتر سال کی عمر مین ۱۱۲۶ھ وفات پائی، شاعری مین مرزا محمد علی ماہر اکبرآبادی، منعم حکاک شیرازی اور میر معز موسوی خان سے فیض حاصل کیا، مرزا محمد علی ماہر اور موسوی خان اس کی شاعرانہ صلاحیتون کے بیحد معترف تھے، مرزا محمد علی کو اس کی شاگردی پر فخر تھا، موسوی خان نے ہندوستان کے صرف تین شاعرون کو تسلیم کیا تھا، جن مین سے ایک سرخوش تھا، بقیہ دو ناصر علی اور غنی کشمیری تھے، سرخوش نے بھی لائق شاگرد پیدا کئے، بندرابن خوشگو، حافظ محمد جمال تلاش، تنعم بیراگی، شیخ اللہ گلشن، عبدالرحیم لنگو کشمیری اور حکم چند ندرت وغیرہ اسی کے شاگرد تھے، سرخوش نے اپنا دیوان خود ہی مرتب کیا تھا، اس مین تقریباً ۵ ہزار اشعار تھے، اس کے علاوہ بہت سی

مثنویاں بھی لکھیں، مثلاً مثنوی نورٌ علیٰ نور، مثنوی حسن و عشق، مثنوی قضا و قدر، مثنوی در بعض خصوصیات ہندوستان، جنگ نامۂ محمد اعظم، مثنوی در تعریف غسخانہ، جامی کی لوائح کے تتبع میں ایک رسالہ روائح بھی لکھا، نثر میں اس کی ایک کتاب جوش و خروش ہے، مگر اس کی سب سے اہم تصنیف کلمات الشعرا ہے جس میں جہانگیر سے لے کر عالمگیر کے عہد تک کے شعرا سے متعلق بہت مفید اور دلچسپ معلومات ہیں، اور اس زمانہ کے مذاق کے مطابق ان کی شاعری پر تنقید و تبصرہ بھی ہے، بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے مختلف تذکروں میں اس کا جا بجا حوالہ دیا ہے جو اس کی اہمیت کی دلیل ہے، سرخوش نے اپنے جو منتخب اشعار پیش کیے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں :-

ہوشیاری را حجاب یاری دانیم ما ... بیخودی را بزم بے اغیاری دانیم ما
تیز می سازد بقتل عاشقان شمشیر را ... این قدر ہم رحم از دلبیاری دانیم ما
نظرے بر گل شبنم زدہ افتاد مرا ... آمد از زخم نمک سود جگر یاد مرا
ز چشم شوخ کردی تیرہ روز لالہ و گل را ... بخاک سرمہ کشتی شعلۂ آواز بلبل را
غنچۂ تبسم بہ نازنینم لب شکند ... برگ گل در زیر پالیش کم ز تخت شیشہ نیست
خواہی کہ قدم براہ حق بگذاری ... باید کہ بکف دامن پیری آری
بے آئینہ چہرہ در نگیرد ہرگز ... یک عمر اگر در آفتابش داری
از بادہ مرا فزون شود عقل و شعور ... ساغر خضر رہ نشاط است و سرور
می روشنی طبع بود سرخوش را ... روغن ہمہ در چراغ گردد نور

ناصر علی سرہندی اور غنی کشمیری بھی اس عہد کے مشہور اور مقبول شاعر تھے، مگر دونوں اپنی

مله اورینٹل کالج لاہور کی اور مفید مطبوعات کے ساتھ یہ کتاب بھی شائع ہو گئی ہے، مگر راقم الحروف نے زیادہ تر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے،

قناعت پسندی کی وجہ سے شاہی دربار سے بے نیاز رہے، اس دور کے اور دوسرے شعراء کے نام یہ ہیں، عبدالرسول، اسیر لاہوری، آصف عمر، افسری، اعجاز اکبرآبادی، جعفر نبیرہ آصف خان، سیادت لاہوری، ضیاء الدین خیرآبادی، عارف لاہوری، سید کبیر علوی، ملا سعد اللہ غریب، عبدالوہاب عنایتی، فیضا، عبداللطیف قیصر، احمد بیگ کامل، منیر لاہوری، شیخ نورالحق مشرقی، نسبتی، عبدالاحد وحدت وغیرہ۔

امراء | تیموریوں کے دور حکومت میں علم پروری وعلم نوازی شان امارت میں داخل تھی، اسلئے امرائے عالمگیر بھی اپنی محفلوں کو علم وادب اور شعر و سخن سے پررونق رکھا، اور ان میں بھی ادب انشاء پرداز، سخن سنج اور سخن فہم پیدا ہوئے۔

علاء الملک تونی فاضل خان عالمگیر کا پہلا وزیر اعظم ہوا، وہ معقولات، منقولات، الہیات، طبیعیات، ریاضیات اور نجوم وہیئت کا جید عالم تھا[1]، ادب و انشاء میں اس کو بڑی مہارت حاصل تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ محمد وارث کی بادشاہ نامہ میں کچھ حصہ فاضل خان ہی کا نوشتہ ہے، عالمگیر کے عہد میں اہم شاہی فرمان وہی لکھا کرتا تھا[2]،

محمد اسمٰعیل ذوالفقار خان نصرت جنگ عالمگیر کے آخری وزیر اعظم اسد خان آصف الدولہ کا لڑکا تھا، آصف خان یمین الدولہ کی لڑکی مہرالنساء بیگم کے بطن سے پیدا ہوا، عالمگیر نے اس کو مختلف ملکی وحربی خدمات کے صلہ میں ذوالفقار خان اور نصرت خان کا خطاب اور پنجہزاری منصب عطا کیا، وہ شاعر بھی تھا اور شعراء کا سرپرست بھی، اور اس سلسلہ میں اس کی فیاضی

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۵۳۲ میں ہے "در فنون حکمت طبیعی و ریاضی از یکتایان روزگار بود، سیادر علم ہیئت و نجوم گوے سبقت از ہمہ اینہمہ می ربود و باکثرت فضل و کمال مایۂ وفا عشق و ستودہ العمل وافشون خان" [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵،

کی بڑی شہرت تھی، ناصر علی سرہندی جس کو سرخوش نے "ابروے ہندوستان" لکھا ہے، کچھ دنوں دربار سے بھی وابستہ رہا، ناصر ایک غزل کے مطلع میں ذوالفقار کو مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار　　　نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

ذوالفقار خان نے خوش ہوکر ایک بڑی رقم اور ایک ہاتھی انعام میں دیا، مگر ناصر علی نے اسی وقت ہاتھی اور روپے لوگوں میں تقسیم کردیئے اور گھر خالی ہاتھ واپس آیا، ذوالفقار خان نے ۱۱۰۳ھ میں کرناٹک پر فوج کشی کی، اس نواح میں حضرت شاہ حمید سے ملا تو ان کا گرویدہ ہوگیا، ان کی مدح میں کہتا ہے:

اینک اینک ساقی شیرین رسید　　　نوبت جام حمید الدین رسید

حلقۂ درگاہ بیچون جام او　　　از زمین تا آسمان درو ام او

جام او خورشید ربانی بود　　　انجمن افروز سبحانی بود

گر جمال او بر اندازد نقاب　　　روزن ہر خانہ گردد آفتاب

در جلالش بر کشد تیغ از نیام　　　غیر او باقی نماند والسلام

سیف خان، بن تربیت خان بخشی شاہجہانی عالمگیر کے زمانہ میں پہلے کشمیر اور پھر الہ آباد کا صوبہ دار تھا، مآثر الامراء جلد دوم (ص ۴۸۴) میں ہے:

"مرد مشرب بہم و شنع بود، اما قابلیت و مساس شعر و سخن دارد"

ناصر علی سرہندی کو اس سے بڑی شیفتگی تھی، چنانچہ کہتا ہے:

گفت و گوی طوطی از آئینہ می خیزد علی　　　گر نباشد سیف خان از نفس در کار نیست

سیف خان فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا، اس فن میں ایک رسالہ راگ درپن لکھا جو درحقیقت ایک مستند ہندی کتاب مانک سوہل کا اضافہ کے ساتھ ترجمہ ہے،

مآثر الامراء ج ۲ ص ۱۰۴ ... ج ۲ ص ۱۳۰

جعفر الہ وردی خان، کچھ دنون متھرا، گورکھپور اور مرادآباد کا فوجدار رہا، دسوین سال جلوس مین اس کو منصب چہار ہزاری سہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ ملا، اور الہ آباد کا ناظم مقرر ہوا، بارہوین سنہ جلوس مین وفات پائی، اپنی شجاعت اور سخاوت مین مشہور ہونے کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی ذوق رکھتا تھا، اور اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا، اس کا ایک شعر یہ ہے:

کمتر ز قفا شقہ نتوان بود طلب　　　صد تیشہ می خورد کہ رساند لبے بلب[1]

منعم خان۔ اکبرآباد کے کوتوال سلطان لاکس کا لڑکا تھا، حضرت شیخ کلیم اللہ سے تعلیم پائی، عالمگیر کے عہد مین مختلف عہدون پر فائز رہا، آخر مین جموں کا فوجدار رہا، مگر بہادر شاہ کے دور حکومت میں اپنی خدمات کی بنا پر ترقی کرکے سپہ سالار کے عہدہ پر مامور ہوا، اور خانخانان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اپنی تلوار کی جھنکار دن مین شعر و سخن کے نغمے بھی بلند کرتا تھا، کہتا ہے:۔

بلبل از نالہ گل از جنون دل ایجاد کنم　　　عالم ناز و نیاز دگر آباد کنم

رفت مجنون فراست بیابان جنون　　　گرد باد دگر از خاک خود ایجاد کنم[2]

اس نے شیخ محمدی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت بھی حاصل کیا تھا اسی کے اثر سے اسکی شاعری مین بادۂ تصوف کی سرمستیان بھی آ گئی تھین، حقائق و معارف پر ایک رسالہ الہامات منعمی تحریر کیا،[3]

اسلام خان میر ضیاء الدین حسین بدخشی، عالمگیر کی شہزادگی کے زمانے سے اس کے ساتھ رہا، جنگ جانشینی مین دارا شکوہ اور شجاع کے خلاف لڑائیون مین بہت ہی مفید خدمات انجام دین، عالمگیر نے خوش ہو کر اس کو اچھے اچھے عہدے دیئے، چوتھے سال جلوس مین وہ کشمیر

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۳۱ [2] مخزن الغرائب ورق ۱۴۱۲ [3] مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۷۵

کا اور چھٹے سال میں الٰہ آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور پنج ہزاری سہ ہزار سوار کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، مگر اسی سال وفات پائی، وہ الٰہی[1] تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا[2] میں ہے

"اسلام خان خالی از کمال نبود، واشعار آبدار از جوبیار طبع نکتہ بارش ترادش می کرد" (ج ۱ ص ۲۲۰)

اس تعریف کے بعد اس کے دو مشہور شعر بھی نقل کیے ہیں،

بے تو شام غم بروز شبیخون می زند   مردم چشمم زگریہ غوطہ در خون می زند

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش   لشکر آہ من از دل خیمہ بیرون می زند

ہمت خان میر عیسیٰ۔ اسلام خان بدخشی کا لڑکا تھا، عالمگیر نے ایام طفلی ہی سے اس کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی، مآثر الامرا کے مولف کا بیان ہے کہ اسی شاہانہ نوازش کی وجہ سے میر عیسیٰ جامع فضل و کمال ہوا، جسونت سنگھ کے محاربہ کے بعد عالمگیر نے اس کو منصب اور ہمت خان کا خطاب دیا، مختلف عہدوں پر رہنے کے بعد آخر عمر میں اجمیر میں بخشی اول کے عہدہ پر مامور ہوا، مآثر الامرا میں ہے:

"از مستعدان روزگار بود، در ہمسران سرآمد اقوام، فصاحت و بلاغت از نظم و نثر بر صفحہ یادگار نگاشتہ" (جلد سوم ص ۹۴۸)

ہندی اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتا تھا، ہندی میں اس کا تخلص میرن تھا، فارسی میں اس کے دو شعر یہ ہیں:

بجز خارے کہ مجنون داشت در دل   بیابان جنون خارے ندارد[5]

من چہ گویم کہ چہ مقدار ید ل نزدیکی   چشم بد دور کہ بسیار بدل نزدیکی[5]

---

[1] فرحۃ الناظرین ص ۱۰۶، [2] مآثر الامرا ج ۳ ص ۹۴۸، [5] کلمات الشعراء قلمی نسخہ

میرک معین الدین احمد امانت خان - کابل اور دکن کی دیوانی کی خدمت انجام دی، مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ اس کی زندگی عام امراء کے طرز زندگی سے مختلف تھی، دنیادارن کے اوصاف اس میں نہ تھے، فضل و کمال سے متصف تھا، ترجمۂ شرعۃ الاسلام، اس کی خاص کتاب تھی، جس میں آداب شریعت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، خط شکستہ و نستعلیق جاننے کے علاوہ صاحب دل اور صاحب عرفان بھی تھا، اس کا ایک لڑکا وزارت خان گرامی شاعر تھا۔[۱]

سید حسین امتیاز خان خالص۔ اصفہان سے ہندوستان آیا، عالمگیر نے اس کو صوبہ عظیم آباد پٹنہ کا دیوان مقرر کرکے امتیاز خان کا خطاب دیا، آزاد بلگرامی اس کے کلام کی صفائی کے معترف ہیں، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

رسید فصل بہار و زمانہ گلچین است — سپند آتش می شو چہ وقت تمکین است

نیست بے لطفی جواب نامہ گر ننوشتہ دوست — از زبان خامہ مارا یا د نتوانست کرد

ساقی بیا کہ فصل خزان شور می رسد — اے مے تو ہم برس کہ سفر می کند بہار

لطف حق را کرد پیدا ظلمت عصیان غضب — آب در بار اشب تاریک آتش می کند[۲]

احمد یار خان یکتا۔ ٹھٹھہ کا صوبہ دار تھا، مختلف قسم کے علوم و فنون حاصل کئے، خطاطی میں اس کو بڑی مہارت تھی، خط نسخ میں ایک کلام پاک لکھ کر میر عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں پیش کیا، شعر و شاعری میں اساتذۂ فن سے معرکہ آرا ہوتا تھا۔ لاہور کے ایک شاعر محمد عاقل کا تخلص بھی یکتا تھا، اس نے احمد یار خان سے اصرار کیا کہ وہ اس کے حق میں اپنے تخلص سے دستبردار ہوجائے، احمد یار خان نے کہا کہ ایک طرحی غزل ہم دونوں کہیں، اور جس کی غزل بہتر ہو وہی اس تخلص کا مستحق ہو، چنانچہ دونوں نے غزلیں کہیں، اور اساتذۂ فن کے سامنے پڑھی گئیں،

---

[۱] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۶۷ ، [۲] مآثر الکرام جلد دوم ص ۱۶۱

احمد یار خان کی غزل سننے کے بعد محمد عاقل کے لب پر مہر سکوت لگ گئی، اور اپنی غزل پڑھنے سے انکار کردیا، پھر تمام حاضرین نے ایک محضر پر دستخط کیا کہ

برین معنی گواہیم آفرین ما — کہ احمد یار خان یکتا ست یکتا

احمد یار خان کی وہ طرحی غزل یہ تھی:-

تا خطش طرح جہانگیری کاؤسی گرفت — لشکر زنگ چو رومی بسر روسی ریخت

بامیدیکہ شود جلوہ گر آن سرو روان — خاک شد جبہہ و در راہ قدم بوسی ریخت

سرمہ آلود نگاہی کہ بیاد م آمد — کہ سرشک شفقے از مژہ ام طوسی ریخت

بر در بتکدہ از نالۂ زارم ناقوس — ہم تن اشک شد و در پا قوسی ریخت

شمع از اشک رخش بوقلمون سوخت بہ بزم — جاے اشکش ہمہ خاکستر طاؤسی ریخت[1]

موسوی خان مرزا معز الدین محمد **فطرت**، نسباً امام ضامن ثامن موسیٰ الرضا کی اولاد میں سے تھا، اور میر محمد زمان مشہدی کا نواسہ تھا، عین شباب کے زمانہ میں اپنے باپ مرزا فخرو سے خفا ہوکر اصفہان چلا آیا، جہاں آقا حسین خوانساری سے علوم و فنون کی تحصیل کی، بہت ہی ذہین و فہیم تھا، اس لیے علوم عقلیہ میں بڑا درک حاصل کیا، ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آیا، تو اورنگزیب نے اس میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھکر اپنے لطف و کرم سے مالا مال کیا، شاہ نواز خان کی لڑکی یعنی شاہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے اس کی شادی ہوئی اور وہ عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا، لیکن وہاں کے ناظم سے اس کا اتفاق نہ رہا، اس لیے واپس بلالیا گیا، ۱۰۹۹ھ میں موسوی خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور دیوان تن مقرر ہوا، ایک سال کے بعد تمام دکن کا دیوان ہوا، ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی[2]، مرزا معز الدین بہت ہی خود دار اور نازک مزاج تھا، ایک موقع پر عالمگیر کو اس سے

---

[1] مآثر الکرام ج ۲ ص ۲ ، [2] مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۳۳، و نیز مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۲۳

رنجش پیدا ہوگئی، اور وہ تھوڑے دنوں تک شاہی التفات سے محروم رہا، مگر وہ بھی اپنی خودداری کے باعث بے نیاز رہا، جب لوگوں نے سمجھایا کہ بادشاہ سے اپنی تقصیر کی معافی مانگو، تو اس نے ایک معروضہ لکھا، جس میں یہ شعر تھے،

در طلب ما بے زبانان امت پروانہ ایم — سوختن، از عرض مطلب پیش من آسان ترا ست

شد از غرور غلامی زبان عرض خموش — مرا براہ خطا، این صدا بہا انداخت

از موج فیض بحر کرم را قرار نیست — اہل سوال بیہودہ ابرام می کنند

عالمگیر نے اس درخواست کو پڑھا تو یہ لکھا،

بے زبانی می کشاید بندہائے سخت را — در قفس طوطی ز منقار سخنگوئے خود است

لیکن :-

ہیچ مردے در پئے اصلاح خوئے خویش نیست — ہر کرا دیدم در آزار خیش خوئے خود است

"بموجب حدیث السلطان ظل اللہ ہر گاہ سلطان عصر با نوکران خود التجا مطلب او کند او جواب باین خوبی می دہد، از اخلاق بعید است کہ التفات بحال او نشود"[۱]

مگر موسوی خان کا اصلی جوہر اس کی شاعری میں کھلتا ہے، شروع میں فطرت تخلص کرتا تھا، مگر آخر میں اس کو موسوی سے بدل دیا، کلمات الشعرا کا مؤلف محمد افضل سرخوش اس کا شاگرد اور ہمجلیس تھا، سرخوش نے اس کی معنیٰ آفرینی، شعر فہمی اور انشا پردازی کی بہت تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ ایسا باکمال اہل علم ایران میں بھی کم پیدا ہوا، شاید یہ توصیفی کلمات ایک شاگرد نے غایت محبت و احترام میں لکھے ہوں موسوی خان بھی سرخوش کا بڑا مداح تھا، اور کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں صرف تین ہی شاعر ہیں، غنی، ناصر علی اور سرخوش، مگر اس میں

---

[۱] وقائع عالمگیری ص ۳۷،

شک نہین کہ موسوی خان بھی اپنے عہد کا ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھا، مآثر الامراء کے مولف نے بھی اسکی دقت آفرینی کی داد دی ہے، سرخوش نے اپنے ممدوح کے جو خاص خاص اشعار پسند کئے ہین ان مین سے کچھ یہ ہین

شدم خاک و ہنوز از عشق او آتش بجان دارم ۔۔۔ در آغوش کفن حسبی چو تپ در استخوان دارم

ما طائر عشقیم و قفس بال و پر ماست ۔۔۔ چون بوی گل چیدہ وطن ہمسفر ماست

چہ سوز عشق را کامل کنی عیبت ہنر گردد ۔۔۔ شود یاقوت ہر سنگی کہ لبریز شرر گردد

ندارد آفتی چون غنچہ از صرصر چراغ من ۔۔۔ برنگ لالہ در آغوش ناخن خفتہ چراغ من

آتشم در تہ پا بود دفے ہمچو سپند ۔۔۔ کام اول نفسم سوخت آئین راہ مپرس

مرد حق در عین دنیاداری از دنیا بریست ۔۔۔ ملک در دست سلیمان نیست در انگشتریست

این سبیہ مستی مرا از بادہ خود بر دریست ۔۔۔ شیشہ تا موج شکستن می زند بال پریست

عشق در مصر جنون لاف خدائی می زند ۔۔۔ حسن گر یوسف شود در کسوت پیغمبریست

بختاور خان ۔ عالمگیر کا بہت ہی محبوب ملازم اور دربار کا بڑا ذی اثر اور ذی علم امیر تھا، مآثر عالمگیری کا مولف اس کا منشی اور دیوان تھا، جب اس کا انتقال ہوا، تو مآثر عالمگیری مین لکھتا ہے :-

۱۵ ربیع الاول (سنہ۱۰۹۵ھ) بختاور خان داروغہ خواصان نے رحلت کی، بادشاہ خادم نواز کو مرحوم ملازم کے، جو مصاحب، رازدان، اور مالک کا مزاج دان ہونے کے علاوہ صاحب فہم و فراست و بزرگ منش خادم بھی تھا، اور جس نے ۳۰ سال کامل جان نثاری کے ساتھ خدمت کی تھی، انتقال سے بیحد افسوس ہوا، فرمان مبارک کے موافق بختاور خان کا جنازہ عدالت گاہ کی طرف لایا گیا، اور خود قبلہ عالم نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی،

اور چند قدم جنازہ کے ہمراہ تشریف لے گئے، جہان پناہ نے مرحوم کے فاتحہ و نیز اس کے نام پر خیرات و مبرات جاری کرنے کے احکام صادر فرمائے، بختاور خان کی لاش حسب الحکم تخت گاہ کو روانہ اور خود مرحوم کی تیار کردہ قبر میں پیوند خاک کی گئی، بختاور خان مرحوم علما و فقرا و شعرا کو بحد عزیز رکھتا تھا، اور جیسا کہ پیشتر مذکور ہوا، اہل ہنر و باکمال حضرات کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا کرتا تھا، فن انشا و تاریخ دانی میں اچھی مہارت رکھتا تھا، مرحوم کی تصنیف و تالیف میں نسخہ مراۃ العالم یادگار زمانہ و مقبول خاص و عام ہے، یہ امیر تہذیب اخلاق و خیر خواہی خلائق میں عدیم المثال تھا، رحمہ اللہ، (ص ۱۷۹)

مراۃ العالم کا تاریخی نام آئینہ بخت (۱۰۷۸ھ) ہے، اس کے مختلف ابواب (آرایش) ہیں پیغمبر اسلام کے علاوہ خلفاء، سلاطین، ائمہ، مشائخ، فلاسفہ، علما، شعراء، خوشنویس وغیرہ وغیرہ کے اجمالی حالات درج کئے گئے ہیں، آخر میں عالمگیر کے عہد حکومت کی دس سالہ تاریخ ہے، اس کے اوصاف حمیدہ، اور اس کی سلطنت کے مختلف حصوں کا بھی ذکر ہے، پھر اکبر سے لے کر عالمگیر کے عہد تک کے مشائخ علما، اور شعراء کے بھی حالات ہیں، یہ اس دور کی اہم تاریخی کتابوں میں سے ہے، مراۃ العالم ہی میں مذکور ہے کہ بختاور خان نے کچھ اور کتابیں بھی لکھیں (۱) چہار آئینہ جس میں اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کے سلسلہ میں چار لڑائیوں کا ذکر ہے (۲) ریاض الاولیا جس میں مشائخ کے حالات ہیں (۳) سواد اعظم جو شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے (۴) ملخص تاریخ الفی (۵) سنائی کی حدیقہ، فرید الدین عطار کی منطق الطیر، مولانا روم کی مثنوی، اور روضۃ الاحباب کا بھی ایک ملخص تیار کیا، اپنی علم پروری کی وجہ سے شعراء اور فضلاء کو بے حد عزیز رکھتا تھا، شعراء بھی اس کی بڑی قدر کرتے تھے، کمال الدین افسری نے اس کی مدح میں دس ہزار اشعار لکھے تھے[۱]، جن میں عالمگیر کی فتوحات کا بھی ذکر تھا[۲]، غلام علی تحسین اور عبد اللطیف فخر[۳]

[۱] نزہۃ الناظرین ص ۸۹
[۲] مراۃ العالم ورق ۳۸۷
[۳] نزہۃ الناظرین ص ۱۰۳

بھی اس کی شان میں لمبے لمبے قصائد کہے، ملا سید کبیر علوی بھی اس کی سرپرستی میں رہے، یہ اپنے زمانہ کے جید عالم اور اچھے شاعر تھے، بختاور خان نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اسی میں ملا سید کبیر طلبہ کو درس دیتے تھے، بختاور خان شیخ محمد بقا بقائی کا بھی مربی رہا، شیخ صاحب شیخ نور الحق ابن مولانا عبد الحق دہلوی کے شاگرد، اور شیخ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، افتخار خان میر خانساماں کی وساطت سے شاہی دربار کے ملازموں کے زمرہ میں داخل ہوئے، مگر شاہی نوازشوں کی وجہ سے زیادہ تر وقت علمی مشاغل میں گذارتے تھے، بختاور خان سے ان کے گہرے مراسم تھے، ان کی مشہور اور اہم تصنیف مراۃ جہاں نما ہے جس کا موضوع مراۃ العالم سے ملتا جلتا ہے[۲]، ان کی طرف ایسی کتابیں بھی منسوب ہیں جن کو بختاور خان کی تصنیف کہا جاتا ہے،

ہندو فضلاء و شعراء عالمگیر کی سرپرستی نہ صرف مسلمان فضلاء و شعرا تک محدود رہی، بلکہ اس نے ہندو اہل علم و کمال کو بھی اپنا رہین منت بنایا، ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر داس اور بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب ہی کے سایۂ عاطفت میں بڑھا، چنتامنی کے توسل سے بھوشن کوی دہلی مغل دربار میں پہنچا، اور وہاں عرصہ تک رہا، کئی اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتا ہے کہ سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے فنون اور علوم کا دلدادہ نہ تھا، لیکن ہندی کے ہندو شعراء دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے، بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ رہے، اسی حقیقت کو مولانا شبلی اس طرح واضح کرتے ہیں کہ "عام خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت

---

[۱] فرحۃ الناظرین ورق ۔ [۲] یہ ایک متنازعہ فیہ بحث ہے کہ بختاور خان نے مراۃ العالم خود ہی لکھی، یا شیخ محمد بقا سے لکھوائی دیکھو ایلیٹ ج ۷، ہم مراۃ العالم کو مآثر عالمگیری کے بیان کے مطابق بختاور خان ہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں،

رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر اس کے زمانہ مین توجہ کی، پہلے نہیں[1] کی،

عالمگیر کے مسلمان درباریون مین علاوہ روشن ضمیر کے وانا[2] اور عبدالجلیل بلگرامی بھاشا کے بہت ہی ممتاز شاعر تھے، اسی طرح ہند و درباریون مین فارسی کے بہت قابل قدر ادیب شاعر اور مورخ تھے، جو عالمگیر کے ابر لطف وکرم سے برابر سیراب ہوتے رہے، ان مین سے چند کے احوال ملاحظہ ہون،

وامق کھتری۔ امرائے عالمگیری مین سے ایک امیر کا وکیل تھا، اس کے نظم ونثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی کہ اس کو سن کر شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، تحسین و آفرین کہتا تھا،

رائے بندرابن۔ رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے سنہ ۳۱ جلوس شاہجہانی مین حسن خدمات کے صلہ مین رائے کا خطاب پایا تھا، دارا شکوہ نے اس کو اپنا دیوان مقرر کیا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دی، اور رائے کا خطاب بخشا، وہ بہادر شاہ کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے اس کی ملازمت مین رہا، اس لیے بندرابن بہادر شاہی کہلاتا تھا، لب التواریخ کے نام سے ایک کتاب اپنی بہترین یادگار چھوڑی ہے، اس مین شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ھ تک کے حالات ہین، اس مین کہین کہین عربی آمیز فارسی اس خوبی سے لکھی گئی ہے کہ بعض اوقات مصنف کے ایرانی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے،

ایسر داس، قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا، ۳۰ سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب کی خدمت مین تحصیل علم کرتا رہا، شاہی ملازمین مین منسلک ہو کر جودھپور کا امین مقرر ہوا، اس نے میدان جنگ مین مفید خدمات انجام دین اور دولت و پنج صدی افسر مقرر

---

[1] مقالات شبلی حصہ دوم ص۸۵، [2] اسکی نسبت علامہ علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ نظم ہندی بسیار خوب گفتہ

ہوا، فتوحات عالمگیری اس کی ایک علمی یادگار ہے، جس مین ۱۶۵۷ء سے ۱۶۹۵ء تک کے واقعات ہیں،

بھیم سین کایستھ۔ شاہی ملازمت بین بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیون مین بہت ہی کارآمد ثابت ہوا، تو عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا، پھر قلعہ نالدرک کا قلعہ دار ہوا، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی جو بہت اہم سمجھی جاتی ہے،

سوجان رائے کھتری بٹالہ کا رہنے والا تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک پر از معلومات تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی، اور عالمگیر کے نام سے معنون کی،

اس عہد مین ہندوؤن کے علوم وفنون کو فارسی زبان مین منتقل کرنے کی کوششیں کی گئیں وہ عالمگیر کو بدنام کرنے والے اصحاب اور مؤرخون کے لئے بصیرت افروز ہے، میرزا خان بن فخرالدین محمد نے شاہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تحفۃ الہند تصنیف[1] کی جس کا موضوع ہندوؤن کا فن بلاغت اور عروض وقافیہ وغیرہ ہے

ابو سعید الحسینی الرضوی الشیرازی نے ۳۷ھ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۰۳ھ مین ہندو علوم ہیئت ونجوم پر نظام النجم کے نام سے ایک کتاب لکھی[2]، اس عہد کی دو اور عجیب کتابین ہین ہفت اختر اور رد الکفر دونون ہندوؤن کے رسوم وعقائد پر ہین، پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہے جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤن کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا مصنف لال لعل بہاری ولد کاہید سنگھ ہے، جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی کا متوسل تھا، لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ مین عالمگیر کو جن الفاظ اور خلوص وعقیدت سے یاد کیا ہے

[1] اس کتاب پر مولینا شبلی کا مضمون مقالات شبلی ادبی جلد دوم مین ملاحظہ ہو [2] اس کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین اعظم گڈہ مین موجود ہے،

وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لائق ہے[1]، دوسری کتاب رد الکفر ایک نو مسلم کی لکھی ہوئی ہے جس میں ہندوؤں کے عقائد پر تبصرہ کیا ہے[2]۔

مورخین اورنگ زیب کے درباری مورخین کی تعداد زیادہ نہیں، وقائع و اخبار نویسوں کے علاوہ صرف ایک درباری مورخ منشی محمد کاظم تھا جس نے عالمگیر کی حکومت کے دہ سالہ واقعات عالمگیرنامہ میں لکھے ہیں، منشی محمد کاظم، مرزا محمد امین منشی مصنف پادشاہ نامہ کا لڑکا تھا، اس کے ادب و انشاء کے چند نمونوں کو دیکھکر عالمگیر نے اسے اپنے عہد کے حالات لکھنے کے لیے مامور کیا، لیکن دس سال کے واقعات لکھنے پایا تھا کہ عالمگیر نے دربار کے محکمۂ تاریخ نویسی کو بالکل ختم کردیا، اس کی خاکسار طبیعت پسند نہیں کرتی تھی کہ اس کے مفاخر و مکارم کی داستان گوئی کے لیے ایک سرکاری محکمہ قائم رہے، عالمگیرنامہ کے مقدمہ میں ہے:۔

چونکہ بندگان عالی اپنے قدرتی علم اور بلند حوصلگی کی بنا پر ظاہری چیزوں کے بقا و قیام کو ان کے فنا ہونے پر ترجیح نہیں دیتے تھے، اس لیے روحانی خوبیوں کی تعمیر کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اس لیے دس سال کے واقعات لکھنے کے بعد حکم دیا کہ عالمگیرنامہ کا مصنف محمد کاظم جو ان کے مفاخر و مکارم کی داستان بیان کرتا تھا، اس کے بعد کے واقعات کو قید تحریر میں نہ لائے، اس لیے اس نے اسی پر اکتفا کیا،

مآثر عالمگیری کا مصنف بھی اپنے دیباچہ میں اسی بات کو ظاہر کرتا ہے،

کتاب عالمگیرنامہ مصنفہ مرزا محمد کاظم میں بادشاہ دین پناہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ واسعۃ کے عہد سلطنت کے صرف دہ سالہ واقعات

---

[1] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ لائبریری دہلی میں موجود ہے، اس پر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون معارف نمبر ۵ جلد ۲۳ میں ملاحظہ ہو، [2] ایضاً

مندرج ہین، جن کا خلاصہ سابقہ اوراق مین ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے، مرزا محمد کاظم عہد سلطانی کے بیشتر واقعات اس وجہ سے قلم بند نہ کر سکے کہ بادشاہ دین پناہ باطنی آرایش کے مقابلہ مین ظاہری نام و نمود کو قطعاً ہیچ تصور فرماتے تھے، اس لیے راقم مرحوم کو عہد معدلت کے حالات لکھنے سے ممانعت فرما دی گئی،

مگر آزاد اہل قلم جن مین ہندو اور مسلمان دونون شامل تھے اس عہد کی تاریخ برابر لکھتے رہے، جن مین سے کچھ کے نام یہ ہین، واقعات عالمگیری مصنفہ امیر خان، عجیبہ غریبہ مؤلفہ شہاب طالش (۱۰۷۳ھ)، واقعات عالمگیر مؤلفہ عاقل خان رازی، تاریخ شاہ شجاعی مصنفہ میر محمد معصوم (۱۰۷۰ھ) مراۃ العالم مؤلفہ بختاور خان، مراۃ جہان نما مصنفہ شیخ محمد بقا، ان دونون کا ذکر پہلے آ چکا ہے، زینۃ التواریخ مؤلفہ عزیز اللہ (۱۰۸۶ھ)، وقائع نعمت خان عالی، جواہر التاریخ مؤلفہ سلمان قزوینی، فتوحات عالمگیری مصنفہ ایسر داس، نسخۂ دلکشا مؤلفہ بھیم سین (۱۱۲۰ھ)، منتخب التواریخ مؤلفہ جگ جیون داس (۱۱۲۰ھ)، لب التواریخ ہند مؤلفہ رائے بندرابن، خلاصۃ التواریخ مؤلفہ سبحان رائے (۱۱۰۷ھ)، موخر الذکر دونون کتابین عالمگیر کے نام سے معنون ہین،[1]

محمد ساقی مستعد خان ساقی نے مآثر عالمگیری لکھکر عالمگیر کی پچاس سالہ حکومت کی مکمل تاریخ پیش کر دی ہے، مستعد خان ساقی کو عالمگیر نے وقائع نگار کے عہدہ پر مامور کیا تھا، جس کی وجہ سے اس کو ہر وقت بادشاہ کا تقرب حاصل رہا، عالمگیر کی وفات کے بعد وہ بہادر شاہ کے صدر دیوان وزارت عنایت اللہ کا منشی مقرر ہوا، اور عنایت اللہ خان کی فرمایش ہی سے اس نے مآثر عالمگیری لکھنی شروع کی، جو ۱۱۲۲ھ یعنی عالمگیر کی وفات کے تین سال بعد ہی ختم ہوئی، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طویل واقعات بہت ہی اختصار و جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہین، اور

---

[1] تفصیل کیلیے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف صاحب ندوی، معارف مئی ۱۹۳۲ء

اس میں عالمگیر کی صحیح تصویر نظر آتی ہے،

مدارس برنیر نے شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی زبانی ایک دلچسپ اور پر مغز تقریر نقل کی ہے، جس سے اورنگ زیب کا تعلیمی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، لیکن برنیر کا بیان عموماً سنجیدہ اور وقیع نہیں ہوتا، اس لیے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی اس تقریر کا مخاطب اس کا ایک استاد ملا محمد صالح ہے جس کا نام معاصر مستند تاریخوں میں کہیں نہیں آتا،

عالمگیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اس کی ترویج ہر ممکن صورت سے کرے، چنانچہ اس نے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کیے، لائق اساتذہ مقرر کیے، اور طلبہ کو وظائف دیے، عالمگیر نامہ کے مصنف کا بیان ہے،

> چونکہ علم و فضل کی تاسیس و ترویج کا اعلیٰ حضرت کو بے حد شوق ہے، اس لیے اس وسیع ملک کے تمام شہروں اور قصبات میں فضلا، اور مدرسین کو مناسب وظیفے، روزینے اور املاک عطا فرما کر علوم کی تعلیم و تدریس میں مشغول فرما رکھا ہے، اور طالبان علم کے لیے ہر علاقہ میں ان کے حالات و رتبہ اور استعداد کے مطابق وجوہ معیشت مقرر کر دیے ہیں، ہر سال اس مصرف پر احسان شاہی کی مد سے معتدبہ رقم صرف ہوتی اور شاہی فیاضی اور سخاوت کے فیض سے طالبان علم و کمال کی تعداد بڑھ گئی ہے، اور وہ اطمینان کے ساتھ علوم و فنون کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اور ان کی دعاؤں کی برکت اس آسمان شکوہ حکومت کے مفاد و دوام کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے،[۲]

۱ دیکھو تاریخ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ سید محمد حسین ص ۱۲۲، ۲ عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶-۱۰۸۵ انگریز مورخین نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ اورنگ زیب نے زراعت کو ترقی دی تھی باضابطہ سڑکیں بنوائی تھیں، اور جا بجا مکاتب و مدارس قائم کیے (دیکھو ... ص ۲۴۳)

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے، اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں، اس کا حال مراۃ احمدی میں اس طرح درج ہے:

کرامت خان دیوان صوبہ کے نام حکم صادر ہوا، چونکہ ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہو چکا ہے، کہ ہر صوبہ میں مدرسین مقرر کیے جائیں اور میزان سے کر کشاف تک کے طالبعلموں کو صدر صوبہ کے استصواب اور مدرسوں کی تصدیق کر دیکھ کر اس صوبہ کے خزانچی کی تحویل سے وجہ معاش دی جائے، اس لیے اس وقت احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدرسین کا اور صوبہ احمد آباد میں ۴۵ طالبان علم کا اضافہ کیا گیا۔[1]

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیے کے خرچ سے ایک مدرسہ کی عمارت بنوائی، عالمگیر نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لیے موضع سوندرہ پرگنہ سانولی و موضع بہبلہ پرگنہ کڑھی وقف کیا، اور شاہی ساتھ دو روپیہ یومیہ محتاج طلبہ کے لیے بھی مقرر کیا۔[2]

(عالمگیر کو اس بات کا بے حد خیال رہتا تھا کہ جو کتابیں پڑھائی جائیں یا عام طور سے پڑھی جاتی ہیں ان میں مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کوئی چیز نہ ہو، چنانچہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ میں اس کی نظر بعض ایسی عبارتوں پر پڑی، جو اس کے خیال کے مطابق اسلامی عقائد

---

[1] مراۃ احمدی ص ۳۸۳ تاریخ فرح بخش مصنفہ محمد فیض بخش و مترجمہ ولیم ہوئی سے نرنیدرناتھ لا نے نقل کیا ہے کہ اورنگزیب میزان کے پڑھنے والے طلبہ کو روزینہ پڑھنے والے کو ار شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والوں کو ۸ روزینہ دیا کرتا تھا۔

[2] مراۃ احمدی ج ۱ ص ۲۸۲، اورنگزیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لیے بھی اساتذہ مقرر کیے تاکہ ان کی صحیح تعلیم ہو، ان کے ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے (مراۃ احمدی ج ۱ ص ۲۸۷-۲۸۸) بیرنیر کے بیان کے مطابق اورنگزیب نے فرنگی محل لکھنؤ میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

کے خلاف تھین، حضرت شیخ محب اللہ کا وصال ہوچکا تھا، ان کے دو مرید پایۂ تخت مین موجود تھے، ایک تو اورنگزیب کے استاد میر سید محمد قنوجی، اور دوسرے شیخ محمدی جو بڑے زاہد اور عابد صوفی تھے، میر سید محمد قنوجی ان عبارتون کی شرح نہ کرسکے، اورنگزیب نے شیخ محمدی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ شیخ محب اللہ کی مریدی کا دعویٰ کرتے ہین تو ان کے رسالہ کے مقدمات کو شرعی احکام کے مطابق بتائین، ورنہ ان کی مریدی سے استغفار کرین اور کتاب کو آگ مین ڈالدین، شیخ محمدی نے جواب دیا کہ مجھکو حضرت شیخ کی مریدی سے استغفار کی ضرورت نہین، لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے، مجھے وہان تک رسائی حاصل نہین، جس وقت مین اس رتبہ کو پہنچ جاؤن گا تو آپ کی درخواست کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجون گا، اور اگر آپ نے اس رسالہ کو جلانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس فقیر کے گھر سے کہین زیادہ شاہی مطبخ مین آگ موجود ہے، عالمگیر اس جواب کو سنکر خاموش ہوگیا،[1]

---

[1] مآثر الامراء، جلد سوم ص ۲۰۵-۲۰۶

شاہ عالم بہادر شاہ

اور

دوسرے بادشاہ

اورنگزیب کی روح قفس عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کیلئے عالمگیر ہی کا دل و دماغ چاہیے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا، اور تاریخ بھی بدل گئی، تخت طاؤس وہی تھا لیکن اس کے پرون کی خوشنمائی جاتی رہی تھی، تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی، ارباب عقل و دانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جودت، فطانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا، دیوان خاص کے کنگوروں سے حسرت و یاس برسنے لگی، دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعہ معلی سوگوار ہوگیا، معلوم نہیں یہ کارکنان قضا و قدر کی مصلحت تھی یا عالمگیر کی اولاد کے اعمال کی پاداش، تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی، اس کے زوال کو روکنے کے لیے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی، فطرت سرگرم کار ہوئی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوا کا ہو چکا تھا،

عالمگیر کی دور رس نگاہیں اس نتیجہ تک پہنچ گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لائق جانشین چھوڑنے کے لیے جس قدر مضطرب اور بے چین رہا کوئی اور تیموری حکمران نہ ہوا تھا، وہ اپنے لڑکوں کی

نہ صرف میدان جنگ میں فنونِ سپہ گری، دربار میں رموز حکمرانی[1]، اور قلعہ معلی کے اندر لکھنے پڑھنے[2] کی تعلیم دلاتا تھا، بلکہ ان کو اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، اور بولنے چالنے کے آداب خود سکھاتا تھا[3]، مگر قدرت کو شاید منظور نہ تھا، کہ اس کی عظیم الشان سلطنت کے بار گران کو اٹھانے کے لیے کوئی لائق جانشین پیدا ہو،

بہرحال یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ایام طفلی میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، اور آگے چل کر قرأت و تجوید کا ماہر ثابت ہوا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ جب وہ قرآن پاک پڑھتا تو سامعین بہت محظوظ ہوتے تھے، علم حدیث سے وہ خاص دلچسپی رکھتا تھا، اور اس کو اس میں اتنا درک تھا، کہ علمائے حدیث اس کو سردار محدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے، فقہی مسائل بلاتکلف قرآن و حدیث سے استنباط کرتا تھا، اس کے زمانہ میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے آگے لفظ "وصی" کے اضافہ کے سلسلہ میں جو جھگڑا پیدا ہوا، اس میں علماء و فقہا سے اس نے خود مناظرہ کیا[4]، حدیث، فقہ، تفسیر و سلوک کی کتابیں برابر مطالعہ میں رکھتا تھا، مصنف مذکور کا بیان ہے کہ عربی زبان میں "عرب عربا" اور فارسی و ترکی زبانوں میں بہترین اہل زبان کے ہم پلہ تھا، فن خوشنویسی میں بقول مصنف ہذا "یکتائے زمانہ تھا، اور مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل کیا تھا[5]، خلاصۃ التواریخ کا مصنف بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے:

اعلیٰ حضرت جو کہ لیل و نہار کے صحیفہ انتخاب تھے، حضرت خلد مکان کی تربیت

---

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ شیخ احمد سندیلوی ص ۱، [2] عالمگیر نے شاہزادہ محمد سلطان بہادر کو جو شب و روز کا نظام اوقات لکھ بھیجا تھا، وہ رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی ص ۲۴ میں ملاحظہ ہو، [3] خافی خان جلد دوم ص ۲۴۳، [4] مآثر عالمگیری ذکر اولاد مذکورہ،

اور اپنی فطری سعادت کی بدولت سن تمیز کے آغاز ہی سے شرف نفسانی اور کمالات انسانی کے ذخیرہ دار ہو گئے تھے، جوانی کے ایام انھوں نے تحصیل علم میں صرف کیے علم کو عمل سے آراستہ کیا، عربی، ترکی اور فارسی میں فصیح گفتگو کرتے تھے، تحریر و کتابت کے فنون میں استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا، راتوں کو اکثر نوافل، ورد و وظائف تلاوت قرآن اور حدیث، تفسیر، فقہ اور سلوک کی کتابیں مطالعہ کیا کرتے تھے۔[۱]

بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ عالم بہادر شاہ کا ذکر شاعر کی حیثیت سے بھی کیا ہے، اور بعض رباعیاں اس کی طرف منسوب کی ہیں، ایک ملاحظہ ہو،

الٰہی تا ز آبی کہ ملی خواستہ است — والا ترا ز ابی کہ دلی دانستہ است

بہشتی خود گواہی خواست خدا — بے مثل بیا فرید و بے مانند است[۲]

یا تو عالمگیری دربار کے زوال کے باعث یا شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب دربار میں وہ فضا قائم نہ ہو سکی جو اس کے اسلاف کے زمانہ میں تھی، اس لیے اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری کے زمزمہ سنجی سے خالی رہا، گذشتہ عہد میں ایران سے علم و ادب کا جو سر چشمہ پھوٹا تھا، وہ یکایک خشک ہو گیا، بلند پایہ شعرا، اور قابل قدر فضلا، ناپید ہو گئے، قابل ذکر شعرا میں صرف عبد القادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات صالحات میں رہ گئے تھے، مرزا بیدل بہادر شاہ کے ایام شاہزادگی میں اس کے متوسلین میں سے ہو گئے تھے، لیکن دربار کی قصیدہ خوانی کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے، شہزادہ معظم نے ایک بار قصیدہ کہنے کی فرمائش کی، تو دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے، اور بقیہ عمر فقر و توکل میں بسر کی،

---

[۱] خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۵۲ روز روشن ص ۱۷۸ مآثر الکرام ص ۱۵۲ دیوان کے علاوہ مرتبہ ذیل تصنیفات یادگار ہیں، ۱۔ محیط اعظم ۲۔ طلسم حیرت ۳۔ گلگشت حقیقت ۴۔ طور معرفت ۵۔ عرفان ۶۔ بیاض ۷۔ نکات ۸۔ رقعات ۹۔ چہار عنصر

نعمت خان عالی کا ذکر پہلے آچکا ہے، بہادر شاہ نے اپنے زمانہ میں اس کو دانشمند خان کے خطاب سے سرفراز کیا، دانشمند خان اس عہد کی منظوم تاریخ بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا، کہ خود اس کی زندگی کا ورق الٹ گیا، اس میں بہادر شاہ کے صرف ابتدائی دو سال کے حالات ہیں نعمت خان کی اور بھی تصانیف ہیں، مثلاً (۱) وقائع نعمت خان عالی، یہ وقائع حیدرآباد یا واقعات حیدرآباد و گولکنڈہ کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے، عالمگیر کے تیسویں سنہ جلوس میں حیدرآباد کا جو محاصرہ کیا گیا تھا، اس کا ذکر اس کتاب میں ہجو ملیح کے ساتھ کیا گیا ہے، (۲) رقعات (یا منشآت) نعمت خان (۳) حسن و عشق (یا مثنوی حسن و عشق، یا کتخدائی حسن و عشق) یہ نثر میں ایک قصہ ہے جس میں جابجا اشعار بھی ہیں (۴) ایک مثنوی جس میں اخلاق اور صوفیانہ نکات ہیں (۵) کلیات نعمت خان عالی، اس میں قصائد، سپارنامہ، قطعات اور مختلف ہجویں مثلاً رسالہ ہجو حکما، مناظرۂ اطبا وغیرہ وغیرہ بھی ہیں[۱]

دربار کے دوسرے نامور شاعر یہ تھے۔

مرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان المتخلص بہ **واضح**، خان اعظم شاہجہانی کا تیسرا لڑکا تھا، اورنگزیب کے زمانہ میں ارادت خان کا خطاب پایا، ۱۱۰۰ھ میں چاکنہ کی فوجداری پر مامور ہوا، پھر ۱۱۰۸ھ میں اورنگ آباد کی فوجداری اور اس کے بعد گلبرگہ کی قلعہ داری پر مقرر ہوا، شاہ عالم کے زمانہ میں منصب چہار ہزاری سے سرفراز ہوا، علم و فضل میں ممتاز تھا، صاحب مآثر الامرا کا بیان ہے:-

"مذاق تصوف داشت، و در شعر بسیار نازک خیال بود واضح تخلص می کرد صاحب دیوان است"[۲]

---

[۱] فہرست انڈیا آفس لائبریری ص ۹۰۳ ، [۲] مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۸ ، اسکے بعض اشعار ملاحظہ ہوں
(باقی حاشیہ ص ۲۹۸ پر)

انتخاب کلیات واضح (موجودہ انڈیا آفس لائبریری) میں چھ مثنویاں بھی ہیں جن میں صوفیانہ خیالات و مسائل منظوم کئے گئے ہیں[1]، تاریخ ارادت خان کے نام سے ایک تاریخ بھی لکھی، جو عالمگیر کی وفات سے لے کر فرخ سیر کے عہد تک کے واقعات پر مشتمل ہے[2]

مرزا سید حسین خالص، عالمگیر کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا، امتیاز خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، بہادر شاہ کے زمانہ میں میر آخور بادشاہی کے عہدہ پر مامور ہوا، ایران واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں سندھ کے پاس کسی نے قتل کر دیا، تاریخ وفات "آہ آہ امتیاز خان" سے نکلتی ہے، ایک دیوان یادگار چھوڑا، جس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں، ایک مثنوی بھی اس کے نام سے منسوب ہے[3]، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے،

قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کا رہنے والا تھا، بہادر شاہ کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور اس کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، قزلباش خان کا خطاب اور ایک ہزاری منصب شاہی دربار سے ملا، چنانچہ خود کہتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۷) رشک فرمائے وطن نیست بجز آتش حباب — یافت یک پیرہن ہستی و آن ہم کفن است

عارفت از دیر است ورنی ادنی شود — آئینہ رو تماشود و رونمی شود

زمستی اہل فنا خود است تشنه زندگانی را — بود آب دم شمشیر صندل سر گرانی را

چہ الفت است بہ ایت تو بیقراران را — جبال سیاه پسند است سوگواران را

موج و وحشت کشد محروم از ساحل مرا — در تپیدن رفت از کف دامن قاتل مرا

گر گرہ صافت ہم از غنچه غبار آلود است — بست دور رخ گلشنی که صبا را بخشد

بہار و وقت صبا گل بہ کام گلچین باد — کہ ما بہ کنج قفس طرح آشیان کردیم

[illegible]

۱؎ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ج ا ص ۹۰۹، ۲؎ ایتھے ج ا ص ۲۴۳ تا ۲۴۵، ۳؎ فہرست کتبخانہ شاہ اودھ اسپرنگر ص ۱۵۰، ۱۶۰
۱۸۱، ۲۱، ۱۱۱

ہمچو بلبل ہمیشہ نالائیم — این بود منصب ہزاری ما

ایک فارسی دیوان چھوڑا،[1] ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، فن موسیقی کا بھی ماہر تھا،[2]

بندرابن داس بہادر شاہی مصنف لب التواریخ کے علاوہ جگجیون داس ولد منوہر داس بھی بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا، گجرات کا باشندہ تھا، ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کیا، ۱۱۲۰ھ میں اس نے منتخب التواریخ لکھ کر بارگاہ شاہی میں پیش کی جس کے صلہ میں خطاب و خلعت اور انعام سے سرفراز ہوا،[1] اس کتاب کا اہم حصہ اس کا آخری باب ہے جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے حالات ہیں، ایک اور ہندو اہل قلم کامراج ولد من سنگھ نے شہزادہ محمد اعظم کی فرمائش پر اعظم الحرب لکھی، اس میں اورنگ زیب کے لڑکوں کی جنگ جانشینی کا اور محمد اعظم کی عارضی حکومت کا ذکر ہے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدت مندی سے اپنے کو تین پشت سے تیموری دربار کا نمک خوار بتاتا ہے،

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب اور بھی تیزی سے ڈھلنے لگا، تاریک بادلوں سے کبھی کبھی امید کی شعاعیں نکلتی بھی تھیں، تو ان میں نور کے بجائے

---

[1] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ج ۱ ص ۹۳۲، [2] اسپرنگر ص ۱۵۳، اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

روشن شود بہ پیش تو چون شمع سوختن — یک شب اگر تو ہم نشینی بر من

خوش وقتی کہ می بالید از جانان بہ دوشم — برنگ ماہ نو بر شام پیچا گشتہ آغوشم

گشتہ دیگر وادی لیس آبادی از ویرانہ ام — چون کمان حلقہ بیرون شد درون خانہ ام

قضا تا کردہ اند دست جدا از دوستان ما را — شدیم ہم گلفتنی داری نصیب دشمنان ما را

[3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۸۲، اس کے ریختہ کے اشعار تذکرۂ گلزار ابراہیم اور تذکرۂ علی متخلص بہ لطف میں ملاحظہ ہوں،

ظلمت ہی نظر آتی تھی، تیموری دربار کا شیرازہ بکھر گیا، تدبر و سیاست میں انتشار آگیا، بیرونی فتوحات کی جگہ اب صرف خانہ جنگیاں رہ گئی تھیں، میدان جنگ کی خون آشامیوں کے بعد دربار قائم بھی ہوا، تو اس میں نہ اسلاف کی روایات تھیں، نہ ان کی متانت اور ان کا وقار، بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا، گو اس کی حکومت کی مدت صرف دس مہینے رہی، لیکن اس کی بوالہوسی اور ہوسناکی نے شاہی دربار کی عزت و ناموس کو ایسا صدمہ پہنچایا، کہ آئندہ تمام تیموری سلاطین کی حکومت محض تذلیل و تضحیک کی داستان بن کر رہ گئی، اس خانہ بربادی اور طوائف الملوکی میں علم و فضل کی مسند دربار میں بچھتی تو کیونکر؟ محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر موجود ضرور تھا، مگر ان کی شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی نور افشانی کہاں سے آتی، حکومت محض شام غریباں بن کر رہ گئی تھی، اس میں علما و فضلا کی بہار کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی؟

فرخ سیر فرخ سیر کی مدت حکومت سات سال رہی، اور یہ مغلیہ خاندان کا وہ زمانہ ہے جب شاہی دربار میں درباریوں اور ہوشمندوں کا ایک قابل قدر اجتماع ہو گیا تھا، نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامراء سید حسین علی خان کی فراست، قطب الملک عبداللہ کی فرزانگی اور میر جملہ کی مردانگی اگر ایک ساتھ متحد ہو جاتیں، تو کیا عجب تھا کہ ایک بار پھر اکبری دبدبہ اور شاہجہانی شوکت کی جھلک نظر آجاتی، لیکن دربار کی ریشہ دوانیوں اور آپس کی فتنہ انگیزیوں نے تباہی اور بربادی کی چنگاریوں کو اس طرح مشتعل کیا کہ سلطنت محض خاکستر ہو کر رہ گئی،

فرخ سیر حافظ قرآن تھا، مرآۃ آفتاب نما میں اس کے کچھ اشعار بھی درج ہیں جو اس نے اپنی اسیری کے زمانہ میں کہے تھے[1]، فرخ سیر کے دربار میں تو علم و فضل کا چرچا زیادہ نہیں رہا،

---

[1] یہ اشعار میری نظر سے نہیں گزرے، مگر ان کا انگریزی ترجمہ ارون کی تاریخ لیٹر مغلز (جلد اول ص ۳۹۱) میں ملے گا۔

لیکن اس کے امرا، کی علم دوستی اور علم نوازی نے اس کمی کو پورا کر دیا، نظام الملک آصفجاہ معقولات ومنقولات کے عالم ہونے کے علاوہ بہت ہی قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر بھی تھے ان کا ایک ضخیم دیوان جو ۳۰۰ صفحون پر مشتمل ہے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر حیدرآباد دکن سے شائع ہو گیا ہے ہم اس مین سے دو غزلین ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتے ہین،

(١)

بیا و یار شب اے دل عنان خواب بگیر | و مد چو صبح بہر نور آفتاب بگیر
چہ روز خواہی اگر باشدت تنبت روشن | بدست دامن حسن با آفتاب بگیر
تو تشنگی نہ کشی گرم سعی اگر گردی | ز چشم سار عرق بہر خویش آب بگیر
بیزم دہر بود عشرت خوش آگاہی | پیالہ خواہی اگر عبرت از شراب بگیر
بیا من برکت یابی اے دل از حرکت | بہ ہجر یار تو دامان اضطراب بگیر
توجہ تو بسویم فتادہ مقصد من | اگر ملایمت نیابی رہ عتاب بگیر
چو خواہی اینکہ نہ بیند کسی جمال ترا | فروغ مہر توئی از رخت نقاب بگیر
در آ بکوچہ آن زلف اے دل شیدا | چہ میروی تو بہر سو رہ صواب بگیر
چو گرم جلوہ شود آن نگار در باغ | ز شرم آب گلشن میشود گلاب بگیر
دلم یگانہ بود اے نگار در عشقت | بدست خویش تو این فرد انتخاب بگیر
بپیچ و تاب خود اے زلف یار نازمکن | بیا درون دل ما و پیچ و تاب بگیر
وصال یار چو خواہی مکن درنگ آصف | بجستجو کہ در آئی رہ شتاب بگیر

(٢)

وحشت دلدار ما باشد بسامان دگر | می کند چون آہوان رم در بیابان دگر
در دو دل پر خون ما آن شوخ جولان می کند | جلوہ گاہ یار ما باشد گلستان دگر
در بیابان طلب خارے کہ در پایم خلید | یاد فرزگانش بود خار مغیلان دگر

ہمچو زندانی کہ عاشق است یوسف زانکہ بود — حلقۂ زلف سمن سا بست زندان دگر
بسمل دو سر گرم خون ریزی است از شمشیر نا — می کند بسمل مرا در عید قربان دگر
خط کشیدن یار را نادم ز خونریزی کند — می گزد آن ماہ رو لب را بدندان دگر
میخورد و زیں فلک ہر ماہ نان تازہ — ماہ می آرد برائی او لب نان دگر
در جدائی گر گریبان چاک کردم و قبا — چاک خواہم کرد در دل ہم گریبان دگر
کاکلش یاد آمد و خلش دل ما راز بود — می رسد ہر دم ز پیش یار قربان دگر
حال خود را با طبیبان جہان آصف مگو — درد عشق یار دارد ذوق درمان دگر

نظام الملک آصفجاہ کی علم نوازی اور فیاضی کی شہرت چار دانگ عالم مین تھی، اور ہر طرف سے علماء ان کے دربار مین کھنچے چلے آتے تھے، مآثر الکرام مین ہے،

عجیب فرشتہ صفت تھے، اور نیکی ان کی جبلت تھی، ان کی سرکار سے ہمیشہ فقراء علماء، صلحا اور دوسرے مستحقین کیساتہ انکی قسمتون کے مطابق نوازش ہوتی تھی، عرب، ماوراء النہر، خراسان، عراق اور اطراف ہند سے کملاء و مشائخ ان کی قدردانی کا شہرہ سن کر دکن آتے اور ان کے شیلان کثیر الالوان سے زلہ ربائی کرتے تھے (ج ۲ ص ۵۵)

مآثر الکرام کے مولف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آصفجاہ کے معاصرون اور ان کی مجلسون کی زینت دینے والون مین سے تھے، وہ رقمطراز ہین:

مستحقین پر نہایت کثرت سے خیرات و مبرات کی، دفتر صدارت سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ شاہی انعامات کے علاوہ تین لاکھ روپیہ ان کے دستخط سے روزانہ اور ماہانہ وظیفہ کی صورت مین ارباب استحقاق کو دیے گئے، ان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ حاجیون وغیرہ کو مرحمت ہوئے، عرب، ماوراء النہر، خراسان، عراق، عجم اور ہندوستان کے سادات

اور علماء و مشائخ نے اس قدر دانی کی شہرت سنی تو وہ دکن مین آئے اور اپنی قسمت کے مطابق

اس احسان عام سے بہرہ اندوز ہوئے (ج ۲ ص ۱۵۰)

علم نوازی اور معارف پروری کی جو شاندار روایات آصفجاہی خاندان کے بانی نے قائم کین انکو اس خاندان کے اور فرمانرواؤن نے اسی آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھا چنانچہ اس دودمان عالی کے موجودہ فرمانروا اعلیٰحضرت رفیع المنزلت سلطان العلوم شاہ دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے فیض عام سے آج بھی حیدرآباد دکن علوم و فنون کا منبع اور مخزن ہے،

امیر الامراء سید حسین علی خان کی شعر فہمی اور تاریخ دانی مشہور تھی، اسکے یہان معمول تھا، فجر کی نماز کے بعد ارباب کمال اس کے پاس جمع ہو کر علمی گفتگو کرتے تھے، اس وقت کسی کو کسی اور کام کیلیے اسکے پاس آنے کی اجازت نہین ہوتی تھی [۱]

آصفجاہ اور امیر الامراء دونون علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی [۲] کو بہت محبوب اور عزیز رکھتے تھے، علامہ موصوف فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور بھاشا کے فاضل اجل تھے، اور اپنے ذاتی تقدس، اوصاف عالیہ اور علمی کمالات کے لحاظ سے ایک آیت عزت و وقعت سے یاد کیے

---

[۱] مآثر الکرام ج ۲ ص ۱۵۱ [۲] علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی کے حالات مآثر الکرام جلد ۲ مین ملینگے، علامہ موصوف نے فرخ سیر کے بہت مدحیہ اشعار کہے، ایکبار لشکر مین ژالہ باری ہوئی، ژالے کچھ بیٹھے تھے، علامہ بلگرامی نے یہ رباعی لکھکر فرخ سیر کی خدمت مین گذرانی

چرخ سپہر آن شہنشہ با برکات   چرخ از ادب او شدہ شیرین حرکات

در سند زمین عہد عشرت مہدش   بارید سحاب ریزہ قند و نبات

فرخ سیر کی جب شادی راجہ جیت سنگھ راٹھور سے ہوئی تو علامہ موصوف نے اس جشن پر ایک مثنوی کہی، مگر یہ مثنوی فرخ سیر کے پاس نہ پہنچ سکی، مآثر الکرام ص ۲۷۵ مین اس مثنوی کے کچھ اقتباسات ملین گے،

جاتے ہین، امیرالامراء سید حسین علی خان سے ان کے تعلقات کا حال صاحب مآثر الکرام کے الفاظ مین ملاحظہ ہو۔

امیرالامراء سید حسین علی کہ بارشان التفاتے خاص داشت واکثر در مجالس خود برملا می گفت کہ میر عبدالجلیل درین عصر نظیر ندارند و لوازم احترام فوق الحد بتقدیم می رسانند"[۱]

علامہ موصوف آصفجاہ کے حضور مین نواب امین الدولہ کی وساطت سے پیش کیے گئے تو نواب آصفجاہ نے ان کا بڑا اعزاز کیا، اور ان کو اپنے برابر جگہ دی، جب قصیدہ نظر سے گذرا تو شمع منگوا کر اسے سنانے کی فرمایش کی، ایک ایک بیت کو نہایت غور سے سنا اور تعریف و تحسین فرمائی، قصیدہ سنکر نقد، خلعت اور اسپ نذر کیا، علامہ مرحوم نے حسب ضابطہ قدیم اس انعام کو قبول نہین کیا۔[۲]

علامہ موصوف کو بھی ان دونون سے بڑی شیفتگی تھی، آصفجاہ کی شان مین جو قصیدہ لکھا اس مین اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہین:

نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم — قوام دین و دول آفتاب مجد و علا
چو او ندیدہ امیری مہذب الاخلاق — بعینک مہ و مہر این سپہر پشت دوتا
مثال روح مصور بود بپا کی ذات — نشان عقل مجسم بود بفہم و ذکا
صفائی آئینۂ رای او بود چندان — کہ می نماید از و آنچہ رود ہد فردا
کرم ز دست گہر بار او بود ممنون — ظفر بتیغ جبین کار او بود شیدا
ہزار شکر کہ مسند وزارت یافت — ہمان کہ یافت تن عاذر از دم عیسیٰ
ملائک از پے آیین این نعاشرہ اند — برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

---

[۱] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۲۶۳ ۔ [۲] ایضاً ص۱۹۳

ہمیشہ بہر دو زہم شاد و کامران باشد ــــ وی از وزارت و از وی وزارت اعلیٰ[1]

امیر الامراء کے قتل سے علامۂ موصوف نے سینہ فگار ہو کر جو خونچکاں ماتم کیا ہے، وہ ملاحظہ ہو،

ہنا ر کہ بلا ست عیاں از جبینِ ہند ــــ ز د جوش خون آل نبی از زمین ہند
شد ماتم حسین علی تا ز ہ در جہان ــــ سا دات گشتہ اند مصیبت نشینِ ہند
نیلی است زین معاملہ پیراہن عرش ــــ در خون گرہ پیرخ شد است آستین ہند
گیتی چرا سیاہ نہ گر دد ز دود غم ــــ خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است ــــ دیدیم داستان شہور و سنین ہند
از داغ دل زدند چراغان اشک جوش ــــ این است نو بہار گل آتشین ہند
ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا ــــ از شیون عظیم امیر مہین ہند
ہندا از شہادتش تن بے روح گشتہ است ــــ یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند[2]

فرخ سیر کے درباری امراء میں مرزا عبد المعالی عالی وزارت خان بھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا، گرامی تخلص رکھتا تھا، مآثر الامراء میں ہے

"وزارت خان متخلص بہ گرامی بحسنات شگرف سر آمد اوان بود، طبع موزون داشت،

صاحب دیوان است این شعر از و مشہور

تا قافلہ سالار جنون فال سفر زد ــــ دیوانۂ ما دامن صحرا بکمر زد[3]

محمد شاہ محمد شاہی عہد میں سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبۃً ضرور رہی، لیکن اس کے طویل زمانہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کر کے جمع ہونا شروع ہو گئے، جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لیے ضروری ہیں، دربار میں اکبری اولو العزمی کے بجائے

---

[1] کارنامۂ اکرام دفتر ثانی ص۱۸۲، [2] ایضاً ص ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۷۳، ۲۷۸، [3] مآثر الامراء ج ۱ ص ۳۶۶،

شمشیر و پیمانہ کی پرستی تھی، شاہجہانی شوکت و حشمت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی، اور عالمگیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بیکسی کا عبرتناک منظر تھا، بادشاہ وقت اپنے امرا اور درباریوں کا ایک آلہ کار ہو کر رہ گیا تھا، خود غرض امرا میں نیت کی پاکیزگی تھی، نہ مقصد کی یکجہتی، رہی سہی قوت نادرشاہ کی خونریزی، مرہٹوں کی غارتگری اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی، تیموریوں کی عظیم الشان حکومت کی بساط اب الٹنے کو تھی، صدیوں کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ کے لیے ویران ہونے کو تھا، اور ایک شاندار تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے والا تھا،

سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شوکت تو جاتی ہی رہی، مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے، دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار تھا، ایک حکمران قوم کے ہاتھ سے جب دولت گئی، حشمت گئی، اور زبان بھی گئی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا دیر تھی صرف وقت کا انتظار تھا،

محمد شاہ نے فارسی زبان کے بجائے ہندوستانی زبان میں اپنے علمی ذوق کا اظہار کیا، بارہ ماسہ اور گیت، کہانی دو تصنیفیں اس کے نام سے منسوب ہیں، اس نے ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی بھی کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:-

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی — دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گذری کا

کھول کر بند قبا دل کے تئیں غارت کیا — کیا تجھے ارتھ لینے کے لیے کھلے بند ان لیا

خوف کا ہے کے یار اس سے لڑائی نہ کرو — ذلت کا نام نہ ہو اور پریشان نہ کرو

مندرجہ بالا اشعار کی زبان کتنی صاف ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی زبان دکن سے شاہجہان آباد آ گئی تھی، ولی دکنی دکن سے دہلی آ چکے تھے، ان کی شاعری کا غلغلہ ہر طرف پھیلا، محفلوں میں ان ہی کی غزلوں کا چرچا ہوتا، ارباب نشاط ان ہی کی غزلیں گاتے سنتے اور سر

رہتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے کہنہ مشق اساتذہ بھی ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے، چنانچہ قزلباش خان امید، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا علی قلی خان ندیم، اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق جیسے باکمال فارسی شعراء نے بھی ریختہ میں شعر موزون کیے ہیں[1] یہی نہیں بلکہ تھوڑے دنوں کے اندر درباروں، مجلسوں اور بازاروں میں فیضی، نظیری، عرفی، طالب، قدسی، صائب اور کلیم کے بجائے مظہر، سودا، میر، درد، انشا، ذوق، مومن اور غالب کی زمزمہ سنجیاں اور نغمہ سرائیاں فردوس گوش ہونے لگیں، شعراء اپنی تمام جولانیاں ہندوستانی زبان میں دکھلانے لگے، اگر شراب وہی تھی صرف شیشہ و ساغر بدل گئے تھے،

محمد شاہ کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز تھا کہ اس میں بڑے بڑے ارباب فضل و کمال جمع ہو گئے تھے، فارسی شعراء میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان وداد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، فائز، شہرت، صائب، مخلص، ریختہ گویوں میں نواب عمدۃ الملک نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر خان شاکر، خان عالیشان جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ ولی اللہ، میر ضاحک، میاں عبدالحی تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جان جاناں، اور ہندی شعراء میں اعظم خان، دیوی کوی، صورت مسر وغیرہ موجود تھے، یہاں ہم صرف ان شعراء کا ذکر کریں گے جن کا تعلق براہ راست محمد شاہ کے دربار سے تھا،

انجام — امیر خان نام اور نواب عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خان عالمگیری کا لڑکا تھا، شعر و شاعری اور لطیفہ گوئی میں مستعد اور مذاق رنگینی کی وجہ سے محمد شاہ کے نہایت محبوب ہم جلیسوں میں تھا، تذکرۂ گلزار ابراہیم میں نواب موصوف کا ذکر اس طرح ہے،

---

[1] ان کی ریختہ گوئی کی مثال گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف میں ملاحظہ ہو،

اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآمد ہوئی تھی کہ رشک تھا، ان سب ارکان دولت کو اور اعیان مملکت کو حسد تھا، لطیفہ گوئی کی طرف ان کی طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے فراج بہ شدت مالوف، گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے استاد تھے، اور شیرین کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد، موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے، گانے میں دخل ایسا تھا کہ استاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور تاو بید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے، بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہان پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت انکی طرف مشتاق تھی۔"[^۱]

سنہ ۱۱۵۱ھ میں شاہی دربار کی سازشوں سے قتل ہوا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا[^۲]۔ اس کا دربار شعراء کا مرجع بنا ہوا تھا، بذلہ سنجیوں کی محفلیں برابر گرم رہتی تھیں، زمانے کے باکمال ارباب سخن اس کے یہاں جمع ہوتے، نواب عنایت خاں راسخ، احمد نواب محمد شاکر خان شاکر، پانی پت سے آکر شریک بزم ہوتے، شرف الدین مضمون، خواجہ ناصر عندلیب شاہ حاتم، میر ضاحک اور ہندی زبان کے شعراء میں آنند گھن، دیوی کوی اور صورت مسر بھی نواب

[^۱]: گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء) تذکرۂ میر حسن میں ہے:-

"نواب امیر خان از امرائے عظام و ظرفائے عالی مقام نواب عمدۃ الملک خوش طبع و شیرین کلام از مقربان درگاہ فردوس آرام گاہ بود، لطائف و ظرائف او مشہور و معروف است، (ص ۵۴ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ)۔

[^۲]: ریختہ کے اشعار گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں۔

موصوف کی علم پروری صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے، میر محمد شاکر ناجی نواب کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے[۱]، بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین لکھکر اس کی سرکار مین پیش کین، اس نے پوری قدردانی کی اور دو روپیہ روزینہ وظیفہ مقرر کیا[۲]

انجام کی اردو شاعری کے نمونہ مین ہم اسکی صرف ایک غزل ہدیۂ ناظرین کرتے ہین،

کیون بلایا پھر مین کیا مجھ سے نادانی ہوئی | دختر رز بزم مین آ شرم سے پانی ہوئی
کل محیط عشق کے صد موج پانی تھی تنجا | کشتی دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جون آئینہ رکھتا تھا عزیز | ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
کیا کہون انجام مین اس عشق کے آغاز کو | دوستدارون کو محبت دشمن جانی ہوئی
نعش میری دیکھ کے مقتل مین یون کہنے لگے | کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی[۳]

خان عالیشان جعفر علی خان، مرزا مومن بیگ کا لڑکا تھا، ذہین، ذکی اور بڑا طباع شاعر تھا محمد شاہ نے سہ ہزاری منصب پر سرفراز کیا، محمد شاہ کی فرمائش پر مثنوی حقہ، لکھنی شروع کی لیکن نامکمل رہ گئی، جس کو میان حاتم نے پورا کیا[۴] کلام کا نمونہ تذکرہ میر حسن مین بھی مل سکتا ہے،

شیخ حسین شیرازی شہرت عربی النسل تھا، لیکن ایران مین نشو و نما پائی، عالمگیر کے عہد مین ہندوستان آیا، محمد اعظم کا طبیب مقرر ہوا، فرخ سیر نے حکیم الممالک کا خطاب دیا، محمد شاہ کے عہد مین چہار ہزاری منصب سے سرفراز ہوا، ۱۱۴۹ھ مین وفات پائی[۵]، پانچہزار اشعار کا ایک فارسی دیوان چھوڑا، اس کے کچھ اشعار یہ ہین:

ز من شہرت تمنا دارم و نے نام می خواہم | فلک گرد گذارد یک نفس آرام می خواہم
نالہ پنداشت کہ در سینۂ ما جا تنگ است | رفت و برگشت سراسیمہ کہ دنیا تنگ است

---

[۱] گل رعنا صفحہ ۱۰۱، [۲] معارف نمبر ۳ ج ۳۰ صفحہ ۲، [۳] گلزار ابراہیم صفحہ ۱۴۱، [۴] تذکرہ میر حسن صفحہ ۷۴، [۵] مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۲۰۱

اے گل سیر کوی تو جدا از وطنم کرد — من خار تو بودم که بیرون از چمنم کرد

صبح شو تا در فرصت از عالم نگذرد — یک نفس دم را غنیمت دان که این ہم بگذرد [1]

مصطفیٰ قلی خان یکرنگ تذکرۂ میر حسن میں ہے،

در گلشن بہار سخن آب و رنگ و در چمن گلزار معانی بلبل خوش آہنگ مصطفیٰ قلی خان المتخلص بہ یکرنگ از عمدہ بود، در عہد فردوس آرام گاہ نبیرۂ خان جہان لودھی در سلک ملازمان شاہی منسلک بود، [2]

اردو میں یکرنگ کے کلام کا رنگ یہ ہے،

ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تو — یہی گویا سلام ہے تیرا

اسقدر کیا ہے عداوت غیر کی — ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

وصل اور ہجر اس صنم کا مجھ پہ یکساں ہو گیا — دور سیرابی کے آخر کو ویران ہو گیا

مجھکو اس دل سے توقع تھی مدد کی وقت پر — تیر خوباں کا تو وہ یکرنگ سے پیکان ہو گیا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہے تو لے صیاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

رائے انند رام مخلص۔ انند رام سودھرہ ضلع سیالکوٹ میں ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوا، اس کی کئی پشتیں مختلف تیموری امراء کے درباروں سے بسلسلۂ ملازمت منسلک رہیں، تعلیم پا کر انند رام محمد شاہ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ قمر الدین اور اس کے چچا زاد بھائی سیف الدولہ [illegible] بہادر کا وکیل دربار مقرر ہوا، [3] اس لیے شاہی دربار سے بھی اس کو توسل تھا، اور وہاں سے اسکو

[1] مآثر و فکر اہم جلد ۳ ص ۳۰۳ [2] تذکرۂ میر حسن ص ۲۱۶ [3] مخزن الغرائب میں یہ ہے،

وے از اعیان معتبر ہندوستان ... وکالت نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خان ... دکن بود، در حضور محمد شاہ پادشاہ ... داشت،

رائے رایان کا خطاب ملا، مگر اس کی امتیازی حیثیت خود اس کی علمی صلاحیتون کی وجہ سے ہے، اور اس کا شمار ان چند ہندوون مین کیا جاتا ہے جو فارسی علوم و فنون کے بڑے دلدادہ اور شیدائی تھے، وہ مرزا بیدل کا تو شاگرد تھا ہی، اس عہد کے تمام شعراء سے بھی اسکے گہرے تعلقات تھے خصوصاً خان آرزو سے اس کو بڑی عقیدت تھی، اور اسی کی مساعی جمیلہ سے خان آرزو کو شاہی دربار سے منصب، جاگیر اور خطاب ملا، اس کے گھر پر اہل علم مثلاً آرزو، محمد قلی خان، مہتی یا ب خان شاعر، راؤ کرپارام، فتح سنگھ وغیرہ کی مجلسین برابر منعقد ہوتی تھین، ان صحبتون مین اس کے علمی ذوق کی جلا خوب ہوئی، اپنے نام کو زندہ اور روشن رکھنے کیلیے اس نے متعدد تصانیف چھوڑین، مثلاً (۱) گلدستۂ اسرار، اس مین وہ خطوط تھے جو نادر شاہ کابل کے صوبہ دار کو لکھتے تھے، انکو اندرام کے ذریعہ سے وزیر اعظم محمد شاہ کے حضور مین پیش کرتا تھا، (۲) بدائع وقائع مین تاریخی واقعات ہین خصوصاً نادر شاہ کے حملہ کا ذکر ہے، اس کتاب کو تذکرہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، ایلیٹ نے جلد ہشتم مین اس سے کچھ اقتباس لیا ہے (۳) مراۃ اصطلاحات، یہ کتاب فارسی الفاظ، محاورات اور اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے جس سے بعض تاریخی، معاشی اور صنعتی معلومات بھی حاصل ہوتے ہین، (۴) رقعات مخلص، ان مین سے بعض خطوط ادبی اور تاریخی حیثیت سے مفید ہین (۵) سفرنامہ، اس مین محمد شاہ کے محاصرہ بن گڑھ کے واقعات کی تفصیل درج ہے، اس مہم مین آنند رام مخلص اپنے ولی نعمت نواب قمر الدین خان اعتماد الدولہ کے ہمرکاب تھا، اس نے اس سفر کا حال بطور روزنامچہ مرتب کیا تھا، جس سے بہت سی اہم باتین خصوصاً تیموری حکمرانون کے آخری دور کے طرز جنگ سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہین پھر اس عہد کی بہت سی تاریخی شخصیتین بھی متعارف ہو جاتی ہین،[۱] (۶) ہمہ ی خانہ رسید شاید ایک

[۱] اس کتاب کو ڈاکٹر سید نظیر علی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (کنٹبرا) صدر شعبۂ عربی و فارسی ..... اردو
(باقی حاشیہ ص ۳۱۲)

مرقع کا دیباچہ ہے جس میں مشہور خوشنویسوں کی خطاطی کے نمونے تھے، (۷) چمنستان، حکایات و اقوال کا مجموعہ ہے۔ (۸) ہنگامۂ عشق، یہ کنور سندر سین اور رانی چندر پربھا کے عشق و محبت کا ایک قصہ ہے۔ (۹) کارنامۂ عشق، یہ شاہزادہ گوہر اور ملکہ مملوکات کے حسن و عشق کی کہانی ہے، (۱۰) روزنامچہ احوال، (۱۱) رباعیات، (۱۲) دیوان،

مخزن الغرائب میں مخلص کے بہت سے اشعار درج ہیں جن میں سے ہم بھی کچھ یہاں پیش کرتے ہیں،

تاج بر سر ہمچو قیس از داغ سودا ایم ما — قہرمان کشور ویران صحرا ایم ما

دیدہ ایم از جامۂ دو سر مشغول زیارت — افتادہ چو بر تربت مجنون گذر ما

بگلشن چند سروی دیدم و فریاد سر کردم — کہ یادم داد رنگین صحبت یاران موزون را

تا چشیدیم مخلص مہر سم از شہر دل — ہر کجا جنس وفا باشد خریدار ایم ما

عیان از دائے محبت باز چو من ناتوانی را — غریبی در وطن دیدی بکیسی آزردہ جانی را

قصۂ کوہکن بود و گوید — بدنے خون امداز فسانۂ ما

مخلص کے کچھ اردو اشعار بھی ملاحظہ ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۳) دہلی یونیورسٹی نے بڑی کاوش و محنت سے اڈیٹ کر کے سلسلۂ مطبوعات کتب خانۂ رامپور سے شائع کیا ہے، اس میں آنند رام مخلص کے سوانح حیات اور اسکی تالیفات پر بہت ہی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے ڈی لٹ نے اپنی کتاب ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ میں آنند رام مخلص کی تصانیف پر پر مغز بحث کی ہے ہم انہی دونوں کتابوں کی مدد سے مخلص کی تالیفات کی فہرست دی ہے،

لہ مخزن الغرائب قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۱۰۱۸ اس کے ریختہ کے اشعار تذکرہ میر حسن اور گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں،

یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرو ابلہی — پہنچو قمری کہ گیا آزاد جاتی ہے بہار

پھول پر نرگس کے گویا وہ نہ شبنم نہیں — عاشقوں کے حال پر انکھیاں بھر آتی ہو یہاں

دھوم آونے کی کس کے گلزار میں پڑی ہو — ہار ارغچے کا یا کہ نرگس لیے کھڑی ہے[1]

لال رام، باپ کا نام رائے دولت رام تھا، اس کا دادا رائے کشن عالمگیری ملازموں میں تھا،

لال رام محمد شاہ کی سرکار میں نوکر تھا، ۱۱۵۰ھ میں تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھ کر بادشاہ ہی میں تحفہ پیش کی،[2] یہ فرخ سیر کے عہد تک ہندوستان کی ایک مختصر تاریخ ہے، ایران کے ابتدائی دور کے بادشاہوں کے بھی کچھ حالات درج کئے گئے ہیں،

محمد شاہ کا علمی کارنامہ علم ہیئت سے متعلق ہے، یہ کارنامہ اس کے درباری ہندو امیر راجہ جے سنگھ کچھواہا کے حسن ذوق اور مساعی جمیلہ سے تکمیل کو پہنچا، جے سنگھ عالمگیر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں فوجی خدمت کی وجہ سے ممتاز تھا، محمد شاہ کے عہد میں آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، جے سنگھ ایک کامیاب فوجی افسر اور باوقار حاکم ہونے کے علاوہ علم و ہنر کا بھی سرپرست تھا، عربی علوم و فنون میں خاص دستگاہ رکھتا تھا، علم ہیئت سے اس کو بڑی دلچسپی تھی، اس نے

۱؎ چمنستان شعراء از لچھمی نرائن شفیق ص ۲۵۵، تحفۃ الشعراء گلزار ابراہیم ورق ۲۱۵ میں اس طرح ہے،

آنے کی دھوم کس کی گلزار میں پڑی ہے — ہاتھ ارغچے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے،

۲؎ معارف نمبر ۴ جلد ۲۰ محمد شاہ کی علم نوازی کا پتہ اس سے بھی چلے گا، کہ ایک بار اس نے نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان کو مرزا مظہر جانجاناں کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا، کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھکو دیا ہے، اس میں جو کچھ چاہیے قبول فرمائیے، لیکن مرزا صاحب کے استغنا کا یہ حال تھا کہ ہنس کر فرمایا قل متاع الدنیا قلیل خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے تصرف میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، (زندگی، رعنا ص ۱۳۲)

الغ بیگ کی زیچ جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات، اور ملا فرید شاہجہانی کی زیچ شاہجہانی کے اصول پر زیچ محمد شاہی ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، اس فن سے محمد شاہ کی دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علمائے ہیئت جمع کیے گئے، اور ۱۱۳۷ھ میں دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر شروع کی گئی، مرزا خیر اللہ مہندس اس کا مہتمم تھا، اس رصد خانہ میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانہ میں استعمال کیے جا چکے تھے، اور بعض خود راجہ مذکور کے ایجاد کیے ہوئے تھے۔[1]

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانہ کی تمام تحقیقات صحیح ہوں اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، دہلی کے رصد خانہ کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے، ان رصد خانوں میں ہندو، مسلمان، اور فرنگی علمائے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، یہی نہیں بلکہ کچھ لوگ پادری منوئیل کی معیت میں یورپ گئے، اور وہاں سے جو معلومات اور تحقیقات حاصل ہوئیں، ان کا مقابلہ یہاں کے اصولوں سے کیا گیا، پھر ان تحقیقات سے زیچ محمد شاہی تیار کی گئی جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت،[2] اس سلسلہ میں راجہ مذکور نے مزید قابل قدر خدمت یہ انجام دی کہ عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی ترجمہ کرایا، اور اس پر ہزاروں روپیہ صرف کیے[3]

محمد شاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کی مدت کہنے کو تو ایک سو برس اور رہی، لیکن دلی کی حکومت بقول آزاد ایک "ٹوٹی پھوٹی ہوئی درگاہ" تھی جس کے پانچ اور سجادہ نشین ہوئے،

[1] ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" (معارف نمبر ۵ ص ۲۲۹) [2] ایضاً نیز دیکھو فہرست مشرقی کتب خانہ پٹنہ، جلد یازدہم ص ۶۹، [3] ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب کا مضمون مذکور،

احمد شاہ | محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر بیٹھا، اردو کے مشہور شاعر اشرف علی فغاں احمد شاہ کے رضاعی بھائی اور ندیم خاص تھے، احمد شاہ ان کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بے حد مداح تھا، اس لیے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب عطا کیا، احمد شاہ کی معزولی اور قید کے بعد فغاں نے دہلی چھوڑ دی اور مرشد آباد چلے گئے، فغاں کو احمد شاہ سے نہ صرف محبت بلکہ عشق تھا، اس لیے محبوب کی یاد اور جدائی میں آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

جہاں میں میرا ایک دلدار تھا — اسی سے مجھے تو سروکار تھا
نہ کچھ کام تھا مجھکو گلزار سے — نہ واقف تھا ہرگز گل و خار سے
نہ سمجھوں تھا بلبل کے فریاد کو — نہ جانوں تھا میں جور صیاد کو
نہ معلوم تھا مجھکو شمشاد بھی — سنا تھا نہ میں قیس ناشاد بھی
اگر اس کا کچھ درد پاتا تھا میں — تو کاسہ کو خاطر میں لاتا تھا میں
مجھے دردمندوں سے کیا کام تھا — سدا وصل کے بیچ آرام تھا
جب اس یار چہرہ دھیان کرتا تھا میں — تو یوسف کو قربان کرتا تھا میں
اسی کو میں کہتا تھا ہے ماہتاب — وہی تھا مرا نیّر آفتاب
میں پوجوں تھا نت اس صنم کے تئیں — نہ سجدہ کروں تھا حرم کے تئیں
وہی ماہ تھا اور وہی شاہ تھا — غرض کچھ ہی تھا میرا اللہ تھا
سدا سیر کرتے تھے گلزار کے — کہیں طبع خوش ہو مرے یار کے
اگرچہ تھا وہ نازک مزاج — چلے تھے وہاں سے تو میں لاعلاج
یہ کہتا تھا اور وہ ستمگار کے — نہ چھوڑا اس مرے تو گلزار کے
اسے دیکھ کر چشم نرگس کا حال — کہ حیرت زدہ گئی ہے آنکھیں نکال

الٰہی اسے مری جان اسوقت ہیں | الٰہی ترے قربان واسوقت ہیں
ترے ہنس کے کہنا میں گھر جاؤں گا | مرا رو کے کہنا میں مر جاؤں گا
یہی مجھ میں اس میں تھا راز و نیاز | کوئی اس میں محمود کوئی ایاز
فلک نے یکایک ستم یہ کیا | دل شاہ کو داغ حرمان دیا

احمد شاہ کی وفات پر شہنشاہ عالمگیر کے وارثوں کے قبضہ میں دہلی اور سرہند کے چند ضلع رہ گئے تھے گجرات مرہٹوں کی پامالی میں تھا، بنگال، بہار اور اڑیسہ علی وردی خان جانشین کے تصرف میں تھے اودھ میں صفدر جنگ کا پرچم لہرا رہا تھا، وسط دوآبہ میں بنگش حکمرانی کر رہے تھے روہیلکھنڈ روہیلوں کے قبضہ میں تھا، پنجاب احمد شاہ درانی کو دیدیا گیا تھا، دکن میں نظام کی اولاد حکمراں تھی، ان کے علاوہ پورب میں تین علیحدہ اپنی قوم جاری تھیں، ایسی حالت میں جب کہ تیموری سلاطین خود نان شبینہ کے محتاج ہوگئے تھے علم و فضل کی سرپرستی کہاں ہوسکتی تھی۔

عالمگیر ثانی | عالمگیر ثانی شعر کہتا تھا، کہا جاتا ہے کہ عالمگیر ثانی نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار اقدس پر پہنچکر اپنی بادشاہت کے لیے دعا کیا تھا جب تخت کا مالک ہوا تو شکریہ میں یہ اشعار کہے،

جو ہوئے خادم نظام الدین کا دل سے اوئی غریب | اس کے یقین ہوتا ہے تاج خسروی بیگم ملتا
فادری کی تھی عزیز الدین نے با صدق و اخلاص | تاج شاہی ہند کا تکیہ کرد یا ہے حشر ہے
مرضی دلی دلگار کا ہے وہ محبت گری | شفا اور ہے دوا ہے کہ اسے لیا
لیں پریشان حال ہے اب تلک میں مجھو سی | لطف کر کے شہر وا دلی یہ بو کم حق سے کیا

شاہ عالم ثانی | عالمگیر ثانی کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا، پہلے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار رہا، پھر مرہٹوں کے ہاتھ میں آگیا اور ایک معزز قیدی بنا، اور اسکے بعد غلام قادر نے اندھا کیا

سے تیموری سلطنت کے فرمانرواکا جو انجام ہوا، وہ ارباب بصیرت کیلئے عبرت کا مقام ہے، اسی قلعہ معلّی کے اندر جس کے مکینوں کی غضب آلود نگاہوں سے ہزاروں سرکش کانپتے تھے، خود انکی ایک اولاد ایک ظالم سرکش کے پنجوں میں گرفتار تھی، اسی پرجلال دربار کا ایک اورنگ نشین جسکے اسلاف کی صولت و دبدبہ کے سامنے بڑے بڑے ارباب ثروت وحشمت سر عجز ونیاز جھکاتے تھے، ایک قلم ایجاد اور بے دردیاغی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھا جن کی ہیبت کے سامنے ارباب دانش پلک مارنا بھی سوئے ادب سمجھتے تھے ان ہی کا ایک فرزند سر دربار بے حس وحرکت پڑا تھا، اور اسکے سینہ پر ایک شقی انقلاب روہیلہ سوار تھا، مال ودولت کی تلاش میں حرم کی دیواریں کھودی جا رہی تھیں، نازنینان حرم کے پھول سے رخسار طمانچوں سے سرخ کیے جا رہے تھے، شہزادیوں کی دردناک فریادوں کی آہیں رواں تھیں، آہ و بکا کے شور سے قلعہ معلّی کے در و دیوار گونج رہے تھے عین اسی حالت میں ایک ظالم جفا جو "اندرکینہ پرور" روہیلہ نے

نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے (اقبال)

"شاہ عالم کو یہ مصیبت پیش آئی، وہ پھر بادشاہ بنا لیا گیا، لیکن وہ بادشاہ نہ تھا، دنیا کے لیے عبرت کا درس تھا، اس نے اپنی بے کسی کا ماتم خود کیا ہے،

صرصر حادثہ برخاست پئے خواری ما ۔۔۔ داد بر باد سر و برگ جہانداری ما

آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم ۔۔۔ برد در شام زوال آہ سیہ کاری ما

چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد ۔۔۔ کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

داد افغان بچہ شوکت شاہی برباد ۔۔۔ کیست جز ذات خدا کہ کند یاری ما

گنہ بودیم کہ ہم سزا یافتہ ایم ۔۔۔ ہست امید کہ بخشند گنہ گاری ما

کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد برباد ۔۔۔ زود دریافتہ تلافی ستمگاری ما

آنچہ شاہان بسی جہرہ کہ ہم بودند ۔۔۔ کیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

حق طفلان کہ ز سی سال فراہم کردند | کردہ تاراج نمودند سبکساری ما
عہد و پیمان عیان دادہ نمودند وفا | تحلیان خوب نمودند وفاداری ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم | عاقبت گشت بچہ در پے خونخواری ما
قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی دادند | بسکہ گشتند مجوز گرفتاری ما
این گداززدہ ہمدان کہ بہ دوزخ بردند | بانی جور و ستم شد بہ دل افگاری ما
گل محمد کہ ز مردان بہ شرارت کم نیست | چہ قدر کرد و کاست پے آزاری ما
نامراد و سلیمان و بدل بیگ لعین | ہمہ بستند کمر بہر گرفتاری ما
شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من | زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما
مادھوجی سندیہ ہمیا فرزند جگربند منست | ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند | چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما
راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر | حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما
نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند | نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما
گرچہ از فلک امروز خوار و شدیم | باز فردا دہد ایزد سر سرداری ما

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہ عالم سخن گوئی میں کافی مہارت رکھتا تھا، اسکا تخلص آفتاب تھا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں اشعار موزوں کرتا تھا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ وہ بڑا مشاق شاعر تھا جس کے چار دیوان اردو میں موجود ہیں[۱] لیکن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک ہی جلد ہے[۲] نیز فہرست[۳] بتاتی ہیں اور اسپرنگر[۴] کی فہرست میں بھی ایک ہی کا ذکر ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے دیوان میں شاہ موصوف کی ایک مثنوی موسوم بہ

۱۔ آب حیات ص ۱۶۳، ۲۔ ملاحظہ ہو انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۲۳۶، ۳۔ ایضاً ۶۲۰

۴۔ ایضاً ص ۳۱۸

"منظوم اقدس" بھی شامل ہے جس میں شاہ چین یا مظفر شاہ کا قصہ ہے، مولوی ذکاء اللہ[1] کا بیان ہے، کہ شاہ عالم نے نثر میں چار جلدوں میں ایک قصہ بھی لکھا ہے، جس سے ہر زمانے کے ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ آدمیوں کا طرز معاشرت معلوم ہوتا ہے، اس کا نام "شاہ عالم کا قصہ" ہے[2]۔

شاہ عالم نے اپنے عہد کے تمام ممتاز شعراء مثلاً سودا، میر، درد، نصیر، انشا، آزار، مصحفی، احسان، قائم، اور فراق سے کچھ نہ کچھ ضرور واسطہ رکھا، جہاں دہلی کے تمام شعراء جمع ہوکر اپنی جولانی طبع دکھاتے تھے، وہاں شاہ عالم اپنی غزلیں بھیجتا تھا، سودا کو اپنا کلام دکھاتا تھا[3]، خواجہ میر درد کے یہاں محفل سماع میں شرکت کرنے کیلئے کبھی بادگیا، ایک بار پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکا، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اسکے متحمل نہ ہوسکے، فرمایا کہ یہ فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے، شاہ عالم نے عذر کیا، اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی[4]، سید انشاء اللہ خاں انشا کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا، انکی ایک لمحہ کی جدائی اسکو گوارا نہ ہوتی تھی، مگر عبرت کا مقام یہ ہے کہ جن کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر وجواہر سے بھر دیتے تھے اور انکو سونے چاندی میں تلواتے تھے، آج انکے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کیلئے دو دو پیسہ روز کے لئے کچھ رقم دیتا[5]۔

شاہ عالم کی اردو شاعری کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا — ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اس نے آہ — ہو جیو یا رب بھلا اس چشم آتشبار کا
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے نگاہ — کر سکے عیسیٰ نہ دوا اپنے کب بیمار کا
خون ہو دیگا گلوں کو دیکھنا ہرگز صبا — نام مت لینا چمن میں اس بت خونخوار کا
کب تجھے مشتاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے — یاد آئے گا دل میں جب سایہ تیری دیوار کا
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب — کوئی بھی چارہ نہیں بیمار اس آزار کا
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ — ڈھونڈھنا جا کر ہر طرف نقش قدم دلدار کا
اسقدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب — دیکھ کر ہوتا ہے تجھکو تنگ دل گلزار کا

[1] تاریخ ہندستان ج ۹ ص ۳۱۱
[2] آب حیات ص [illegible]
[3] گل رعنا ص ۱۳۳
[4] ،، ،، ص ۱۶۱
[5] آب حیات ص ۲۴۱
[6] ،، ،، ص ۲۴۲

صبح تو جام سے گزرتی ہے ۔۔۔ شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے ۔۔۔ اب تو آرام سے گزرتی ہے

ولہ

تصور ترا جس کو اسے یاد ہوگا ۔۔۔ اسے خیر سے کیا سروکار ہوگا
مرا لخت دل اشک میں ڈھونڈنا ۔۔۔ اسی قافلہ میں وہ سالار ہوگا
دیا دل تو ہے آفتاب اسکو لیکن ۔۔۔ خدا جانے کیا عاقبت کار ہوگا

ولہ

چھیڑنے کا تو مزہ یہ ہے کہو اور سنو ۔۔۔ بات میں تم تو خفا ہوگئے لو اور سنو

ولہ

آئے جو خواب میں بھی وہ یوسف لقا تو پھر ۔۔۔ اے آفتاب دولت بیدار دیکھیے
جوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب ۔۔۔ جلیے اشکبار مجھکو رلاتی ہے چاندنی
تری اس مانگ سے کیا معنی دلخواہ ہے پیدا ۔۔۔ شب معراج کی اس خط سے گویا راہ ہے پیدا
مدت سے اشتیاق ہے پیارے جو آئیے ۔۔۔ ٹھہرو رواق چشم میں سیریں دکھائیے[1]

شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی کا بھی شاعر تھا اور اپنے ہی کلام کا مجموعہ "نادرات شاہی" کے نام سے مرتب کیا تھا جو اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالہ کے حکم سے سلسلۂ مطبوعات کتب خانہ عالیہ ریاست رامپور میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کے شروع میں اردو زبان کے مشہور شیدائی علم و فن مولوی امتیاز علی خان عرشی کا پرمغز اور بسیط لکھا ہوا مقدمہ ہے۔

[1] یہ اشعار تذکرہ گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، تذکرۂ ہندی مصحفی اور گلشن ہند سے لیے گئے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے، وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لیے نہیں بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت و عظمت کی یاد میں خون کے آنسو بہانے کے لیے، سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی، سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا، پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا، اس کی ساری بادشاہی قلعہ معلی کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں نہ وہ سلطنت کے لیے فرامین صادر کرتا، اور نہ اعیان حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے توڑتا، اور جب وہ ٹوٹ کر بہ جاتے، تو اس کے سوز و گداز کا اظہار اپنے نالہائے موزون سے کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ اور شعرا کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے:

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا نالہ زار　　　کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج و تخت کا گو نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ ضرور تھا، جہاں اس نے اپنی ذہانت و ذکاوت اور طبیعت کی بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ سیاسی امور میں انہی اوصاف کو کام میں لاتا تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاست داں بھی ثابت ہوتا، لیکن نہ اب تم کی معرکہ آرائیاں تھیں اور نہ رزم کی ہنگامہ خیزیاں، لامحالہ ایک بے چین اور بے قرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہو گئیں اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا۔

ظفر کا دور ہندستانی شاعری کا دور شباب تھا، نصیر، ذوق، ممنون، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کی شاعری نے ریختہ کی زمین کو آسمان پر پہنچا دیا تھا، ان ہی اساتذہ کے ساتھ ظفر نے بھی طبع آزمائی کی، اور نمایاں حیثیت حاصل کی، نصیر نے ریختہ میں مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی، ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات سے آراستہ کیا، مومن اپنی نازک خیالی اور شوخی ادا کے لیے ممتاز ہے، غالب کے طرز بیان، مسائل تصوف، اور نکات فلسفہ نے شاعری کو عرش معلی پر پہنچا دیا، مگر اس گروہ میں ظفر کی شاعری میں جو سلاست، صفائی، اور روزمرہ کی سادگی پائی جاتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے،

طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے | اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا
ظفر کلام میں تیرے عجب صفائی ہے | کہ ہر سخن ترا در خوش آب سا چمکا
خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو | ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحر المعانی ہے

ظفر شاعری سے طبعی مناسبت رکھتا تھا، ایام شاہزادگی سے زندگی کے آخیر دنوں تک شعر وسخن کی مشق کرتا رہا، ولی عہدی کے زمانہ میں دلی کے تمام باکمال شعراء مثلاً حکیم ثناء اللہ فراق، حافظ عبدالرحمن خان احسان، حکیم قدرت اللہ خان قاسم، میر قمر الدین منت، نظام الدین ممنون اس کے در دولت پر حاضر ہوتے تھے، ان کو اپنا کلام سناتا، اور ان سے ان کے نتائج فکر سنتا، سریر آرا حکومت ہوا، تو قلعہ معلی کے اندر بزم مشاعرہ منعقد کراتا، کبھی کبھی شہر میں جا کر مشاعروں میں شریک ہوتا، اپنی غزلیں پڑھتا، دوسروں کی سنتا، داد لیتا اور داد دیتا تھا، یہاں تک کہ استاذ فن میں شمار کیا جانے لگا تمام ارباب نظر نے اس کی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کی دل کھول کر داد دی ہے،[1]

[1] نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جو ظفر کے ہم عصر تھے اور اس کی صحبت میں شریک بھی ہوتے تھے، لکھتے ہیں:

باکثر صفات موصوف و بمحاسن کلام معروف در اکثر بیانش خیلے دلبستگی ست شعرا بسیار ستودہ دارد
(باقی انا شیفتہ صفحہ ۳۳)

ظفر شاعری میں پہلے تو نصیر، پھر بے قرار، پھر ذوق، اور آخر میں غالب کا شاگرد ہوا، مگر اسکی ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی ایک کی بھی خاص تقلید و پیروی نہیں کی، طبیعت میں خاکساری تھی، اس لیے اساتذۂ فن کی شاگردی قبول کر لیتا تھا، مگر اساتذہ اپنے لائق شاگرد کو اپنے خیالات اور جذبات سے متاثر نہ کر سکے، وہ شاید صرف فن کے اغلاط اور اسقام درست کر دیتے تھے، ورنہ اگر ظفر اپنی راہ چھوڑ کر اپنے استادوں کی راہ پر گامزن ہوتا، تو اس کے سارے کلام میں اول تو نصیر کی مضمون آفرینی اور شکوہِ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے، یا پھر ذوق کی طرح عام زبان کی کہاوتیں، اور عام لوگوں کے اوہام و معتقدات کی کثرت ہوتی، یا آخر میں غالب کے فلسفہ، تصوف کے مضامین اور فارسی کی پرشوکت ترکیبیں ہوتیں، مگر ان میں سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری اس کے کلام میں نہیں، وہ اپنے ہی رنگ اور طرز ادا کا مالک تھا، بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا، پھر زندگی کچھ ایسی گذری کہ شاعر نہ بھی ہوتا، تو انقلابات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲) (یعنی شاعری) بسیار مالوف است، شیخ ابراہیم ذوق از زمانہ قدیمش زلہ ربا و وظیفہ خوار

است و دیگر ایشان بمجالست و اصلاح آمد و رفت دارد"۔

منشی احمد حسین سحر گلزار بہار بے خزان (۱۲۹۲ھ) میں ظفر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ظفر تخلص، مرزا ابو ظفر بادشاہ دہلی با فن شعر میل و مناسبتے تمام دارد، ابراہیم ذوق از

مخصوصان حضرت او است، و افکار ایشان با صلاح او چون گوہر آبدار شدند"

تذکرہ بزم سخن میں ظفر کے بارے میں یہ ہے:۔

"... بادشاہ ... گفتارش اگرچہ سادہ پرکار است ہمہ اش خاطر شکار است

خامہ رنگینش ترجمان او ست و معاملہ فہمیش بیرون از بیان او"

منشی کریم الدین ... ظفر ...

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۴۴ پر)

زمانہ اور حوادثِ روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہو جاتا ، اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی ، عزت و وقار کا خاتمہ ہوا ، تو نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا ، در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرا ، لختہائے جگر کو خون میں تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ، اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس و مقید ہو کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی ، شاعر بننے کے لیے اور کیا چاہیے تھا ، اور شعرا نے بلبل کے نالۂ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا ، ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی ، اور شعرا نے عاشقانِ زبوں حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں کھینچ کر عبرت کا پیام دیا ، ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستان رہی ، اس لیے اس کی ہر صدا صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آوازِ بازگشت ہو گئی ، اور شعرا نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا رونا رویا ، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستان کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ، اس کے خیالات میں نشتر سب نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا ؟ اپنی شاعری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳) " شعر ایسا کہتے ہیں ، کہ ہمارے زمانہ میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا ، ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں ، تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے ، ابتدا میں ولی عہد تھے ، ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے ، تمام ہندوستان میں اکثر قوال ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں ، ہر ایک قسم کے شعر ہیں "

ظفر کی بابت مولوی امام بخش صہبائی کی ایک دلچسپ عبارت ملاحظہ ہو :-

" گوہرِ سخن اس کے لب سے ہم پایۂ اعجاز ، اور مضمونِ نیاز اس کے اشعار میں ہم پہلوئے ناز ، شاہدانِ محفلِ قدس ہر راہ سے اس کے جادۂ قلم میں عنان افگن ہیں ، اور نازنینانِ ملک تقدس ہر طرف سے اسی کے میدانِ صفحہ میں گامزن ہیں ، اس کے قلم کی صریر ہے یا خوش خرامانِ معنی کی آواز ، اس کے الفاظ سے فروغِ معنی جلوہ گر ہے ، یا مینا سے پری نقاب کشا ..... اشعار مشعوفانہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۵ پر)

مین خون جگر خوب خوب بہایا، اس کی تمام شاعری مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہے، یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری سلطنت کا آخری فرمانروا ایسا ہو، جو صحیح طور پر اپنے کمال کے زوال کا خونچکان ماتم کرسکے،

یہی وجہ ہے کہ ظفرؔ کی شاعری حزن وملال، رنج والم اور یاس وحسرت کی سراپا داستان ہے، دیوان مین بعض غزلین ایسی ضرور ہین، جن مین رنگینیون اور سرمستیون کی جھلک ہے، اور بعض تو متانت اور سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہین، مگر یہ شاید غایت رنج ومصیبت اور شدت غم والم کا ردعمل ہے، ظفر کی اندوہناک زندگی مین کوئی ایسی صورت باقی نہین رہی تھی، کہ وہ چار گھنٹے بیٹھکر غم غلط کرلیتا، گذشتہ روایات کے مطابق نہ شکار کی تفریحین تھین نہ عیش ونشاط کی محفلین، اور نہ قلعہ معلی کے اندر مسرت وشادمانی کی مجلسین، لامحالہ شدت غم سے چھٹکارا پانے کے لیے ظفرؔ شاعری مین رند بلانوش اور غافل از تمکین وہوش ہوجاتا، ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ مصیبت ونکبت کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۴) مین دیدۂ بینا اور ابیات عاشقانہ مین چشم گریہ زا اور بین السطور بہاریہ مین خیابان او فلکیات مین کہکشان نقش شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن اور نگاہ تازگی رقم سے رشتۂ یاسمن

مصرع قامت شمشاد بیت ابروے خوبان نخل نو نوشاد،

عبدالغفور نساخ اپنے سخن شعراء (۱۲۹۱ھ) مین لکھتے ہین:-

"اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے، شعر نہایت شیرین ونمکین کہتے تھے"

موجودہ دور کے ادبا مین خواجہ الطاف حسین حالی تحریر فرماتے ہین، کہ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی مین اول سے آخر تک یکسان ہے،

محمد حسین آزاد نے باوجودیکہ اپنے استاد کی محبت اور عصبیت مین ظفرؔ کے تمام کلام کو ذوق کی طرف منسوب کردیا ہے، پھر بھی وہ اس کو شعروشاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ بتاتے ہین،

تصوف و روحانیت نے فرد پر ایسا تسلط پا لیا تھا کہ وہ صرف دعا و وظائف میں مشغول رہتا، بلکہ آل تیموری کی ذہنی و سیاسی پیری و مریدی ظفر کے ہاں حقیقت بن گئی تھی، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

ظفر کا دیوان نولکشور پریس لکھنؤ سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے جس میں ہر قسم کے بیس ہزار سے زیادہ اشعار، مثلاً حمد، نعت، سلام، مرثیہ، سہرے، مثلث، مخمس، مستزاد، قطعات، رباعیات پہیلیاں اور سہرا ہیں، بھاکا، پنجابی اور فارسی کے بھی اشعار ہیں۔ جن سے ظفر کی طباعی اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ حصہ شامل نہیں جو ظفر نے غدر کے بعد کہا، اس زمانہ کا کلام شائع نہ ہو سکا، اگر شائع ہو گیا ہوتا، حالانکہ اس زمانہ کی شاعری میں نہ صرف پختگی بلکہ جذبات میں اور بھی درد اور شدت پیدا ہو گئی ہو گی۔

کلام ظفر | دیوان اول کے پہلے ایک نعتیہ قصیدہ سے شروع ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اے سرورِ دو کون شہنشاہِ ذوالکرم | سرتاجِ مرسلین و شفاعت گرِ امم
ہو کیسے تیرا ثنا خواں و مرکب تیرا براق | تو لا مکاں ہے تیرا اک و جنبش تیرا قدم
زلف سیاہ سے تیرے گیسوئے مشکبو | نور رخ سے تیرے روشن دل قدم
ہوتا کبھی نہ قالب آدم میں فتح روح | ہوتا اگر نہ تیرے سے تیرا دم
کرتا تھا جس سے ہر دو کو زندہ وہ مسیح | تھا اس سے تیرے لب کا وہ اعجاز دم بدم
تو جو کہ ظفر دے سلام سے زیادہ | [illegible]
تو تھا سر پیادہ ء رسالت چہ جلوہ گر | آدم ابھی تھے آب و گل میں پیدہ عدم
کرتا ہے تیرے اسم مبارک کو دل نقش | [illegible]
اے سعد لی کرم تیری دست کے ورد | [illegible]
تیرے کچھ سوا کسی کو دیکھا میں | [illegible]

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر کیونکے آسماں
رکھتا سرِ زمیں نہ اگر آپ کا قدم

محروم تیرے دستِ مبارک سے رہ گیا
کیونکر نہ چاک اپنا گریبان کرے قلم

عالم کو تیرے نور نے پیدا کیا ظہور
آدم ترے ظہور سے ہے مظہرِ اتم

ہیں زائرانِ روضۂ اقدس ترے جہاں
آتا ہے پا سے بوس کو واں روضۂ ارم

واللیل تیرے گیسوئے مشکین کی ہے ثنا
والشمس ہے ترے رخِ پُر نور کی قسم

انصاف تیرا دیکھ کے ہو جاوے ستم کشاں
دندان ہیں آرہ کشان بہرِ سرِ ستم

قرآں ہیں جب کہ خود ہو ثنا خوان ترا خدا
کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم

تیری جنابِ پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض
صدقے میں اپنی آل کے اے شاہِ محتشم

صیقل سے اپنے لطف و عطا ہی کے دور کر
آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم

پہونچا نہ آستانِ مقدس کو تیرے میں
اس غم سے مثلِ غنچہ ہوئی میری چشم نم

پہنچا کے آستان پہ تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سر کے بل میں طے رستہ قدم قدم

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل ہے، بقول عرفی: ع رہ بر دمِ تیغ است قدم را، لیکن ظفر کے ہم عصر شعراء میں اتنا موثر نعتیہ قصیدہ کسی نے نہیں کہا، وہ کچھ اور نہ بھی کہتا، تو صرف یہی قصیدہ اس کے اعجازِ شاعری کے لیے دلیل و برہان تھا، دیوان کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ حمد سے شروع ہوتا ہے جس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

ثنا اُس ذاتِ والا کی ہے اللہ تعالیٰ
بچایا اس نے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا

الٰہی تیری جنبشِ مژگانِ قلم کی
اک پل میں کیے تو نے دو عالم تہ و بالا

ادا ہووے نہ ہو کس طرح سے حمدِ یزداں کی
اگر صد زبان ہو وے زبانِ خامۂ سخنداں کی

اگر سوچے کوئی پارہ پارہ دل اسکی آیات ہیں
تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سی پارہ قرآں کی

جسے خیال ہے کچھ رحمت الٰہی کا
گناہ سمجھے ہے دعویٰ وہ بیگناہی کا

یہ لطف دیکھ کہ خود بے نیاز ہے لیکن
وہ دھیان ہے اسے بندوں کی خیر خواہی کا

تم اپنے جی میں عزیز اور ذلیل ٹھہرا لو
خدا ہے ایک مہ و مہر و مرغ و ماہی کا

ظفرؔ کو اپنے حمد و نعت پر بہت زیادہ فخر تھا، چنانچہ کہتا ہے،

ظفرؔ مضمون حمد و نعت کے لکھا رنگین سے
ورق میرے سخن دیوان کا ہے اک باغ رضوان کا

ظفر کی المیہ شاعری | اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے کہ ظفرؔ کی تمام شاعری الم و یاس اور اندوہ و غم سے بھری ہوئی ہے، بعض غزلیں تو پوری کی پوری المناک جذبات سے لبریز ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی مٹی ہوئی شوکت اور گذری ہوئی حشمت پر بے اختیار ہو کر روتا ہے، اور آنسو بہا بہا کر کہتا ہے:-

بلا سے گرچہ ہوتا زار دل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں

پڑا ہے کشتی افلاک کا رونا زمانے میں
مری آنکھوں نے وہ طوفان کیا برپا ہے رونے میں

مری دیوانگی کا اے پری رو ہے عجب عالم
کبھی رونے میں ہنستا ہوں کبھی ہنستا ہوں رونے میں

سنا ہے نوح کے طوفان کو یاروں نے کانوں سے
مگر آنکھوں سے اپنی ہم نے دیکھا ہے رونے میں

لگے آگ ایسے رونے کو کہ مثل شمع گھل گھل کر
بہا جاتا مرا دل سوز سرتاپا ہے رونے میں

ظفرؔ ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

پھر بھی روتا جاتا ہے، اور اس کے رونے میں اتنی شدت ہے کہ اس کو خود احساس ہے کہ

لگ جائے جھڑی برسوں پھر ایسی جھڑیں آنسو
جھاڑوں جو دم گریہ میں دامن مژگاں کو

اور جب رو کر چپ ہوتا ہے، تو اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے آہ سوزاں بلند کرتا ہے

شعلہ جو سوز دل سے گلوگیر آہ ہو
پیکاں نمط عیاں وہ سر تیر آہ ہو

سیل سرشک چشم کبھی ہمراہ ہو اگر — چون سرو آبجو یہاں توقیر آہ ہو
دکھلائے جو سوزش دل کو تو برق بھی — حیران دیکھ عالم تنویر آہ ہو
کلک چلی تو شمع جگر سے بنا — مانی جو کھینچے تو مری تصویر آہ ہو
نالاں ہیں ایک عمر سے ہم اے ظفر — کب اس کے دل میں دیکھئے تاثیر آہ ہو

اور جب آہ کھینچنے سے بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، تو چیخیں مارتا ہے، اس طرح جیسے کوئی نشتر اس کے تمام جسم میں چبھو رہا ہو۔

کیا رنگ دکھاتی ہے چشم ترا ہو ہو — خون جگر آیا لخت جگرا ہو ہو
اس ہستی یک دم پر اف بلبلے تری تھا — باتا ہو شرارت سے کیا کیا شررا ہو ہو
اک وار میں دو ٹکڑے کرتی ہے مری دل کو — کیا تیز ہے قاتل کی تیغ نظرا ہو ہو
چھڑکے ہے نمک قاتل سے اپنے نمکدان — سینے میں مرے کیا کیا زخم جگرا ہو ہو
ہستی کی عدم سے ہم مر مر کے پہنچتے ہیں — اک دم کی مسافت پر اتنا سفرا ہو ہو

اس پر بھی اس کو تسکین نہیں ہوتی ہے، تو اپنی حالت اس طرح بیان کرتا ہے کہ

سینہ میں اک دھواں کئی بار اٹھ کے رہ گیا — نکلا نہ میرے دل کا بخار اٹھ کے رہ گیا
آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے — سو بار دیکھا ابر بہار اٹھ کے رہ گیا
دیتا چلا تھا ... کہ جگر تیر ہو گئی — ساتھ آہ کے جو دل سے شرارہ اٹھ کے رہ گیا

آتش غم سے اس کا دل جل کر داغدار ہو گیا تھا، وہ بھی ایسا کہ خود کہتا ہے،

ذرہ جو دکھاتا ہوں داغ دل سوزاں کو — چڑھتی ہے تپ لرزہ خورشید درخشاں کو

وہ اپنی مصیبتوں اور صعوبتوں سے گھبرا جاتا ہے، اور ظالم چرخ سے شکایت کرتا ہے کہ

ستمگر دوستی کا نام ہوں اور نہ اکدم دلرسا ہو — یہ کیا انصاف ہے اے چرخ گرداں یہ نہ ہو وہ ہو

مگر پھر اپنے کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے کہ

ہو زیر فلک راحت کس طرح ظفر ہم کو　　　آرام نہین آپ ہی اس گنبد گردان کو

یہ تو ظفر کی واردات زندگی کا نالہ و شیون تھا جن کے تاثرات کی گہرائی کو ظفر نے خود بیان کیا ہے کہ

ہمسر ہون میرے نالہ سے کیا نالہاے نے　　　اس مین ظفر یہ سوز کہان اور کہان گداز

اب یہی سوز و گداز اس کی شاعری کے ہر پہلو مین نظر آتا ہے، جب وہ ایک شاعر بن کر عشق کی تمام واردات یعنی محبوب کی کج ادائیان، ستم آرائیان، اور بے اعتنائیان بیان کرتا ہے تو طالب محبوب کی محویت، شیفتگی اور ہجوم آرزو مین صرف سوز و گداز ہی کی نیرنگیان دیکھنا چاہتا ہے، اس کا معشوق عام معشوقون کی طرح ظالم، پر فریب، حیلہ ساز اور دل آزار ضرور ہے، لیکن اس کے عاشق کے عشق مین ہوسناکی نہین وارفتگی ہے، وصال کی لطف اندوزی نہین، ہجر کی غم انگیزی ہے، اور حسن کی رسوائی نہین بلکہ عشق کی بے پائی ہے،

اس کا عاشق عشق کے میدان مین اس طرح آتا ہے، کہ

جو آگے عشق کے میدان مین بڑھائے پاؤن　　　تو شرط یہ ہے کہ پیچھے نہ پھر اٹھائے پاؤن

اور جب وہ سر بکف ہو کر اس میدان مین آجاتا ہے، تو پھر وہ ہے اور ہر قسم کی مصیبتون کی ہلاکت خیزی، وہ ہے اور عشق کی آتش سوزی،

ہوتی ہے بری عشق کی آتش یہی ڈر ہے　　　گھر پھونک نہ دے آتش سوزان کسی کا

خانہ دل کو لگی ہے آگ سوز عشق سے　　　ہر بن مو سے نکلتے ہین شرارے بے طرح

مگر با این ہمہ وہ عاشق سے ضبط، تحمل، سرفروشی، بلکہ صرف تڑپ چاہتا ہے، اور وہ بھی ایسی کہ جل کے خاک ہو دل اور خبر کسی کو نہ ہو

وہ تو عشق میں رونے کا بھی قائل نہیں،

رو رو کے میرا راز نہان فاش کر دیا　　خانہ خراب ہو جیو چشم پر آب کا

لیکن جب ہجر میں بے تاب ہو کر روتا ہے، تو پھر یوں کہ

نہیں اے ابر ہم قائل کہ آنسو سر بسر ٹپکے　　وہ کیا آنسو ہو جو بے آمیزش خون جگر ٹپکے
ہر اک آنسو کا قطرہ ہو جو دانا کہربا کا سا　　دم گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

مگر حقیقت میں وہ چشم گریان کا نہیں، بلکہ دل بریان کا قائل ہے، دل جل جائے مگر شرط یہ ہے کہ خاکستر نہ ہونے پائے بلکہ اس میں صرف سوزش ہو اور اس طرح کہ

دکھلائیں سوزش دل بیتاب اگر ہم　　کانپ اٹھے شعلہ شوق سے نار جحیم کا

اور اس سوزش میں اتنی ٹیس ہو کہ

دونوں گداز عشق سے بہ جائیں ہو کے آب　　آہیں جو دل کے پاس ہو پھر جگر کے پاس

اور پھر اس کے دل میں کچھ باقی نہ رہ جائے،

دل میں تو کچھ نہیں ہے، دم دو دے ظفر　　اک آہ رہ گئی ہے فقط اک جگر کے پاس

ظفر کے عشق کا فلسفہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا عشق تو اس کا مقتضی ہے کہ عاشق اس سوزش سے مضطرب، بے قرار اور بے چین ہونے کے بجائے لطف اندوز ہو، عشق کی آگ سے دل پر داغ پڑ جائیں، مگر:-

خانۂ دل میں رہے روشنئ داغ عشق　　بجھنے نہ پائے مرا یہ کبھی یارب چراغ

اور گو جگر میں زخم پڑ جائیں لیکن:-

بھایا نہ زخم دل سے اٹھا میرے چارہ گر　　رہنے دے اس کو تو خم پر جوش سو ڈھنگا

کیونکہ

سب پہ کھل جائیگا میرے دل مجروح کا حال　　دل کے زخموں کو دیا بھی جو پہ سر کے ٹانکا

ظفر کے یہاں ایک کامیاب عشق کے مدارج بیان بھی ختم نہیں ہوتے، اصلی سوز عشق تو یہ ہے، کہ

دفن ہووےگا ترا کوئی جہاں سوختہ جاں　　سبزہ واں خاک سے پیدا کبھی ہونے کا نہیں

بلکہ

اف رے کشتہ کا ترے دل کہ ظالم سنگ بھی　　گور پہ اس کے رہا محشر تلک جلتا ہوا

اور

رفاقت کیا کروں آہ جگر اور داغ سوزاں کی　　ہماری قبر پہ حاجت نہیں ہے شمع گریاں کی

ظفر کی اخلاقی شاعری | گذشتہ صفحات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ظفر کی طبیعت پر حزن و ملال کس قدر غالب ہے، تلخیوں ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں انکی زندگی محصور ہو گئی تھی اور ہر آرزو شکستہ رہ گئی تھی، ظاہر ہے کہ ایسے حسرت زدہ اور ارمان بھرے انسان کے دل و دماغ پند و نصیحت کے لیے کیونکر موزوں ہوں گے، ظفر نے اس سلسلہ میں جتنے اشعار کہے ہیں، وہ محض ایک فلسفی کے خیالات نہیں ہیں، بلکہ اپنی واردات زندگی سے جو کچھ اس نے محسوس اور اخذ کیا، ان کو اشعار کی سلک میں منسلک کر دیا ہے، وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور خیالات کے پیچیدہ موشگافیوں میں اپنے ناظرین کو گم کرنا نہیں چاہتا ہے، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے، اس کی تلخ زندگی اور پھر اس کے اشعار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو پڑھنے والوں پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے، جو غیر ارادی طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے،

شاہ جہاں اور جہانگیر کا آخری جانشین گویا اپنی سلطنت کی بربادی کا یوں نقشہ ایک مرقع کھینچتا ہے:-

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میدان اور ہے سر اک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایوان تھے چمن تھے اور شجر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم بر یاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رلتے گہر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں وہ شور و شر یاں تھے

جہاں اب خاک پر نقش پا ہے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظر یاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا انقلاب اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

اس عالم میں دنیا کی بے ثباتی کا پورا نقشہ ہے۔ ظفر کی زندگی اور پھر زندگی کا انجام کچھ ایسا تھا کہ وہی دنیا کی بے ثباتی کی [illegible] اور [illegible] میں پہنچ سکتا تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے:

[illegible] آگہ [illegible]
کہ جب ہم سے ذرا اتنا کہا اے شور محشر
کمر ہی [illegible] شاخ گل پہ بیٹھ کر
[illegible] اٹھے گا اور ہزاروں جائیں گے
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

یہ تو شعر و شاعری کی زبان تھی، مگر اسی کو صاف صاف اپنی ایک پوری غزل میں دوسری جگہ بیان کرتا ہے:

جو تماشا دیکھنے دنیا میں تھے آئے ہوئے
[illegible] آخر وہ پچھتائے ہوئے

فرش [illegible] پر [illegible] آتا تھا
[illegible] سوتے ہیں اب وہ پاؤں پھیلائے ہوئے

جو [illegible]
[illegible] سے پیدا وہ گھبرائے ہوئے

غنچے کہتے ہیں کہ جو تھا دیکھنا [illegible]
[illegible] دیکھتے ہیں پھول کمھلائے ہوئے

غافلو اس نقش ہستی پر کہ ہے نقش برآب　　موج کے مانند کیوں پھرتے ہو بل کھائے ہوئے

اسی لئے وہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں کو عبث اور ہیچ سمجھتا تھا' اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی تمام نیرنگیاں عبرت کا پیام تھیں، ایک عظیم الشان سلطنت کی بیخ کنی اس کی نظروں کے سامنے ہو رہی تھی، ایک پُر جلال، پُر ہیبت اور پرشکوہ خاندان کے خدم و حشم، عز و شان اور سطوت و جبروت کا خاتمہ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تخت طاؤس پر بیٹھنے والوں کا جانشین ہمالیہ سے راسکماری تک کے فاتح کا وارث اور کوڑیوں کی طرح زر و جواہر لٹانے والے کی یادگار، چند روپیوں کی محتاج ہو رہی تھی، ایسی حالت میں دل اور جگر کے زخموں کی ٹیک سے یہ درد انگیز چیخیں کیوں نہیں نکلتیں، کہ

سب کار جہاں ہیچ ہے سب کار جہاں ہیچ　　اس ہیچ سے اُمید ہے اے ہیچداں ہیچ
مانند حُباب ایک نفس میں ہے خرابی　　اس منزل فانی میں ہے بنیاد مکاں ہیچ
اک عمر ہے مایۂ دنیا سے گراں بار　　آخر کو جو دیکھا تو بجز بار گراں ہیچ
اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر آئی　　اے تو گل خنداں مجھے تشویش خزاں ہیچ
ہو جنس تنک مایۂ ہستی کے نہ خواہاں　　یہ جنس یہ بازار یہ گوہر یہ دکاں ہیچ
آواز طرب گوش دل محو فنا سے　　جز نالہ و فریاد و بجز آہ و فغاں ہیچ
پایا نہ بجز داغ سیہ کاری یک عمر　　نقش قدم قافلۂ عمر رواں ہیچ

کیا دیکھیں ظفر خانۂ ہستی کا تماشا
اس وہم کدہ میں بجز وہم و گماں ہیچ

مگر ظفر جانتا تھا کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کی داستان خواہ کیسی ہی دردناک اور عبرتناک ہو وہ انسانیت کی دنیا میں گنہگار اور مجرم ہوگا، اگر وہ لوگوں کے لئے صرف

الم ویاس اور حسرت و حرمان کا پیام چھوڑ جائے گا۔ وہ اس سے واقف تھا، کہ زمانہ انقلاب آفرین ہے، اس دنیا مین :-

نہ دائم غم ہے نہ عشرت کبھی یون ہے کبھی وون ہے
تبدل یان ہے ہر ساعت کبھی یون ہے کبھی وون ہے
کوئی دن ہے بہار گل پھر آخر ہے خزان بالکل
چمن ہے منزل عبرت کبھی یون ہے کبھی وون ہے

اسی لیے اس کا پیام ہے، کہ فلک کے تمام مظالم کے باوجود انسان کی ہمت مردانہ کا اقتضا یہ ہے کہ ضبط و صبر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ کرے، کہتا ہے :-

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسمان پیہم
دل اسکے ہاتھ سے پر درد ہے اور چشم ہے پرنم
کرونگا پر نہ شکوہ گرچہ ہونگے لاکھ غم پر غم
کہے جاؤنگا مین ہر دم یہی جبتک ہے دم مین دم

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

اور جب انسان خدا پر بھروسہ اور توکل کرنے لگتا ہے، تو پھر دنیا کے تمام لوگون سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔

بلا سے اگر نہین کوئی رفیق و آشنا میرا
خدا پر دھیان ہے میرا نگہبان ہے خدا میرا
خدا آسان کرے گا گو ہے مشکل مدعا میرا
خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

مگر ظفر کا خدا پر بھروسہ کرنے سے مطلب ہرگز یہ نہ تھا، کہ انسان اپنی زندگی کو خود سنوارنے کی کوشش نہ کرے، ظفر جانتا تھا کہ انسان کو اسی دنیا مین زندگی بسر کرنا ہے، وہ اپنے لیے کوئی نیا عالم اور نیا آسمان پیدا نہین کر سکتا ہے، مگر ہان اس کے لیے خوشگوار راہین کھلی ہوئی ہین، جن پر چل کر وہ اس دنیا مین مسرت و راحت کی زندگی گذار سکتا ہے، وہ کونسا راستہ ہے ملاحظہ ہو :-

انسانہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

نخوت، پندار، تکبر اور غرور کی راہ میں صرف تباہیاں اور بربادیاں ہیں، اس لیے

کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ — مانند جوش غم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوز دل کے ساتھ — اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل

اس دنیا میں قدم قدم پر مکر و فریب کا جال ہے، ہوش و خرد کا تقاضا ہے کہ انسان ان سے دامن بچا کر زندگی کی مشکل راہوں کو طے کرے،

یہ غول وحشیں ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما — سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل

مگر اس کے باوجود انسان کی زندگی کی منزلیں اسی وقت طے ہو سکتی ہیں جب وہ خود اپنے پاؤں سے چلے، اور اس کو اپنے بازو کی قوت پر اعتماد ہو

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل — بل ہے تو بل کے بل پہ تو اپنے ہی بل کے چل

اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں بصیرت کا نور چاہیے کہ اندھیری رات گم نہ کر سکے،

پھر آنکھیں بھی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم — کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل چل سنبھل کے چل

لیکن انسان کو اپنی تمام جدوجہد اور سعی و کوشش کے باوجود کارکنان قضا و قدر ہی کا بہرحال محتاج رہنا ہے،

انسان کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ — اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

ظفر زندگی کے مسائل کو یہیں پر ختم نہیں کر دینا چاہتا ہے، بلکہ اس نے ایک عالمگیر لطف و کرم کا پیام دیا ہے، جس کے ذریعہ سے اس کا خیال ہے کہ انسان نہ صرف اپنے کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ سے متصف کر سکتا ہے، بلکہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے، ایک الہامی شاعر ہی کہہ سکتا ہے،

گوشِ دل مین مرے آئی سحر آوازِ سروش — کہ کسی یار کے شکوے نہ کر کچھ تو خروش
گر کہین یار برا لطف سے تو ہو خاموش — یار عیار ہے تو پھر یار ہے اے صاحب ہوش
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

پھر لطف کی سحر آفرینیون پر یہ قمطراز ہے ۔

لطف سے وحشیِ صحرا ہی نہین تنہا رام — لطف سی ماہی و مرغ آئے تہ حلقۂ دام
لطف سی بنتے ہین انسان ہی فقط کیا خدام — لطف سی ہوے پرستار پری، دیو غلام
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

لطف سی کن سے ہوے کھتے ہی دونون عالم — لطف سی روح ہوئی داخلِ جسم آدم
لطف سے گرچہ ہو معشوق بھی عشق کا دم — لطف سے غیر بنے بندۂ بے دام و درم
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

آگے چل کر جو شاعرانہ انداز سے گل افشانیان کی ہین ان مین دقتِ نظر کے ساتھ زورِ بیان بھی ملاحظہ ہو :-

حلقۂ موج ہوا قوسِ قزح قوس ہلال — گردش چرخ برین گردش مہ، گردش سال
گردش ساغرِ مے، گردش فانوس خیال — سب تجھے کہتے ہین یہ حلقہ بگوشون کی مثال
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اسی طرح بعض جستہ جستہ ناصحانہ خیالات دیوان مین بہت کچھ ملین گے مثلاً

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یادِ خدا نہ رہی جسے طیش مین خوفِ خدا نہ رہا

عقل پر ناز ہے قدرت پہ نظر کسکو ہے — سب کو فکر آج کی ہی کل کی خبر کسکو ہے

فنا ہے ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل — فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل
جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر — کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل
خاک کا پتلا ہے انسان اے ظفر اس کیلئے — سرکشی اچھی نہیں ہے خاکساری کیلئے
جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے — اس کی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے
دنیا کا ہے مزا ظفر انجام کار زہر — میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں
اے ظفر چاہیے بندے کو گنہ سے پرہیز — ورنہ کچھ شک نہیں غفار کی غفاری میں
گلشن دنیا نہیں جائے قیام اے غافلو — غنچہ ساں تم دوش پر رخت سفر باندھے رہو
جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہو گا آخر کو وہی — اے ظفر کیا شکوہ اسکا یوں ہوا یا یوں ہوا
برے ہیں یا بھلے ہم تم ظفر لیکن غنیمت ہیں — کہ یاں آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے
دنیا سے جس نے کھینچ لیا ہاتھ اے ظفر — پھیلائے پاؤں کیوں نہ ہو کنج فراغ میں
آدمی کو چاہیے آدم شناسی اے ظفر — ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا
منعم اس دولت دنیا پہ نہ کر دیکھ غرور — سیکڑوں گور میں کیا کیا نہیں بہرام بنے

ظفر کی صوفیانہ شاعری | یہی ناصحانہ خیالات آگے چل کر صوفیانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے ہیں، حوادث زمانہ اور واردات زندگی نے ظفر کے دل میں اپنے مالک حقیقی کی لگن ایسی پیدا کر دی تھی کہ آخر میں وہ بادشاہ وقت ہونے کے بجائے ایک صوفی منش فقیر ہو گیا تھا، اس کی زندگی صبر، توکل، اور استغنا کی داستان ہے، طبیعت میں فقر و درویشی کا خمیر موجود تھا، ہجوم و مصائب نے اس کو اور تیز کر دیا، عہد طفلی ہی میں مولانا فخر الدین سے شرف بیعت حاصل کیا، چنانچہ خود کہتا ہے :-

مرشد پاک روان فخر الدین — قبلہ و کعبہ جان فخر الدین
اک جہان فخر جہان کہتا ہے — پر ہے فخر جہان فخر الدین

مین گدا ہون ترے دروازے کا | جاؤن اس در سے کہان فخرالدین
موجزن ہے ترا دریائے کرم | از کران تا بہ کران فخرالدین
ہے مدد تیری توانائی بخش | مین ہون بیتاب و توان فخرالدین
کیا کرون عرض عیان ہے تم پر | میرا سب راز نہان فخرالدین
رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت | شغل دل ورد زبان فخرالدین

ایک جگہ اور کہتا ہے،

کیا خطر اس کو رہ دین مین ظفر | رہنما جس کا فخر دین ہو جائے

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے[1]

اے ظفر مین کیا بتاؤن تجھسے جو کچھ ہون سو ہون | لیکن اپنے فخر دین کے کفش برداروں مین ہون

ظفر کو اس خاندان سے کچھ ایسی شیفتگی تھی، کہ مولانا فخرالدینؒ کے انتقال کے بعد ان کے

[1] اس عقیدت کا اظہار اپنے دیوان مین متعدد بار کیا ہے، مثلاً

خاک پائے فخر دین ہے اپنے حق مین کیمیا | اے ظفر کیون خواہش اکسیر کرنی چاہیے
کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت مین | اے فخر جہان سب وہ تیری ہی عنایت ہے
جو خاک بھی ہون تو ہون فخر دین کے در کی | ظفر چھوڑا ئے نہ مجھ سے اس آستان کو چرخ
اللہ اللہ جلوۂ حسن و جمال فخر دین | ہے اسی پر اے ظفر گرویدۂ دل گرویدۂ آنکھ
مدد اے فخر جہان تا ہو ن ظفر کے دل مین | سب ملال آپ کے الطاف و عنایات سے رفع
ظفر دشوار ہے ہر چند اہل معرفت ہونا | مگر صدقے مین فخرالدین کے ہان ہو سکتا ہے کچھ عجب
جس کا ہے سرمہ ظفر خاک در فخرالدین | چشم بد دور وہی، اور وہی تاثیر کی آنکھ
کوچۂ فخر جہان کی اے ظفر | خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے،

صاحبزادے مولانا قطب الدینؒ سے بیعت لی۔ خود رقمطراز ہے:-

مرید قطب دین ہون خاکپائے فخر دین ہون مین
گرچہ شاہ ہون ان کا غلام کمترین ہون مین

انہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم مین
وگرنہ یون تو بالکل روسیہ مثل نگین ہون مین

نہ کعبہ سے غرض مجھ کو نہ میخانہ سے کچھ مطلب
ہمیشہ گھستا ان کے آستانے پہ جبین ہون مین

رہون مین زندمیکش پر رہون انکی محبت مین
نہین خواہش مجھے یہ صوفی خلوت نشین ہون مین

مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونون برابر ہین
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہون کہین ہون مین

یہی عقدہ کشا میرے یہی ہین رہنما میرے
سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دین ہون مین

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم مین
ولیکن اے ظفر انکا گدائے رہ نشین ہون مین

اور جب مولانا قطب الدین کا وصال ہوا تو ان کے صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی جوش عقیدت اور قلبی تعلق قائم رکھا، حالانکہ موخر الذکر اپنے والد کے انتقال کے وقت محض خورد سال تھے۔ ظفر نے ان کی طرف سے اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

نظام خانہ فخر جہان تمہین تو ہو
قیام سلسلہ و خاندان تمہین تو ہو

نہ کیونکر تم سے ہون ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تمھین ان کا نشان تمہین تو ہو

تمہارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق
کہے ہے کعبہ امن و امان تمہین تو ہو

نثار تم پہ ہین پروانہ سان ہزارون دل
کہ شمع محفل صاحبدلان تمہین تو ہو

تمہاری قوت باطن سے تقویت ہی مجھے
کہ میرے باعث تاب و توان تمہین تو ہو

بغیر آپ کے ہون کیون نہ جان و دل بیچین
کہ راحت دل و آرام جان تمہین تو ہو

ظفر کی چاہیے نصرت تمہین نصیر الدین
کہ اس کے یار و مددگار تمہین تو ہو

ظفر کو نہ صرف اپنے مرشدون سے یہ ارادت و عقیدت تھی، بلکہ با کمال صوفیائے کرام سے

بھی یہی عقیدتمندانہ غلو تھا، حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک مخمس لکھکر کہتا ہے:-

تم ہو جناب خواجہ معین اسیر و رازِ حق پرست
تم ہو رمز آگاہ کن او رواقف سرّ الست

تم مددگار ظفر ہو کیون ظفر کو ہو شکست
پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہین ہاتھ دست

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

اسی مخمس مین آگے چل کر لکھتا ہے:-

خاک پر سے جو کہ ہل سکتا نہ ہو جون نقش پا
تم اٹھاؤ تو وہین ہو وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا

عیسی جان بخش ہو تم اور خضر رہنما
دردمندون کی دوا ہو نا توانون کے عصا

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

ظفر نے خود اپنے ہاتھون پر بھی بیعت لینی شروع کی تھی، قلعہ معلیٰ کے لوگ، پھر سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی اس کے حلقہ بگوش تھے، آگے چل کر تصوف کی چاشنی اسقدر بڑھ گئی تھی کہ سعدی کی گلستان کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال واذکار مین ایک کتاب سراج المعرفت نام مفتی میر لال سے لکھوائی،[۱]

ظفر کی صوفیانہ طبیعت کے اثرات اس کی شاعری سے بھی ظاہر ہین، لیکن وہ تصوف کا کوئی فلسفی نہین، اس لیے خیالات اور مسائل کے اظہار مین نہ وہ نکتہ آرائی اور جدت طرازی کرتا ہے، اور نہ غالب کی طرح تصوف کے عقدہائے سربستہ کی تحلیل اور تشریح مین دقیق اور غیر الفہم الفاظ استعمال کر کے خیالات کو ادق اور مشکل بناتا ہے، بلکہ اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو

[۱] یہ معلومات امیر احمد علوی صاحب بی اے کی کتاب بہادر شاہ ظفر سے لی گئی ہین، بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تصنیف موسومہ بہ "لغت و اصطلاح دکن" تین جلدون مین ہے لیکن یہ مفقود ہے، اس کا اشارہ شرح گلستان سعدی کے دیباچہ مین ہے، شرح گلستان ۱۲۵۹ھ مین مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوئی تھی،

سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتا ہے جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بے اختیارانہ طور پر اس کے اثرات خود بخود دل پر قائم ہوتے جاتے ہیں، اسکی شاعری مادی خیالات سے ملوث ضرور ہے عشق مجازی کی تمام کیفیتیں بھی اس پر طاری ہیں لیکن اس عشق مجازی کی شراب سے اس میں عشق حقیقی کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر اس نشہ کی سرمستی، بیخودی اور خود فراموشی اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے کہ شعر کہتے کہتے خود اس میں گم ہو جاتا ہے، اور بیخود ہو کر کہتا ہے،

مئے وحدت کی ہم کو مستی ہے بت پرستی خدا پرستی ہے،

اس "مئے وحدت" کے خمار میں اس کو عالم ناسوت کی تمام چیزیں عالم لاہوت میں نظر آتی ہیں، اور ایک وجدانی کیفیت میں تصور کرتا ہے کہ

شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے خورشید وہی نور سحرگاہ وہی ہے
حور و ملک و دیو پری انس و جن جان سب صورتوں میں ماہی دلخواہ وہی ہے
یوسف ہو وہی، وہی زلیخا وہی یعقوب کنعان ہے وہی مصر وہی چاہ وہی ہے
رہرو وہی رہبر وہی وہی رہ مقصود گمراہ وہی راہ سے آگاہ وہی ہے
کیا حسن میں کیا عشق میں سب میں ہو وہی نور یہ موجب غمزہ، سبب آہ وہی ہے
مجنون خراباتی و دیوانہ و ہشیار درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہے
خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں و زنگ واللہ وہی سب میں ہو باللہ وہی ہے

اسی کو اپنی ایک فارسی غزل میں کہتا ہے۔

اینکہ ہیچ ہمہ ہا قالب و جان ہمہ اوست بلکہ ہم قالب و ہم روح روان ہمہ اوست
آنچہ بیرون و درون ست ہما نست ہمان راز فاش ہمہ او ست ہم نہان ہمہ اوست

در پسِ پردہ و بے پردہ درآید از دل — بے نشان و سبب نام و نشان ہمہ اوست
نیست دیر و حرم از شیخ و برہمن آباد — ہمہ جہان و مکینِ مکان ہمہ اوست
اے دل آن گوہر یکتا کہ نیرزد دیدو کون — چشم بکشا و ببین زیب دکان ہمہ اوست
شعلۂ نار جحیم و گل گلزار نعیم — یک تجلی است کہ در جلوۂ شان ہمہ اوست
می زند اے ظفر امروز بباغ توحید — ہمچو بلبل دل شوریدہ فغان ہمہ اوست

یہ شاید استاد غالب کے اس سوال کا جواب ہے کہ

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

لیکن اس حقیقت مستورہ کا احساس ہوا تو اس کا مشاہدہ بھی ضروری ہے، تصوف کی راہ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب کہ طالب حقیقت وادی تحیر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (غالب)

اور پھر وہ ایسا حیرت زدہ ہو جاتا ہے، کہ ساری حقیقتیں سامنے ہوتی ہیں، لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا ہے:

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگان اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے (غالب)

ظفر پر بھی ایسی کیفیت طاری ضرور ہوتی ہے، وہ کہتا ہے:

میں ہوش میں ہوں یا رب یا کہ مجھے وحشت ہے — کہ جوش ہنسی کا ہے، کہ گریہ کی شدت ہے
مجذوب ہوں یا سالک غافل ہوں کہ دیوانہ — کیا جانئے میں کیا ہوں اور کیا میری حالت ہے

پھر کہتا ہے:-

دکھاتا یار ہے ہر رنگ مین جلوہ ہمین لیکن　　　کہان سے لائین وہ آنکھین جن آنکھون سے ہم دیکھین

مگر وہ مشاہدۂ جمال سے محروم نہین ہوتا ہے، بلکہ حسن عالم افروز اور جمال جہان آرا کو دیکھتا ہے،

گر شعلہ مین گرمی ہے تو گل مین نزاکت ہے　　　ہر شے مین نظر آتی اللہ کی قدرت ہے،

جلوہ تجھے وہ اپنا ہر شے مین دکھاتا ہے　　　پردہ تری آنکھون کا پر تیری ہی غفلت ہے

اور جب وہ دیکھ چکتا ہے تو بے خود اور سرمست ہو کر نعرہ زن ہوتا ہے،

ترا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہین　　　جہان دیکھتے ہین جدھر دیکھتے ہین

کرین کیونکر دل کی نہ ہم پاسداری　　　کہ ہر دل مین ہم تیرا گھر دیکھتے ہین

طالب حقیقت جب مطلوب کے دیدار سے شرف اندوز ہوتا ہے، تو اس موقع کی لذت کی کیفیت جو ظفر نے بیان کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر مین نور جمال تھا　　　کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ خواب تھا کہ خیال تھا

کہو اس تصور یار کو کہون کیون نہ خضر خجستہ پے　　　کہ یہی تو دشت فراق مین مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل مین تھا کہ کہون گا مین جو پیام رنج و ملال ہے　　　وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہجر بے وفا وہ ہے جفا وہان لطف کیسا وفا کہان　　　فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پس ازین ڈسن کے تری صدا ترا شوق دید جو بڑھ گیا　　　مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے حیف کہ جو بت کی تو یہ جا ہمینہ کدا تھی　　　فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

ظفر اس قرب و وصال کو اہل تصوف کی طرح ایک راز ضرور سمجھتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ راز ایسا نہین جو صرف مجدد و طبقہ ہی کو معلوم ہو سکے، خودی کو مٹا کر جس کسی نے دیدۂ بینا، اور دل اصفا، اور پھر سرگرمی جستجو اور جوش جنون پیدا کر لیا، تو پھر کوئی وجہ نہین کہ اس کا دل حقیقت آشنا نہ ہو، کتنے سادے الفاظ مین اس نے حقیقت کے راز کو ہمارے سامنے کھول کر رکھدیا ہے،

جو عرش سے ہے فلک تلک سب کچھ اسی مین ہے — دیکھ آنکھ کھول کر
کیا کیا نہین ہے اس مین کہ سب کچھ اسی مین ہے — پر چاہیے نظر
دل اپنا پہلے زنگ کدورت سے صاف کر — مانند آئینہ
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی مین ہے — کیا حسن جلوہ گر
پیدا نگاہ کر کہ تجلی حسن یار — سب جا ہے آشکار
شعلہ سے طور کے نہین کم روشنی مین ہے — ہر سنگ کا شرر
کیون کعبہ و کنشت مین سرمارتا ہے تو — سرگرم جستجو
تو جس کو ڈھونڈھتا ہے چھپا وہ تجھی مین ہے — پر تو ہے بیخبر
جوش بہار حسن سے کس گل کے اے صبا — ہے یہ جنون کا جوش
مصروف اس قدر جو گریبان دری مین ہے — ہر غنچہ ہر سحر
ہے دور جام و صحبت یاران زندہ دل — کیفیت حباب
کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی مین ہے — باقی ہے دردسر
اے خود پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ — ہے وہ بہت قریب
گم کردہ راہ آپ تو اپنی خودی مین ہے — اس سے ہے دور تر
صد داغ سوز عشق سے کھا بلکہ صد ہزار — ہر داغ دل پہ تو
لذت تجھے نصیب اگر عاشقی مین ہے — اے سوختہ جگر
افشاے راز عشق نہ کر کھلکے جی کی بات — پردہ ہی خوب ہے
جی ہی مین اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی مین ہے — خاموش اے ظفر

ظفر کا خیال ہے کہ حقیقت مستور نہین، ہم اس کو دیکھتے نہین، محض اس لیے کہ ہماری

آنکھوں پر خودی اور نفس کا پردہ پڑا ہے، اگر یہ پردہ ہٹ جائے تو تمام رموز سربستہ اور اسرار پوشیدہ ظاہر ہو جائیں، اور دل انوار الٰہی کا مظہر بن جائے، پھر ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی تفاوت باقی نہ رہے، اسی کو واضح کر کے کہتا ہے ؎

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

ایک جگہ اور کہتا ہے،

اگر ہے دیکھنا اس کو اٹھا دے اپنی ہستی کو — اگر تجھ میں اور اس میں پردہ حائل ہے تو بس یہ ہے

پھر کہتا ہے:-

ہر جائے ہے قدرت تماشا مرے آگے — لیکن مری غفلت کا ہے پردہ مرے آگے

اب اس کے لیے ظفر کے یہاں عرفی کی طرح "شعار ملت اسلامیان" چھوڑنے[1] اور نہ غالب کی طرح رسوم و قیود کے ترک کرنے[2]، اور نہ عام صوفیوں کی طرح حال و قال اور مقام و قیام پہ پابند ہونے کی ضرورت ہے، ظفر کے نزدیک تصوف کی راہیں پیچ در پیچ نہیں۔

راہیں ہیں دو مجاز و حقیقت ہی جنکا نام — رستے نہیں ہیں عشق کی منزل کے چار پانچ

چنانچہ اسکے یہاں انوار معرفت حاصل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ

پردہ دوئی کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو — دیکھے جدھر نگہ وہی پیش نگاہ ہے

---

[1] عرفی نے کہا ہے:-

شعار ملت اسلامیان بگذار اگر خواہی — کہ در دیر مغان آئی و اسرار نہان بینی

[2] مرزا غالب کہتے ہیں:-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بیان کی سادگی — ظفر نے جس طرح خیالات کو آسان اور سادہ بنانے کی کوشش کی ہے، اسی طرح اپنی شاعری میں زبان بھی نہایت ہی آسان اختیار کی ہے، اس کا پورا دیوان پڑھ جائیے مشکل سے کوئی غزل ایسی نظر آئے گی جس میں فارسی کی مغلق ترکیبیں اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہوں گے، اسی لیے بعض ہمعصر شعرا کی طرح اس کی غزلوں میں بہت کم بیان اور معنی کا الجھاؤ پیدا ہوتے پایا ہے، بعض غزلیں تو سلاست اور روانی کا نمونہ ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں کہ اگر ان کی نثر بنانا چاہیں تو لفظوں کو آگے پیچھے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں — کس طرح سے صفائی ہوتی ہے
عاشق! زیر تیغ سر دھر دو — ابھی مشکل کشائی ہوتی ہے

آشنا ہو تو آشنا سمجھے — ہو جو ناآشنا تو کیا سمجھے
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں — آپ کو جو کوئی برا سمجھے
تو ہی کعبہ میں تو ہی بتکدہ میں — ہے وہ مشرک جو دوسرا سمجھے
اے ظفر وہ کبھی نہ ہو گمراہ — جو محبت کو رہنما سمجھے

میں ہوں عاصی کہ پر خطا کچھ ہوں — تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں
جز و کل کو نہیں سمجھتا میں — دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں

صنما ہم کہیں تو کیا کہویں — بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں
مدعی کہنے ہی نہیں دیتے — مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں

مثل فوارہ سر بلند نہ کر — کہ بلندی کے ساتھ پستی ہے
رنج و غم کو خدا رکھے آباد — خانۂ دل میں ایسی بستی ہے

وہ بیت جمال اور ہی ہے — اس میں دیکھا کمال اور ہی ہے

ترا ابرو کہاں ہلال کہاں — مہ جبین پہ ہلال ورہی ہے

سہل ممتنع کی مثال ملاحظہ ہو:۔

دو دل اپنا صنم — کیوں نہ ہم تجھ سے کہیں
چپ رہا جاتا نہیں — کب تلک چپکے رہین
پھر رہا ہے دل مرا — کیون نہ پھر آنسو بہین
چشم و دل دونوں بہے — ہم بھلا کس کو کہین
یہ ترے جور و ستم — یار ہم کب تک سہین
اس غزل پر سب ظفر — آفرین تجھکو کہین

ظفر کی شاعری کا بڑا حصہ اسی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، ہر جگہ طرز بیان صاف، سادہ اور سہل ہے، بھاری اور گران لفظ بہت ہی کم ہین، ظفر نے اس قسم کا طرز جانکر اختیار کیا، خود کہہ گیا ہے،

اے ظفر چاہیے ہان لطف سخن مین ایسا — کہ جسے سن کے ہون سب عالم و جاہل محظوظ

چنانچہ بعض اوقات یہ سادگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی شاعری روزمرہ کی گفتگو معلوم ہونے لگتی ہے، مثلاً:

مر گیا بیمار اس کے نرگس بیمار کا — دوستو اچھا ہوا اچھا ہوا اچھا ہوا
خبر تجھے ہے کیا ہوا بگڑی کہین اس یار سے — آج کیون تو اے ظفر پھرتا ہے گھبرایا ہوا

ساتھ میرے چلے چلو چپ چپ — راہ مین تم نہ کچھ کہو چپ چپ
گھر مین چل کر شکایتین کرنا — یان نہ مجھ سے گلہ کرو چپ چپ
میرے جاتے ہی ان کی غیرون سے — پھر لگی ہونے گفتگو چپ چپ
ابھی صیاد کی لگی ہے آنکھ — نہ کرو شور بلبلو چپ چپ

دل کسی غنچہ لب کو تم نے دیا — اے ظفر تم جو رہتے ہو چپ چپ

جس کو سناؤں درد دل آئے نہ اسکو تاب — سنتے ہی یہ کہے کہ بس اے دردمند بس
اتنی زبان دراز نہ ہو یان بھی ہے زبان — بس آگئے سمجھیے زبان اپنی بند بس

میری نگاہ ہے وہ غضب دیکھکر جسے — خنجر تو الحفیظ کہے الامان تیغ
ہوں وہ مثل زلف برہم اور جن — ان کی زلفوں کی بلائیں لوں جو خوش

آؤ گھر میرے اے صنم آؤ — تمہیں اللہ کی قسم آؤ
قاصد لاؤ جلد خط کا جواب — ایک دم جاؤ ایک دم آؤ
اے بتو میرے خانۂ دل کو — دیر تم سمجھو یا حرم آؤ

میری گریہ سے ہے اگر منظور — سیر آب رواں ادھر آؤ
اتنی تاثیر ہے کہاں کہ جو تم — سن کے میری فغاں ادھر آؤ
آگئی میری جان ہونٹوں پہ — اب تو اے میری جان ادھر آؤ

جاؤ تنہا نہ تم تمہارے ساتھ — جائے گی میری جان کھڑے تو رہو
ہے پڑی دل جلوں کی آہ جہاں — تاب کیا تم وہاں کھڑے تو رہو
قد پہ نازاں ہے اپنے سرو چمن — اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو رہو

شکایت کس سے کی میں نے بلا لو سامنے اسکو — کروں گا شکوہ میں تیرا معاذ اللہ معاذ اللہ
قد جاناں کو دوں تشبیہ کیونکر نخل طوبیٰ سے — کہاں وہ قد کہاں طوبیٰ معاذ اللہ معاذ اللہ

جو کہ عاشق کو جلائے جوں شمع — وہ بھی جلتا رہے آمین اللہ
اپنے مرنے کی دعا مانگوں — وہ ستمگر کہے آمین اللہ
جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفر — عوض اس کا لے آمین اللہ

محبت کے یہ معنی ہیں کہ ہیں نے　　وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے جو پوچھو لذتِ عشق　　اہاہا اہاہا اہا ہا اہا ہا

اس بے تکلفی طرزِ بیان اور اندازِ گفتگو کو سن کر اگر اہلِ سخن ظفر ہی کی زبان سے یہ کہیں کہ ان ؏

اشعار کے تصدق اس گفتگو کے صدقے

تو شاید حق بجانب ہوں گے،

محاورات　اس سادگی کے باوجود ظفر کو زبان پر اتنی قدرت ہے کہ بادشاہ سخن ہیں کہ زبان اور الفاظ پر فرمانروائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلعہ معلی بلکہ اردو زبان کا کوئی محاورہ ایسا نہیں جو اس کے دیوان میں موجود نہ ہو، اور ان محاورات کو اس خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں باندھ جاتا ہے کہ اشعار کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا، مثلاً چرانا ہے۔ اب اس مصدر سے جو ممکن اور مروج محاورے تھے، ان سب کو ظفر نے اپنی ایک غزل میں استعمال کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

محبت کی کوئی اب آنکھ تجھ سے ہم چراتے ہیں　　علم ہوں گر پہ سو شمشیر کیں کب دم چراتے ہیں

نہیں شمشیر سے بچتی جو آنکھ میدان میں　　نظر وہ دیکھ تیرا اٹھنے پہ چشم چراتے ہیں

تو اک کون کب تک اشکوں کو اور کون تو دیدہ　　کہ پانی زخمِ دل لے دیدۂ پرنم چراتے ہیں

طفلِ اشک ہیں وہ جو باندھے چور مژگاں ہے　　کہ آنکھوں میں سے کاجل دیکھ تو پیہم چراتے ہیں

ظفر سر عشق کو سر باز دیتے ہیں محبت میں　　وگرنہ جان اپنی یاں بڑے رستم چراتے ہیں

پس مثلاً چرانا سے، دم چرانا، چشم چرانا، ستم چرانا، قدم چرانا، تو بہ چرانا، نشتر چشم چرانا، نقش سرکش کو چرانا، ان سب محاوروں کو ظفر نے جس طرح استعمال کیا ہے، ان کو بھی دیکھئے،

زیرِ خنجر ترے بسمل جو یہ دم توڑتے ہین
کوچۂ غم مین پھر آنے کی قسم توڑتے ہین

دل مرا ایسے کہ جو وہ سنگِ ستم توڑتے ہین
کیا ستم کرتے ہین کیون ساغرِ جم توڑتے ہین

ہر قدم پہ ترے دیوانے سرِ دشتِ جنون
سیکڑون خار سدا زیرِ قدم توڑتے ہین

ابرِ مژگان سے بندھی ہنستی ہے اشکون کی جھڑی
تار رونے کا نہین دیدۂ نم توڑتے ہین

جام مل دیتے ہین تو کرتا تامل ساقی
تو یہ ہم آج ترے سر کی قسم توڑتے ہین

ہین ہمین سجۂ و زنار برابر دو نون
نہ ہم یہ جوڑتے ہین اور نہ یہ ہم توڑتے ہین

آتے ہین پھر سر کاوش کبھی حضرتِ عشق
سیکڑون دل مین مرے نشترِ غم توڑتے ہین

نفسِ سرکش کو ظفر توڑتے ہین جو اپنے
میرے نزدیک بڑا ہی وہ صنم توڑتے ہین

اسی طرح اڑ جانا سے خبر اڑ جانا، رونق اڑ جانا، نیند اڑ جانا، رنگ اڑ جانا، تاب اڑ جانا، مے اڑ جانا وغیرہ محاورے مستعمل ہوتے ہین، ان کو بھی ظفر نے اپنے اشعار کی لڑیون مین پرو دیا ہے،

جب چمن مین اسکے آنیکی خبر اڑ جائیگی
گل کی رنگت دم مین لے باد سحر اڑ جائیگی

آپ کا کیا جائیگا گر خواب مین آؤ گے تم
نیند آنکھون سے ہماری رات بھر اڑ جائیگی

خون کو ل لیگا میرے تو کفِ پاسے تر
سرخیِ رنگِ حنا اے فتنہ گر اڑ جائیگی

آئیگا وہ مہروش لے دل تو شبنم کی طرح
تاب و طاقت تیری اسکو دیکھکر اڑ جائیگی

یہ صبا ست کوئی پوچھے تیرے کیا آئیگا ہاتھ
خاک میری اس کے کوچے سے اگر اڑ جائیگی

شعلۂ رخسار ساقی گر ہوا پر تو فگن
مے جو ہے ساغر مین تیرے اے ظفر اڑ جائیگی

بلا ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، زنجیر ڈال دینا، شمشیر ڈال دینا، قلم ڈال دینا، دریا مین ڈال دینا، جدائی ڈال دینا، آگ ڈال دینا، تاثیر ڈال دینا جیسے محاورات پہ ظفر کی طبع آزمائی سنئیے۔

دل پر بلائے زلفِ گرہ گیر ڈالدی — تو نے مصیبت اے مری تقدیر ڈالدی

جب روبرو وہ آئے تو پائے نگاہ میں — موجِ سرشکِ چشم نے زنجیر ڈالدی

اپنی بھویں بنا کے دکھائیں جو یار نے — شمشیر گر نے ہاتھ سے شمشیر ڈالدی

لکھا جو ہم نے اپنی سرافگندگی کا حال — گردن قلم نے بھی دمِ تحریر ڈالدی

جب ہم سمجھ گئے کہ ہے تقدیر کیمیا — دریا میں ہم نے جیسی تھی اکسیر ڈالدی

چوں مہر و مہ ہم ہوئے دربار گرد ورنہ — تو نے جدائی اے فلکِ پیر ڈالدی

کیا خاک دل مرا ہو خالی کہ اور بھی — تو نے نہ آگ نالۂ شب گیر ڈالدی

مانی دکھا کے اپنا مرقع خجل ہوا — جب اس کے سامنے تری تصویر ڈالدی

کیونکر نہ ہو اثر دلِ عالم میں اے ظفر — تیرے سخن میں عشق نے تاثیر ڈالدی

کھینچنا کے مختلف محاورات بھی سن لیجیے :-

جو خنجرِ گل نے عندلیب زار پہ کھینچا — تو قمری کو بھی ہے سرو چمن نے دار پہ کھینچا

کھڑا ہوں محو حیرت یوں لگا دیوار سے تیرے — کسی نے نقش ہو جیسے کوئی دیوار پہ کھینچا

وفا کا کر کے تو اقرار ہم سے ہو گیا منکر — تری الفت سے ہم نے ہاتھ اس انکار پہ کھینچا

جلا دیگا جہان کو دیکھ لینا یہ دلِ سوزاں — جو نالہ اس نے اور اک آہ آتشبار پہ کھینچا

خطِ رخسار کو تیرے جو دکھلائے گلستاں پر — قلم سب خوشنویسوں نے خطِ گلزار پہ کھینچا

ہوئی کچھ تو دلِ بسمل کی اپنی صورت تسکین — تری تصویر کو جب سینۂ افگار پہ کھینچا

دل زخمی سے اپنے ناوکِ دلدوز کو اسکے — اگرچہ کھینچنا تھا اے ظفر دشوار پہ کھینچا

ظفر کے دیوان میں محاورہ بندی کی سیکڑوں مثالیں ملیں گی، ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے، لیکن انہی سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ظفر کو زبان پر کتنی قدرت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے کو الفاظ کا تابع نہین بناتا ہے، بلکہ الفاظ کو اپنا تابع بناتا ہے، اسی لیے وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے، اور اسی تفریح اور کھیل مین زبان اور بیان مین ایک خاص لطف اور چاشنی پیدا کر دیتا ہے،

صنائع لفظی | اس کا کلام لفظی صناعی سے جو متاخرین کے کلام کا زیور ہے خالی نہین، پہلے مصرع کے لفظون کو الٹ پلٹ کر دیکھئے کیسے دوسرا مصرع بنا لیتا ہے،

یہی ایک غم ہے، یہی اک الم ہے　　یہی اک الم ہے یہی ایک غم ہے
مری چشم نم ہے اسی رنج و غم مین　　اسی رنج و غم مین مری چشم نم ہے
خدا کی قسم ہے یہ کہتا ہون سچ مین　　یہ کہتا ہون سچ مین خدا کی قسم ہے
کیا کیا رقم ہے، کوئی شکوہ مین نے　　کوئی شکوہ مین نے کیا کیا رقم ہے
ظفر کیا ستم ہے ہوا دوست دشمن　　ہوا دوست دشمن ظفر کیا ستم ہے

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی　　تو لا شراب ساقی آیا سحاب ساقی
ہے پیچ و تاب ساقی زلفون سے تیرے دل کو　　زلفون سے تیرے دل کو ہے پیچ و تاب ساقی
کیا مست خواب ساقی آنکھین ہین آج تیری　　آنکھین ہین آج تیری کیا مست خواب ساقی
مے آفتاب ساقی ہے ہم خنک دلون کو　　ہے ہم خنک دلون کو مے آفتاب ساقی
مست کر خراب ساقی تو بزم میکشان کو　　تو بزم میکشان کو مست کر خراب ساقی
جام حباب ساقی دریا مین کس نے الٹا　　دریا مین کس نے الٹا جام حباب ساقی
ہے یہ عذاب ساقی تو ہے ظفر سے بدتر　　تو ہے ظفر سے بدتر ہے یہ عذاب ساقی

بدیع کی اصطلاح مین اس کو "عکس" کہتے ہین، یہ صنعت اردو کے کسی اور شاعر کے یہان میری نظر سے نہین گذری، البتہ قدیم فارسی شعراء کے یہان ملتی ہے، اس کے علاوہ دوسری لفظی صنعتین

بھی ظفر کی شاعری میں پائی جاتی ہیں، مثلاً

۱۔ تنسیق الصفات یعنی کسی موصوف کی پے درپے صفتوں کا لانا، جیسے

شوخ چشمے خوش نگاہے بیوفاے بدگمانے ۔۔۔ دلفریبے دلنوازے دلربائے دلستانے
مست نازے فتنہ سازے تند خوے جنگجوے ۔۔۔ ظلم کیشے ظلم کوشے ظلم خواہے ظلم رانے
کج کلاہے کج ادائے پرفریبے پردغائے ۔۔۔ بدطریقے بدشعارے بدمزاجے بدزبانے
خوش نگاہے خوبروئے بذلہ سنجے نغز گوئے ۔۔۔ ہوشیارے حرف گیرے نکتہ طبعے نکتہ دانے
خود پرستے خودنمائے خودپسندے خودستائے ۔۔۔ خودسرے ناآشنائے سرکشے نامہربانے
ہم ظفر ہیں اس پہ مفتون خواہ رسوا از جنون ۔۔۔ وہ یہ مانے یا نہ مانے وہ یہ جانے یا نہ جانے

۲۔ لزوم مالایلزم یعنی قافیہ کے آخری حرف (روی) کے پہلے کسی خاص حرف کا التزام کرلینا جیسے

توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جام شراب ۔۔۔ مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے
جس طرح مژگاں سے میرے ہیں بندھے اشکوں کے تار ۔۔۔ اس طرح بدلی نہیں کوئی برستی خوب ہے
خواب میں جلوہ دکھا دیتا ہے وہ مہوش کبھے ۔۔۔ چشم میری دیکھنے کو جب ترستی خوب ہے
راہ بہتر ہے رہ ہموار رہرو کے لیے ۔۔۔ نہ بلندی ہو بہت اچھی نہ پستی خوب ہے
خودپرستی چھوڑ دو دیتا بہ پستی ہے صریح ۔۔۔ غافلو حق میں تمہارے حق پرستی خوب ہے

۳۔ سیاق الاعداد یعنی کلام میں اعداد کا لانا جیسے

چلنا مریض غم کو ترے آٹھ نو قدم ۔۔۔ معلوم ہوئے ضعف سے دس بیس سو قدم
پہلے تھا ایک ستم پھر ہوئے ایک سے دو ۔۔۔ دو کے پھر چار ہوئے ہوگئے اب چار کے چھ
چار یار آٹھ پہر میں ہیں وہ ان سے ملنے ۔۔۔ ان سے ملنے کی ہیں معلوم جنھیں گھاتیں چار
ناخن کریں ہیں زخموں کو دو دو ملا کے ایک ۔۔۔ تھے آٹھ دس سو ہو گئے اب چھل کے چار پانچ

پھپھولے دل پہ جو دس بیس داغ ہیں تو ہیں
تو قمقمے ہیں بہت اور چراغ ہیں دو تین

۴۔ تلمیع یعنی کلام میں ایک حصہ دوسری زبان کا لانا، جیسے

جلوۂ شبنم و گل پر ہے رلاتی مجھکو
دم گلگشت چمن یاد رخ پر عرقے

کچھ عوض دل کے تکرار سے دیتا ہو تو کیا
اسلے بر المے یا فستقے بر فستقے

رخ گلگوں پہ ترے اس گل کے نذشک کی تحریر
جلوۂ صبح بہاران و بہار شفقے

اے ظفر تم کو ہے منظور اگر رد حسود
تو پڑھا کیجیے قل اعوذ برب الفلقے

۵۔ حسن التکریر، اس کی مثالیں تو ظفر کے یہاں کثرت سے ہیں، ہم صرف چند اشعار پیش کریں گے،

مجھ میں اور گل اس میں باہم گفتگو تھی صاف صاف
بات کی لغزش نہ تھی واللہ جو تھی صاف صاف

نکہت گل لے گئی دل کو ہمارے باغ میں
تیری ہی سی لے سراپا ناز و بو تھی صاف صاف

شمع کی طرح سے ہم رات کو روتے روتے
بہ گئے آنسوؤں میں صبح کے ہوتے ہوتے

موت یاد آئی تو غفلت سے ہوئے یوں ہم ہشیار
ڈر کے جوں خواب میں چونکے کوئی سوتے سوتے

آگاہ تو کیا تجھے لذت سے عشق کی
زخموں میں اس نے میرے نمک کر بھرا بھرا

کیا بھر دیے ہیں کان خدا جانے غیر نے
غصے میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا

گہ یاس و گہ امید و گہے رنج و گہہ خوشی
مہمان سرائے دل میں ہیں مہمان عجب عجب

اے چشم یار بار نہ ہو دیکھ اشک بار
ہر بار تجھ سے اٹھتے ہیں طوفان عجب عجب

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہو کیا بہار
سب کا ہے رنگ جدا جدا سب کی ہے بو الگ الگ

تجھے دے سے چمن چمن کے گلہائے تازہ
مرا دیدۂ خون چکاں اچھے اچھے

گر آہ و نالہ دونوں پیدا ہوں ایک دل سے
لیکن الگ ہے تاثیر اپنی اپنی

خالی نہیں جہان میں تمنا سے کوئی دل
ہر ایک میں ہے گرچہ تمنا جدا جدا

ایک ہی تشبیہ کو طرح طرح سے ادا کرنا

ظفر کے یہاں ایک چیز اور ہے، جس سے اس کی قدرت کلام کا حال معلوم ہوتا ہے زلف اور سانپ کی تشبیہ معمولی چیز ہے، مگر دیکھیے کہ ظفر اس معمولی چیز میں اپنی جدت طبع سے کیسی کیسی ندرتیں پیدا کرتا ہے،

نہیں اس رخ پہ زلف اور نہ یہ زلف اس کی لٹ کا شانہ
چمن میں ناگ سا لڑتا ہوا ناگن سے نکلے ہیں

دیکھ کر آئینے میں وہ زلف کو ہنسنے لگے
ہے پانی میں پڑا طرفہ کہیں کا سانپ ہے

چاند پر دوڑتا ہے مار سیاہ شب تار
رخ روشن پہ ترے زلف کے بل کھانے سے

زلف یوں لیٹے عرق آلودہ پہ لہرا آئے ہے
جیسے جوں ناگن گلوں پہ چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یوں چہرے پہ ہلتی ہے ہوا سے اسکے
جس طرح مار سیہ کھائے ہے بیچ پانی کے بل

جس طرح مار سیہ گل سے لپٹ جاتا ہے
زلف یوں تیری گری ہے گل رخسار سے مل

چھوڑ شانہ اسکو لے دل عدو بنا کے تو نہ چھیڑ
مار سیہ سے کم نہیں ہرگز گرہ زلف

ناگنی زلف بتاں کی یہ عجب کافر ہے
کاٹے کی جیتی نہیں ہو سکے دوا و ظفر

کیا تماشا ہے تری زلف کا عکس آئینہ میں
سانپ کی طرح سے لہرئے ہے تالاب میں موج

نچوڑے زلف نہا کر جو وہ قطرہ آب
وہ لگی ہے مار سیہ کا لعاب ہے تمام

حلقہ سے ہلا زلف کا اسے پنجۂ شانہ
دیکھو کہیں انگلی نہ سیہ مار کے منہ میں

اڑ کر بھی زلف یار سے ناگن نہ بچ سکی
جس وقت اس کے منہ پہ پڑی مار کھا گئی

سو تماشا ہی ہیں ہوئے اس کی زلف دراز کو دیکھ کر
سانپ کی دیکھ کر ڈر کہیں سانپ بھی ہیں کو کھٹکا

نہیں اس یار کے رخ پہ عرق آلودہ زلف
اس کو چاٹا ہے سانپ نے پیاسا کالا

کیوں نہ سوتے میں چونک اٹھے ہے خواب میں ظفر
وہ مار زلف دیکھ کے تھا ڈرتے سے ہوا

دکھاتے کان کے بالے مین اسکو زلف اٹھا کر — نہ دیکھا جس نے ہو مار سیہ سے لڑتے بچھو کو
کہتا ہون دل کو زلف کی ناگن سے کر حذر — جاتی پلٹ ہے دیکھ یہ بدذات کاٹ کے
زلف آ گئی صبا سے وہ خال دہن کے پاس — مار سیاہ کھینچ ہے کیا اپنے من کے پاس
ناگن سی باغ مین کوئی لہرا رہی ہے یہ — یا زلف تیرے چہرہ پہ کھائے ہے بل پڑی
ہوا سے یون جو تیری زلف عنبرین الٹی — کسی کو ڈسے یہ ناگن نہ ہو کہین الٹی

یار کی زلف کو سنبل سے تشبیہ دینا عام بات ہے مگر دیکھئے کہ ظفر نے اسی ایک تشبیہ ذرا ذرا رنگ بدل کر کس کس طرح ادا کیا ہے،

مجھے آئے نہ رونا دیکھ کر کیون سنبل تر کو — کہ یاد آ جائے ہے اسکی زلف دل و یرانہ کو نہین
سنبل کی لہر سے نہ رہے پھر ہمین مطلب — یک دست جو تم کاکل خم دار دکھا دو
سنبل ہی کیا پریشان ہو دیکھ زلف تیری — موج نسیم کو بھی ہے پیچ و تاب ساقی
تا حشر نہ ہو خواہش نظارہ سنبل — تم ہم کو اگر زلف گرہ گیر دکھا دو
مرے مزار پہ روئیدہ کیون نہ ہو سنبل — کہ تیری زلف سے ہو دل کو پیچ و تاب ہنوز
تری زلف کے سامنے تاب کیا — کہ بل باغ مین شاخ سنبل کرے
سنبل چمن مین کیونکہ نہ ہو غرق آب شرم — منہ دھوکے وہ بال سنوارے علی الصباح
اگر ہو عکس افگن یار کی کاکل سمندر مین — تو پیدا جائے موج آب ہو سنبل سمندر مین
انھین ہے رشک سے اس زلف پرشکن کی عجب — کہ شاخ سنبل تر کھا کے پیچ و خم ٹوٹے
بیان کیونکر ہو اپنی پریشانی اس زلف پیچان کی — دے جب تک چل کے کچھ سیر سنبلستان کی
زلف اسکی پرشکن سے کیا بلا کرتی ہے بل — دیکھ کیا سیکھا ہے گلستان شاخ سنبل باغ مین
سنبل پیچان اسکے کیونکر نہ اسکی خاک سے — مر گیا جو دیکھ کر اس زلف عنبر بو کے بل

ہے نہ قربان ہی رخ قاتل خونریز پہ گل
کھاتی سنبل بھی ہے اس زلف دلاویز پہ گل

سنبل پہ گئی اوس ہی پڑ جب کہ دم غسل
پانی تری اس زلف گرہگیر سے ٹپکا

یار کے ابرو کو شمشیر سے تشبیہ ہر شاعر نے دی ہے، مگر دیکھیے کہ ظفر نے اس تلوار کے کیسے کیسے ہاتھ دکھائے ہیں،

جب ہو گئی وہ ابروئے خمدار سامنے
دی پھینک اپنے ہاتھ سے تلوار سامنے

کون ہمسر ہو سکے اس ابروئے خمدار سے
وصف تو اتنا تیغ میں ہے نے اس قدر خنجر میں ہے

کون منت کش شمشیر اجل ہو وقت قتل
طاق تیرا خم ابرو بھی ہے خونخواری میں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابروئے پرخم ایسے ہیں
ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو یہاں ہم ویسے ہیں

کس نے دکھایا خم ابرو کو سپاہی نے ہیں
چل رہی آج جو تلوار ہے سپاہی خانے میں

نہیں شمشیر سے جن کی کہ نگاہ پیکان ہیں
نظر وہ دیکھ تیرا ابروئے پرخم پھراتے ہیں

ہے طرفہ طلسم ابروئے دلدار میں تیرے جو ایک
اک قبضہ تلوار میں ہیں عربدہ گر دو

کیا لائے اس ابرو کی بھلا تاب دم تیغ
ہو جائے اسے دیکھتے ہی آب دم تیغ

جب جنبش ابرو سے تری قتل ہو عالم
پھر شرم سے ہو جائے نہ کیوں آب دم تیغ

جلاد دکھا اپنی تو شمشیر نہ مجھ کو
کشتہ ہوں میں ابرو کا جو ہے آب دم تیغ

تیغ ابرو سے ہیں جا بجا تا ظفر سینہ سپر
سینے اگل پڑتا نہیں وہاں سے تلوار کے خط

ابرو پہ اس کے چین کا عالم ظفر ہے اور
جوہر نہاں ہیں یہ کسی شمشیر میں غلط

ابرو کو اسکی کہتے ہیں سب تیغ اصفہان
ہے اصفہانیوں میں کمان اپنا قلم و تیغ

کہاں ہو دل میں گنجائش تری تیغ دو ابرو کی
میاں کب اک میاں میں دو بہم شمشیر ہوتی ہیں

جہان کو جنبش ابرو سے اس نے قتل کیا
الٰہی اسکی یہ شمشیر ال گئی تھی کیوں

جیسے ہو چین اس ابروئے پرخم پہ خوشنما   جوہر کہیں بھی ایسے نہ شمشیر پہ کھلے
ابرو ہلی جو اس کی عجب سیر ہوگئی   تلوار چلتے چلتے رہی سپر ہوگئی

معشوق کی مست آنکھوں کا نقشہ کس کس طرح کھینچتا ہے،

یاد چشم مست میں اس کی یہ کیفیت رہی   ہوش باطن میں رہا ظاہر مجھے غفلت رہی
ہم نہ کہتے تھے کہ نرگس کو دکھا مت چشم مست   نیند اس کی آنکھ سے اے مست خواب اڑ جائیگی
کر دیا اک نگاہ میں بے خود   چشم کافر ہے کیا خدا جانے
تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو   ہم بھی دانا تھے پر اب بنتے ہیں دیوانے
ہم کو اس دور میں ہو کیوں طلب ساغر   یہ تعجب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو،
سو فتنہ خوابیدہ بیدار ہوں اک پل میں   گر خواب میں بھی دیکھے اس نرگس فتاں کو
مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی   وہ چشم مست ساقی جام جم ہے،
عالم مستی میں جو تو اپنی دکھلائے آنکھ   شرم سے نرگس کی گلشن میں نہ کیوں جھک جائے آنکھ
اشک آنکھوں میں اپنی کیوں نہ ٹھہر کر   ساغر سے دیکھ کر ہمیں کو تری یاد آئے آنکھ
اپنی چشم مست کی گردش نہ اے ساقی دکھا   دیکھ چکر میں ابھی جام شراب آ جائے گا
بھرا ہوا ہے تری چشم مست میں یوں ناز   کسی طرح سے مئے ناب ہو ایاغ کے بیچ
اٹھا کے آنکھ نہ دیکھا چمن میں نرگس نے   رہا ہو اس کو تری چشم پر حیا کا لحاظ
کرے ہے فتنہ ترے چشم فتنہ زا کا لحاظ   یہ وہ بلا ہے بلا کو ہے اس بلا کا لحاظ
کشتہ ہوں چشم مست کا میرے مزار پر   لازم ہے جام بادۂ انگور کا چراغ
روشن ہو چشم مست کے کشتہ کے گور پر   روغن کی جائے بادۂ انگور سے چراغ
کیفیت اپنی چشم سیہ مست کی نہ پوچھ   صوفی تمام دیکھ کے بیخود اچھلنے لگے

منظور ہے ظفر کو جو لکھے وصف چشم یار ۔۔ نرگس کے دستے قلم کوئی اے ہمنشین تراش

چشم مست اسکی بے پی جائے ہے ہوش ۔۔ گرچہ ہم ہوشیار رہتے ہین

چشم اس کی خود ہی سحر نگاہین ہین ۔۔ حاجت نہین ہے سرمہ جادو کی آنکھ مین

کاسۂ چشم تصور چھوڑ کر اپنا کبھی ۔۔ اے ظفر محو تماشا ہین نہ جام جم مین ہون

بغیر بادہ کبھی اس شوخ خود پرست کی آنکھ ۔۔ نشے مین جن کے ایسی ہے جیسے مست کی آنکھ

مشکل پسندی | مگر ظفر کا زور طبع اور کمال فن اس وقت نظر آتا ہے، جب وہ نہایت مشکل اور سنگلاخ ردیف اور قافیے اختیار کرتا ہے، اس کی مثالین اس کے دیوان مین اس کثرت سے ہین کہ اس کتاب کے محدود صفحے ان کے متحمل نہ ہوسکین گے، گو سخن شناسی کا تقاضا تو یہی تھا، کہ اس نے جتنے مشکل قوافی مین طبع آزمائی کی ہے، اور جن سنگلاخ زمینون مین جولانیان دکھائی ہین، ان سب کی داد دل کھول کر دی جاتی، مگر ہم تھوڑے سے اشعار پر اکتفا کرتے ہین، قوافی کی مثالین:-

پارۂ ساغر و شیشہ نہین ابرک کے ورق ۔۔ ساقیا کیونکر کہون شیشے کو عینک کے ورق

یون ہین تختۂ دل سیپارہ سے اشک کے ساتھ ۔۔ جیسے قرآن سے ہو بانٹے ہین کودک کے ورق

اس غزل مین چابک کے ورق، زردک کے ورق، چشمک کے ورق، مشبک کے ورق، پلک کے ورق وغیرہ بھی قافیے ہین،

ٹپکے ہے خاک پہ دل ہائے پاش پاش کے پھینک ۔۔ جو پھینکے بھی تو سر راہ اپنی لاش کے پھینک

ہلال عید فلک سے پہ ہو شغل کیا کیا ۔۔ زمین پہ ناخن پا تو جو تیرے تراش کے پھینک

ماش کے پھینک، تلاش کے پھینک، خراش کے پھینک، معاش کے پھینک، قماش کے پھینک کو بھی استعمال کیا ہے،

ترے بیمار غم کا حال ہے یہ ناتوانی سے — کہ اس نے آج بستر پر ذرا کروٹ نہین بدلی

بقیہ قوافی، کھٹ نہین بدلی، لپٹ پٹ نہین بدلی، چوکھٹ نہین بدلی، جھٹ پٹ نہین بدلی، رٹ سٹ نہین بدلی، وغیرہ،

دل جل گیا ہمارا جگر بھن گیا تمام — الفت تمھاری شعلہ رخو بھاڑ مین پڑے

کھڑکاڑ مین پڑے، تاڑ مین پڑے، چوپاڑ مین پڑے، ہڑواڑ مین پڑے، بوچھاڑ مین پڑے، دھاڑ مین پڑے وغیرہ

یہ خانہ باغ ہے موجود سینہ پر داغ — جو سیر دیکھیے تو وہ دل کی شہ نشین پہ ٹکے

زمین پہ ٹکے، انگبین پہ ٹکے، آستین پہ ٹکے، مہ جبین پہ ٹکے، نگین پہ ٹکے، یاسمین پہ ٹکے وغیرہ،

اسیطرح مختلف سنگلاخ زمینون مین ظفر نے جو زور طبع دکھایا ہے، وہ خاص اسی کا حصہ ہے، وہ نئی نئی زمینین نکالتا تھا، اور ان مین شعر کہکر اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتا تھا، اس کے معترف مولانا محمد حسین آزاد بھی ہین، جو ظفر کے تمام کلام کو ذوق کے عنوان شاعری کی محض زلہ ربائی سمجھتے ہین، وہ بادل ناخواستہ رقم طراز ہین کہ ظفر شاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ تھا، اس کی ان جدتون کے نمونے بھی اس قدر زیادہ ہین، کہ ان کا ایک ایک شعر بھی نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، کچھ نمونے ملاحظہ ہون، خط کشیدہ قوافی مین پوری پوری غزلین ہین،

ہو درد ہوتا تو غل مچاتا جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا — الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہو نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ہم اپنا عشق چمکائین تم اپنا حسن چمکاؤ — کہ حیران دیکھکر عالم ہمین بھی ہو تمھین بھی ہو

زبان مین ہو اثر میری تو شاید دل پھرے اس سے — اگر ناصح دعا دل سے کوئی یون ہو تو یون بھی ہو

سجدہ کرنے کے ہان چشم عنایت ہو تو کینہ نکرہ ہو — کہ بے اشک ندامت جوش رحمت ہو تو کیونکر ہو

رباب و چنگ ہو بزم طرب ہو اور مطرب ہو — دف دف نے ہو دل ہو پھر تو جیسی ہو ن تماشا ہو

کس سے انھوں نے مہر و وفا کی جس سے لیا دل اس سے دغا کی ان سے ہو کیا امید کرم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے

شرارہ سے کہتے تھے شعلے شب کو نالوں کے کہ چمکے چرخ پر اختر تو ہم جیسے نہ تم چمکے

نہیں گل تن پہ عشق دلربا میں پھول کترے ہیں تماشا ہم نے یہ رنج دلربا میں پھول کترے ہیں

غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

خالی نہیں خلش سے محبت کے کوئی بھی یارو کھٹکتی جان میں یہ گل کی پھانس ہے

ظفر کی طبیعت کو مشکل زمینوں میں جولانی دکھانے میں خاص مناسبت تھی، وہ خود کہہ گیا ہے کہ

دل اپنا فکر غزل میں ظفر نہیں لگتا زمیں غزل کی نہ ہووے اگر انوکھی سی

اور اس مشکل پسندی کو وہ اپنا امتیاز سمجھتا ہے،

زمین سہل میں تو ہیں سبھی کچھ شعر کہہ لیتے ظفر لکھتے غزل جو ایسی مشکل میں تو آپ ہی ہیں

ایک دوسری جگہ کہتا ہے،

ظفر مشکل پسندی تیری سی ایک کسکو آتی ہے سخنور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے،

ایک جگہ تو چیلنج دیتا ہے،

ظفر ان قافیوں میں کہہ نہیں سکتا غزل کوئی اگر کہتا کوئی ہے تو تجھ سے اصلاح غزل لے ہے

ظفر کی یہ تعلی ایک حد تک بجا ہے. اس کے ہمعصر شعرا میں سے کسی نے بھی ایسے سنگلاخ قافیوں ردیفوں، اور زمینوں میں غزل نہیں لکھی ہے، انشا اور شاہ نصیر کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں، مگر اتنی نہیں

ظفر اور اساتذۂ فن

ظفر کا زور طبع اسی پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ریختہ کے جتنے با کمال شعرا گذرے ہیں ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، ان کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

میر
فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ
کھینچ دے کیوں نہ زلیخا سی کنعان کے بیچ

ظفر
دم میں دم میرے نہیں جان نہیں جان کے بیچ
زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کے ترے کان کے بیچ

درد
دیکھیے جس کو یاں اسے اور ہی کچھ دماغ ہے
گر ایک شب چراغ بھی گوہر شب چراغ ہے

ظفر
دنیا فروغ دل میں محبت کا داغ ہے
رہتا بغیر داغ یہ گھر بے چراغ ہے

انشا
بنا کے چھوڑ دوں جو افیون کا شراب میں سانپ
تو صاف آئے نظر جرم آفتاب میں سانپ

ظفر
اگر شراب کی موجیں بنیں شراب میں سانپ
خط شعاع سے لہرائیں آفتاب میں سانپ

مصحفی
سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

ظفر
دیکھے جو ہمائے بہت مغرور کی گردن
غلمان کے تن سی ہو جدا حور کی گردن

آتش
ذرہ خورشید ہو پہنچے جو دربار کے پاس
سایہ میں جائے ہما اوس کے دیوار کے پاس

ظفر
آبلہ سینہ پہ ہے میرے دل زار کے پاس
یا کہ شیشہ سا دھرا ساقی سرشار کے پاس

ناسخ
ایک شب تو بھی محفل میں نہ پائے یار شمع
صبح ہوتے ہوتے ہو مانند رشتہ زار شمع

ظفر
دریا بہائے گر ہم اشک بار شمع
تو بھی سیکھے نہ سوز دل داغدار شمع

شیفتہ
دن سے یہاں آنے کی تدبیر ہے
کیا اثر نالۂ شب گیر ہے

ظفر
شوق خار دشت دامن گیر ہے
اور مجنون پائے در زنجیر ہے

غالب کا طرز بیان اور ان کی نکتہ آفرینیاں اپنی جگہ پر، لیکن ایک ہی قافیہ اور ردیف میں ظفر نے اپنے استاد کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں، وہ بھی ذرا سن لیجیے:

غالب
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ظفر
کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصف بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب	ظفر
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں	واہ اس صورت کدہ میں دیکھتے ہی دیکھتے
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں	صورتیں کیا کیا نظر سے اپنے پنہاں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار	جس سے چار آنکھیں تری اے آفت جاں ہوگئیں
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں	تیر سی اس کے جگر کے پار مژگاں ہوگئیں
نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اسکی ہیں	اے ظفر دل کی پریشانی کا ہے میرے اثر
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں	یہ جو اس کافر کی زلفیں ہیں پریشاں ہوگئیں
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ	یہاں تک ہے ذوقِ دشت نوردی کہ ڈھونڈ نکال
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں	ہیں اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤں

مومن کی ایک غزل کا مطلع ہے ،

نامہ بر نے ہیں جو لکھا تو یہ بھیجیگا کاغذ	کہ بنا ہم گہر صفحۂ دریا کاغذ

ظفر نے قافیہ کے تغیر کے ساتھ اسی ردیف میں کئی غزلیں کہی ہیں :

جوش گریہ کا پڑا ہے کہ ترے نامہ کو	دیا آنکھوں سے بھی ہم کو نہ لگانے کاغذ
دل بیتاب کو تسکین ہو کیا قاصد کی باتوں سے	نہ آئے جب تلک اس یار کی تحریر کا کاغذ

ظفر سے متقدم یا اس کے معاصر شعراء کی غزلوں کے مقابلہ میں جو اس کی غزلیں نقل کی گئی ہیں، اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ

ظفر تیرے سخن کے روبرو کسکا سخن چمکے	سخن کی تاب طاقت ہی نہیں رہتی سخنداں کو

یا :-

سخنوری میں ظفر کون تم سے ہو ہمسر	خدا نے تمھیں دل و دماغ دیا

بلکہ صرف اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ

ظفر کہتے ہیں ہم بھی وضع استادانہ رکھتے ہیں

ظفر و میر | اوپر یونہیں ظاہری حیثیت سے باکمال شعراء کے کلام کے مقابلہ میں ظفر کا زور طبع دکھایا گیا ہے، معنوی حیثیت سے بھی اس کے کلام میں مختلف اساتذہ کا رنگ پایا جاتا ہے، میر کے رنگ میں کہتا ہے:

تیرے جس دن سے خاک پا ہیں ہم | خاک ہیں لیک کیمیا ہیں ہم
تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید | کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم
ہم ہیں جوں زلف و عارض خوباں | گو پریشان ہیں خوشنما ہیں ہم[1]

یہ کراہا تیرا بیمار الم درد کے ساتھ | کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا
میں وہ مجنوں ہوں کہ زندان میں نگہبانوں کو | میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

بالیں پہ اس کے شور مچاؤ نہ ہمدمو | نازک بہت ہے عشق کے بیمار کا دماغ
یہاں تلک روئے جدائی میں تیرے نوراً ہم | اشک کی جا چشم سے لخت جگر پیدا ہوا

میر کے طرز پر چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں لکھی ہیں مثلاً

گو رکنج فراغ ہے اپنا | داغ اپنا چراغ ہے اپنا
کون کنج حزن میں ہمدم ساز | ایک دل سوز داغ ہے اپنا
درد دل درد آشنا جانے | اور بے درد کوئی کیا جانے

---

[1] اسی قافیہ اور ردیف میں میر کی ایک غزل کا مطلع ہے:

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم | لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

میر کی اس غزل پر ظفر نے مخمس بھی لکھا ہے، جو اس کے دیوان جلد اول صفحہ ۱۹۳ پر ملاحظہ ہو۔

ہو نمک سود گر نہ زخم جگر — دل محبت کا کیا مزا جانے

میر اور ظفر کے ملتے جلتے ہوئے مضامین،

میر — کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ — اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ
ظفر — داغ دل میں آگ تختۂ دل میں چشم تر میں آگ — عشق کی سوزش سے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ
میر — جل جل کے سب عمارت دل خاک ہوگئی — کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
ظفر — ہوگیا میں خاک جل کر پہ وہی ہے سوز دل — اپنے دامن کو بچائے میرے خاکستر میں آگ
میر — یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں — یہ کیسے عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ
ظفر — جی جلائیں کیوں نہ میرا یہ بتان سنگدل — دل ظفر ان کا ہے پتھر اور ہے پتھر میں آگ
میر — اللہ ری عندلیب کی آواز دلخراش — جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
ظفر — آجائے گر ہوائے گلستان قفس تلک — بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہہ کہہ کے ہائے گل
میر — تیری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہ کہاں کھویا — جگر خون گشتہ دل آزردہ میرا اس خانہ ویران کو
ظفر — تجھے دل دے کے میں لے کافر بے مہر کھو بیٹھا — خرد کو ہوش کو طاقت کو جی کو دین و ایمان کو

ظفر میر کے رنگ میں خود میر صاحب کی طرح سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔

یہ غزل پڑھتے اگر بزم سخنداں میں ظفر — کیونکہ تحسین کے لیے پھر نہ سر میر ہلے

ناسخ و ظفر | ظفر کی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ وہ متضاد رنگ میں کامیاب طبع آزمائی کرتا ہے، ناسخ اور میر کا اختلاف ذوق ظاہر ہے، مگر میر کے بعد جب وہ ناسخ کے رنگ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ رند مشرب عاشق بن جاتا ہے، اور اس کوچہ کا بھی ویسا ہی کامیاب رہ نورد نظر آتا ہے، مثلاً:-

کرتا ہے قتل وقت جواب سخن مجھے — ہنس دینا ان کا اور نہ کہنا حجاب سے

اللہ رے شرم، آئے جو وہ شب کو خواب میں | پنہاں تھا حجاب سے منہ کو نقاب میں
کبھی افسوس وہ اور ہم نہ محفل میں ہم بیٹھے | جو ہم اٹھے تو وہ بیٹھے جو وہ اٹھے تو ہم اٹھے
وصل کی رات نہ باتوں میں گذارو ساری | بس گلے ہو چکے گر ہیں تو سحر ہے دیکھو
جس کو سمجھے لب پان خوردہ مالیدہ مسی | ور دہان دیکھئے پھولی وہ کہیں شام نہ ہو
ہے دوپٹہ سرخ جو وہ شوخ گل اوڑھے ہوئے | باغ میں گل ہے برقع خجالت میں گل اوڑھے ہوئے
گلوں کے ہو گئے گریبان چاک گلشن میں | رہیں گے بند قبا تیرے گر کھلے کے کھلے
نہیں ہے سرخ دوپٹہ جبین شکن پہ | بغور دیکھ ظفر ہے بہار شام شفق
جھلک رخسار آتشناک کی بجلی سی کوندتی ہے | ہوا کے جھونکے اس غنچہ پر جب چلمن ہلاتی ہیں

یہ معاملہ بندی جس طرح ناسخ کے یہاں اعتدال سے بڑھ کر رکیک و سخیف بن گئی ہے، اسی طرح ظفر کے یہاں بعض اوقات بہت ہی متبذل ہو گئی ہے، مگر اس قسم کے خارجی مضامین میں ناسخ کے ساتھ طبع آزمائی کر کے ظفر اپنی تخییل نگاری اور مضمون بندی کا ثبوت دیتا ہے، مثلاً :-

ناسخ — کیا اثر پھیلا ہے تیرے رخ آتشناک کا | صورت مجمر ہے دیوانوں کے پیراہن میں آگ
ظفر — حلقۂ زلف میں ہے اس کا رخ آتشناک | بحر حسن کی روشن ہوئی گرداب میں آگ
ناسخ — اسقدر سوزش ہے اے جراح میرے زخم میں | لگ اٹھے گی دم میں ٹانکے کی طرح سوزن میں آگ
ظفر — ہے شرار اشک سے ان چشم طوفان زا میں آگ | عشق کی گرمی سے دیکھو لگ گئی دریا میں آگ
ناسخ — میری آنکھوں سے اگر لخت دل سوزان گرے | بولے ہمدم دیکھئے ہے آپ کے دامان میں آگ
ظفر — تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکے اشک گرم | کیا تعجب گر لگا دے دامن صحرا میں آگ

آتش و ظفر | اسی طرح آتش کے ساتھ طبع آزمائی کرتا ہے،

آتش مے نے کئے عذارِ شوخ و سنگ سرخ کندن کا اور آگ میں ہوتا ہے رنگ سرخ
ظفر کب چشمِ سرمہ سا ہی تری مست خواب سرخ اس جامِ نیلگون میں ہے رنگِ شراب سرخ
آتش دل دوستی بت کا نہ پابند ہو یارب دشمن کا بھی دب جائے نہ پتھر کے تلے ہاتھ
ظفر فرہاد میسر آتا ہے اس عشق کے شیرین پر کیا کرے جو دب گیا پتھر کے تلے ہاتھ
آتش تبدیل شب وصل سے ہو روز جدائی بالش کے عوض ہو سرِ دلبر کے تلے ہاتھ
ظفر ہے جی میں تمنا یہ کہ سوتے ہیں تو لگا ہے آجائے مرا عارضِ دلبر کے تلے ہاتھ
آتش مستی میں طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا کاٹوں گا میں کاسۂ کا جو ساغر کے تلے ہاتھ
ظفر دل ہاتھ میں اس کا لیا ہے یہ ظفر حال جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ
آتش پاؤں کو ان کے چھوا میں نے تو ہنس کر بولے کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ
ظفر میں نے چوری سے جو شب زلف کو چھیڑا تو کہا کاٹنے چاہئے اس دزدِ سیہ کار کے ہاتھ
آتش کہتا ہے تازہ وہ شہِ خوبان نئے نئے آئین تازہ تازہ ہیں فرمان نئے نئے
ظفر ناز و ادا و غمزہ تو ہیں شیوہ قدیم انداز ان کے اور ہیں اکثر نئے نئے
آتش رخسار خط نکالے گا اس شاہِ حسن کا پیدا کرے گا مورِ سلیمان نئے نئے
ظفر آغازِ خط سے کیا ہی نکالے ہیں دیکھنا طوطی باغِ حسن نے یہ پر نئے نئے
آتش خاک چھنوا رہی ہے کوچۂ قاتل کی تلاش ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے
ظفر وہ سے کے دل قاتلِ بے رحم کو پھیروں کیونکر کہ نہ تقدیر پھرے ہے نہ قضا پھرتی ہے

اور کہیں کہیں تو دربیان میں ظفر آتش سے سبقت لیجاتا ہے، مثلاً

آتش چھوٹا لحد میں دل کا پھپھولا تو دیکھنا ہو جائے گا مزار کا آتش کے سنگ سرخ
ظفر خون جوش میں آتا ہے شہید دنگاہ یہ خاک نکلا زمین کے پردے سے جو آفتاب سرخ

آتش	سوزش دل کا بیان کچھ کیا تھا رات کو	موم ہو کر بہ گئی سن کر مرا افسانہ شمع
ظفر	دریا بہائے گر مژہ اشکبار شمع	تو بھی بجھے نہ سوز دل داغدار شمع
آتش	داغ دل کی روشنی کافی ہے آتش گور میں	غم نہیں اس کا نہ ہوا پنے سرہانے چراغ
ظفر	اس دل جلے کو چاہیے کیا گور کا چراغ	ہے داغ دل ہی کشتۂ رنجور کا چراغ
آتش	کٹواتی ہے سر شمع جو ثابت قدمی سے	آنسو بھی نہ اندیشۂ گلگیر سے ٹپکے
ظفر	ہر اک آنسو کا قطرہ ہے جو دانہ کہربا کا سا	دم گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے
آتش	جوش جنون نے گو کہ مجھے زرد کر دیا	چہرے کو میرے رکھتے ہیں لڑکوں کے سنگ سرخ
ظفر	ہے میرے اشک خون سے ظفر راہ عشق میں	ہر سنگ ریزہ صورت لعل خوش آب سرخ

سراپا نگاری سراپا نگاری کا جتنا مکمل نمونہ ظفر کے یہاں ہے، وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں معشوق کے اوصاف و لوازم کی تصویر کھینچے ہیں تو اس نے پوری پوری غزلیں کہی ہیں، جن میں زیادہ تر رنگ ناسخ و آتش کا ہے لیکن بعض اوقات زبان کی سادگی، بیان کی بے تکلفی اور خیالات کی برجستگی میں ظفر ناسخ و آتش سے بھی بڑھ جاتا ہے، مثلاً ظفر زلف یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دیتا ہے،

کھول کر زلف سیہ اس نے جو دیکھا آئینہ　　صاف دریا پر نظر کالی گھٹا سی آگئی
کھول دی اس نے عرق افشاں جو وہ زلف دراز　　کیا زمیں سے جھوم کر بدلی برسنے لگ گئی
زلف کو کھول کے آئینہ جو دیکھا تو نے　　رنگ بدلی نے بھی کیا کیا لب جیحون بدلے
ڈھانپے منہ کو قمر سے وہیں دامان سحاب　　تیرے عارض پہ اگر زلف گرہ گیر ہلے
زلف اس رخ سے جو سرکی تو یہ سوجھا مجھ کو　　اے ظفر مہ نکل آیا جو گئی ہٹ بدلی

آتش اور ناسخ نے بھی زلف یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دی ہے، مگر ان کے یہاں تصنع

ایک ایک شعر ملا،

آتش — کم نہین کالی گھٹا سے یار کی زلفِ سیاہ — دیکھ لے طاؤس کافر کو تو چلانے لگے

ناسخ — ہمیشہ رہتی ہین زلفین عذارِ تابان پر — عجب ہے چاند کہ ہوتا نہین سحاب جدا

زلف یار کی ناگن سنبل اور زنجیر سے تشبیہین آتش، ناسخ، اور ظفر کے یہان بکثرت ہین، مگر مندرجۂ ذیل اشعار ظفر کی ندرت تخئیل اور جدت طبع کا نمونہ ہین، جو ناسخ اور آتش کے یہان نہین؛

زلف یون روے عرق آلود پر لہرائے ہے — صبح جون ناگن گلون پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یون چہرے پہ ہلتی ہی ہوا سے اسکے — جس طرح مار سیہ کھائے ہو بل پاؤنکے بل

رخ گلنار پر تیرے کہان سے زلف خم گشتہ — یہ لے بحر خوبی حلقہ گرداب آتش ہے

اسکی زلف پہ عرق گرا برتر بن جائے گی — برق تو میری بھی آہ پہ شرر بن جائے گی

ہٹا دو زلف کو تم مصحفِ رخ سی غضب یہ ہے — کہ پھیلے سوئے قرآن پاؤن اس کج طبع کافر کے

خدا محفوظ رکھے اس صنم کی زلف سے دلکو — کہ یہ سیدھا مسلمان اور وہ کج طبع کافر ہے

زلف اس روے کتابی پر ظفر — سورۂ واللیل ہے قرآن مین

مصحفِ رخسار پر کافر ترے گیسو ہین دو — ہے تماشا حافظ قرآن ہوے ہندو ہین دو

لکھی عجب انداز سے ہے رخ پہ تری زلف — ایسا خط تعلیق مین بھی لام نہ پایا

”خال رخ یار“ پر ظفر نے جو مضمون بندی کی ہے، وہ بھی آتش اور ناسخ کے یہان نہین مثلاً

چشم مست بت مے نوش پہ یہ خال نہین — نیلوفر کا ہے دھرا ساغر لبریز پہ گل

خال ہے دنبالۂ چشم فسون گر کے تلے — نیلوفر کا پھول ہی یا شاخ عنبر کے تلے

خال رخ پر زلف کب ہان سر بسر جنبیدہ ہے — شاخ سنبل نیلوفر پر یہ مگر جنبیدہ ہے

خال اب نہ تہ زلف سیاہ فام دکھا | تارا مجھے مت ایک سر شام دکھاؤ

نہیں رخسار پر اس مہ جبین کے خال کا جل کا | خدا جانے کہ یہ کن تیرہ بختون کا ستارا ہے

خال رخ یار کا کشتہ ہون | لایا گردش مین ستارا مجھے

دیکھے ہے خال رخ یار کو یون طائر دل | دانہ پر جیسے پڑے مرغ ہوا گیر کی آنکھ

سورۂ صاد ہے چشم اس کی کہ جبین پہ ظفر | خال سے کاتب قدرت نے بنایا مطلق

اے ظفر اس خال رخ پر یان لفو نکتے نہیں | من سو اپنے ہین یہ کالے لہر کھا کر کھیلتے

یہ سیاہی سے لکھا مضمون خال رخ ترا | ہے بیاض ماہ پہ تنویر مین لکھا ہوا

چشم یار کو ناسخ اور ظفر جام سے تشبیہ دیتے ہین، مثلاً

ناسخ — کر دیا ہی یار چشم و گردن جانان نے مست | سامنے سے ساقیا اب شیشہ و ساغر اٹھا

ظفر — ہم کو اس دور مین ہو کیون طلب ساغر سے | یہ تو جب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو

ناسخ — چشم ساقی سے نہ کیون عشق ہو میرے دل کو | کون شیشہ ہی بھلا جس کو نہین جام سے کام

ظفر — مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی | وہ چشم مست ساقی جام جم ہے

قامت یار پر ناسخ، آتش اور ظفر تینون نے طبع آزمائی کی ہے،

ناسخ — کون ہی جو نہین مرتا ہے تری قامت پر | کیون نہ ہو سرو چمن قالب بیجان ہوتا

آتش — سرو گڑ جاینگے گل خاک مین مل جاینگے | پانون رکھے تو چمن مین وہ سرافراز اپنا

ظفر — صدقے اے رشک چمن اس قد موزون کے ترے | سیدھا ایسا کوئی سرو چمنی ہو وے تو ہو

نزاکت یار پر آتش و ظفر کی شاعرانہ تخییل دیکھیے،

آتش — وہ نازنین یہ نزاکت مین کچھ یگانہ ہوا | جو پہنی پھولون کی بدھی تو درد شانہ ہوا

ظفر — کیا نزاکت ہی کہ گل عکس در گوش سے آہ | بہ پڑا بوجھ کہ درد اس کے ہوا شانے میں

آتش — نہ ذرا نزاکت پری میں دیکھی نہ حور میں نزاکت نیش ... جو ہار پھولوں کا اس نے پہنا تو بوجھ اٹھایا ہزار من کا

ظفر — چہ قدر اللہ رے نزاکت کہ اگر زلف کا عکس ... بوجھ ڈالے تو لچکتی وہ کمر اور بھی ہے

ناسخ اور آتش اپنی اپنی جگہ پر مسلّم الثبوت استاد ہیں، لیکن ظفر کے اشعار میں نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے طرز بیان میں تکلف تصنع اور آورد نہیں، شاید اسی وجہ سے کہہ گیا ہے کہ

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن میں استاد ... کیوں نہ قائل ہوں ترے ناسخ و آتش دونوں

خاتمہ | ظفر کی شاعری پر میری طویل خامہ فرسائی ناظرین کے لیے بار خاطر ہو رہی ہو گی، مگر یہ طوالت شاید اس کا رد عمل ہے، کہ ظفر جس نے ہزاروں اشعار لکھکر اپنے خون جگر کو کاغذ کے صفحوں پر بہایا ہے اسکو یا تو عام طور سے ادنی درجہ کا شاعر یا ذوق کے خوان ادب کا محض زلہ ربا سمجھا جاتا ہے حالانکہ

انصاف ہی جب اہل سخن میں نہ ہو ظفر ... چاہے سخن کی اپنا کوئی ان سے داد خاک

اس کی شہرت کو سب سے زیادہ نقصان مولانا محمد حسین آزاد سے پہنچا جنھوں نے اس کے کلام کے مجموعوں کو "سرتاپا" ذوق کی طرف منسوب کر دیا اور ایک زمانہ تک اہل نظر بھی اس کی شاعری کو ذوق کی کمائی سمجھکر قابل التفات نہیں سمجھتے تھے، لیکن ارباب نظر نے اصل حقیقت کو دکھا کر اس غلط فہمی کو دور کیا، اور ظفر ایک مستقل شاعر مانا گیا مگر پھر بھی غالب، مومن اور ذوق کے آوازۂ شہرت کے سامنے اس کی شاعری دب گئی، اس کے علاوہ اہل ذوق کی طبیعتیں بھی بدل گئیں، غالب کی فلسفہ طرازی، مومن کی بلند پروازی، اور دونوں کی دلنشین فارسی ترکیبوں کے سامنے ظفر کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہو گئی،

ظفر کی شاعری میں غالب اور مومن کی معجز طرازیاں گو نہ سہی لیکن قادر الکلامی کا دائرہ تنگ بھی نہیں، جس نے سوز وگداز اور حزن وملال کا صحیح مرقع کھینچا، اخلاقی مسائل اور صوفیانہ نکات کو عام فہم بنایا، سادگی اور سلاست بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، قلعہ معلیٰ کی زبان اور

محاورات کو اپنی شاعری مین محفوظ کیا، اور اپنے زور طبع سے پرانے اساتذۂ فن کی یاد تازہ کی، کیا اس کو ہم ایک قادر الکلام شاعر اور استاد نہین کہہ سکتے ہین ؟

سخن دان و سخن گو یون تو دنیا مین ہزارون ہین　　ظفر یہ ہم نے تیری سی سخنگوئی نہین دیکھی

بے شبہ اس کی شاعری معائب سے خالی نہین، گو وہ خود تو یہ کہہ گیا ہے :-

آج کس اہل سخن کو دسترس مقدور ہے　　کر سکے جو اے ظفر تیرے سخن پر اعتراض

تاہم جس نے بیس ہزار اشعار کہے ہون، ظاہر ہے کہ وہ سب اچھے نہ ہون گے، خصوصاً جب وہ اپنے رنج و الم اور اندوہ و غم کو بھول کر تفریح طبع کے لیے اشعار کہتا ہے تو اکثر ان کا رنگ بہت ہی شوخ ہو جاتا ہے، اور ان کے مضامین جرأت کی معاملہ بندی سے بھی گر جاتے ہین، یا جب وہ محض مشکل قوافی اور سنگلاخ زمینون کی خاطر اشعار کہتا ہے تو وہ بھی بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہین اور خود اسکو یہ احساس تھا کہ مشکل قوافی اور زمینون مین اعلیٰ معیار کا شعر کہنا مشکل ہے،

ظفر ہے تیری غزل کی وہ سنگلاخ زمین　　کہ تیغ فکر سخنور کی دھار گر جائے

پھر بھی صرف اپنی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے غزلین لکھتا ہے، اور اپنی جدت اور ذہانت پر تعلّی کرتا ہے،

جنھین سخن کا ہے دعویٰ ذرا کہو ان سے　　کہ ایسی جا پہ رقم تم کوئی غزل تو کرو

لیکن ظفر کے پورے دیوان پر خود اسی کا ایک شعر بہت ہی جامع تبصرہ ہو سکتا ہے،

کوئی غزل پہ اپنی جو نازان آگے تیری غزل کے ہو　　شعر سنا دے اسکو ظفر اک اس ہی زمین کا

یعنی ظفر خود اس کا خواہان تھا کہ اس کے دیوان کا انتخاب ہو، مگر اس کو نہ خود اتنی فرصت نصیب ہوئی، اور نہ کوئی اس کا قدر دان پیدا ہوا، کہ میر اور غالب کی طرح اس کے

دیوان سے بھی اچھے اور عمدہ اشعار منتخب کرکے ایک مجموعہ تیار کرتا، اب بھی اگر کسی صاحب ذوق کی کوشش سے اس کے دیوان کا انتخاب شائع ہو جائے تو یہ کہنے مین تامل نہ ہوگا کہ

پروئے تو نے کیا تار سخن مین گوہر معنی ظفر تحسین کنان محفل مین اب سارے سخندان ہین

اور شاید یہ بھی کہ

ترا سخن وہ مزے دار ہے کہ حشر تلک رہین گے اسکے ظفر طبع نکتہ دان پہ مزے



شہزادے

ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانی یعنی بابر کی اولادِ نرینہ میں ہمایون کے علاوہ آٹھ اور لڑکے پیدا ہوئے، کامران، عسکری، ہندال، الور، باربل، فاروق، شاہ رخ اور احمد جن میں موخر الذکر پانچ کا انتقال اسی کی زندگی ہی میں ہو گیا لیکن ہمایون، کامران، عسکری اور ہندال اس کے سامنے پروان چڑھے، اور اس کی علم پرور صحبت میں تعلیم و تادیب سے فیضیاب ہوئے، اس کی موت کے بعد اس کے لڑکوں کو وراثت میں تنہا اس کی شجاعت، اولوالعزمی اور پامردی ہی نہیں، بلکہ علم و ہنر کا شوق اور شعر و شاعری کا ذوق بھی ملا،

مرزا کامران بابر نے اپنی ہنگامہ پرور زندگی کے باوجود کامران کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے اپنی مشہور مثنوی مبین لکھی، اور اس کے ادبی مذاق کے لیے اپنی تزک اسکے مطالعہ میں دی، اس کے ذوق شعری کو فروغ دینے کے لیے اپنا منظوم رسالہ والدیہ اور اپنے اشعار تحفے میں بھیجے، اور پھر علم و ہنر کی چاشنی کیلیے جہان چھان گیا، وہان کے کتب خانون سے اس کے پاس کتابین بھیجین، چنانچہ بابر کی کوششین رائگان نہین گیین، مرزا کامران سخن گوئی و سخن وری کا مالک بنا،

اس کا ایک دیوان زمانہ کی دستبرد سے معلوم نہین کیسے کتب خانہ خدا بخش خان پٹنہ مین محفوظ رہ گیا ہے، اس مین مرزا کے ترکی و فارسی کلام ہین ترکی مین ۳۰ غزلین، تین قطعے چھبیس رباعیان چودہ مثنویان اور کچھ مفردات ہین، اسی طرح فارسی مین ۲۳ غزلین

تین قطعے، چار رباعیاں، چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں، اور ایک ساقی نامہ ہے، فارسی کلام کو پروفیسر محفوظ الحق صاحب مدظلہ (پریزیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کر کے ایک پر مغز مقدمہ کے ساتھ معارف پریس میں چھپوا کر شائع بھی کر دیا ہے، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

مرزا کے کلام میں گو مضامین کی جدت اور خیالات کی بلندی نہیں، لیکن تغزل کا پورا رنگ موجود ہے، مثلاً:-

یار قیبان ہمدم و ہمراز دیدم یار را — یارب آسان کن بمن این حالت دشوار را

رہ چہ باشد بے قراران زدہد صبر و قرار — آنکہ می بخشد خرام آن سرو خوش رفتار را

در تکلم لعل او دندان کرمی ریزد گہر — چون نگہ دارم زگریہ چشم گوہر بار را

غیر جانان در جہان چیزی نیند از دگر — ہر کہ بردارد ز پیش این پردہ پندار را

کام آن نامد بر آ چند دوست یعنی نظر — تا بکام خویش دیدم دولت دیدار را

اے قد رعنائے تو سرو گلستان حسن — روی دلارای تو لالہ بستان حسن

روی خوش جو شتہ تازہ گل باغ لطف — سرو قد دلکشت نخل گلستان حسن

شمس و قمر را نماند، ماہ رخا رونقی — تا تو بر آوردہ سر زگریبان حسن

مرزا جب عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کی کیفیات منظوم کرتا ہے، تو اس کا کلام نسبتہً موثر ہو جاتا ہے، مثلاً

زلیخا کر جمال خود آراستہ می آئی — ورزہد شکست آری در عشق بیفزائی

چون تہ چہرہ بیارائی رخسارہ برافروزی — خود گوئی کجا ماند آئین شکیبائی

گر سر بگجی بیانم در ناظر خود با تم — در سینہ تو پنہانی در دیدہ تو پیدائی

از صبح بشارتہا صد رنگ تہ سپا دو آید — اے واسطہ از ان لو زنگان انجط از لی

گفتی کہ امشت دانم گر خوانم و گر رانم — من بندۂ فرمانم ہر نوع کہ فرمائی
گر دیر نشین سازد ور رہرو دین سازد — مارا بتو دیارا اور است تو دانائی
سودائے کسی دارد باز این سر سامان — جائے ہوست دارد باز این دل ہرجائی

مرزا کے کلام میں اس قسم کے صوفیانہ جذبات کی کمی نہیں، دیوان کا آغاز تو ایک ایسی غزل سے ہوا ہے جس میں شروع سے آخر تک صوفیانہ احساسات اور معتقدات ہیں،

چون بمقصود نشد ہیچ کسے رہبر ما — بعد ازین خاکِ درِ پیر مغان و سرِ ما
کار ما چون ز در بستۂ او نہ کشود — بو کز این پس ز خرابات کشاید در ما
بارگی سست و شب تیرہ و رہ سنگین — وائی گر ہادی لطفت نشود رہبر ما
خو گرفتیم بدرد و غم عشقت بفرست — دم بدم درد و غمے بر دل غم پرور ما
دہ کہ از شوق دلم می طپد و مضطرم — می رسد مژدۂ وصلی مگر از دلبر ما
کامران سوختم از آتش ہجرانِ کسے — کہ بکویش نرسد ذرۂ خاکستر ما

ایک رباعی میں بھی یہی خیالات موجزن ہیں،

یا رب ز کرم دری برویم بکشای — زنگ غیر از دل حزینم بزدای
پیوند من از جملہ علائق بگسل — از ہر دو جہان سوی خودم راہ نمای

ایک قطعہ میں کچھ پند و موعظت بھی ہے،

اے برادر ز من شنو سخنے — کہ ازان بہرہ ور شوی شاید
دل بکار جہان منہ کہ ازان — بار غم بر دلِ تو افزاید
کار عقبی بساز ورنہ ترا — کار و بار جہان چہ کار آید

کامران کی ہنگامہ خیز زندگی اور اس کا دردناک انجام نظر کے سامنے ہو تو یہ قطعہ

کتنا موثر اور عبرت انگیز ہو جاتا ہے، ایک مثنوی کی تمہید میں تو اس نے شاید اپنی زندگی کا مرقع ہی کھینچ دیا ہے،

تا چہ سازد جہان بے سر و بن　　غافل از مکر آسمانِ کہن

رفت کارم ز دست و دست از کار　　نیست کارم بغیر نالۂ زار

نے ز نخلِ امید من ثمرے　　نے ز تخم نشاط و عیش برے

بکشاید دلم ز باغ و بہار　　نیست مقصود من ز جملہ نگار

اس کی تمنا تھی کہ

بیا ساقی آن مے کہ خامی دہد　　ز دنیا و عقبی خلاصی دہد

اور یہ پوری ہوئی، وہ دنیا کے ہنگاموں اور آلودگیوں سے کنارہ کش ہو کر ساقی حقیقی کے اصلی میخانہ میں مخمور اور سرشار ہو کر جاں بحق ہوا، یعنی اسکی وفات مکہ میں ایام حج میں ہوئی، مرزا کی شعر گوئی محض اس کی ذہانت و ذکاوت کا نتیجہ تھی، وہ حالات سے متاثر ہو کر شعر موزون کرتا، اور کبھی کبھی فی البدیہہ اور برجستہ کہتا تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

باپ کے مرنے کے بعد زمانہ کی عام روش کے مطابق وہ بھی تخت و تاج کا خواہان ہوا، بابر نے اپنی زندگی میں اس کو قندھار کی مملکت عطا کی تھی، لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی سلطنت کی ہوس میں اس نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا، ہمایوں نے اپنے باپ کی وصیت اور کچھ اپنے مصالح کی خاطر کامران کے خلاف کوئی جارحانہ تدبیر نہ کی، بلکہ ایک فرمان لکھکر اس کو کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب کا بھی مالک بنا دیا، کامران نے متاثر ہو کر شکریہ میں ہمایوں کی خدمت میں مندرجۂ ذیل غزل پیش کی،

حسنِ تو دم بدم افزون بادا　　طلعت فرخ و میمون بادا

ہر غباری کہ زراہت خیزد — کحل چشم من محزون بادا

خاک کو از رہ لیلیٰ خیزد — جاے او دیدۂ مجنون بادا

بندۂ حلقہ بگوشش تو چو من — صد چو دارا و فریدون بادا

ہر کہ گرد تو چو پرکار نگشت — او ازین دایرہ بیرون بادا

کامران تا کہ جہان راست بقا — خسرو دہر ہمایون بادا

ہمایون نے اس غزل کے صلہ مین کامران کو حصار فیروزہ انعام دیا،[۱]

مگر دونون بھائیون کی باہمی شفقت و محبت بہت دنون تک قائم نہ رہی، اپنے اپنے مصالح کی بنا پر دونون ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے، اور آپس کے نفاق سے دونون کو برے دن دیکھنے نصیب ہوئے، ہمایون کو اپنے باپ کی سلطنت سنبھالنی تھی، وہ چارون طرف سے دشمنون کے نرغہ مین گھرا ہوا تھا، اسے دشمنون کو پسپا کرنا، ان کے ملکون کو تسخیر کرنا اور تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنی تھی، اسکو امید تھی کہ اسکے بھائی اس مصیبت مین اس کی غمگساری اور رفاقت

[۱] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۲۵، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے تذکرہ ہفت اقلیم کے استناد سے لکھا ہے، کہ مذکورۂ بالا غزل کے علاوہ یہ غزل بھی اس موقع پر بھیجی تھی،

چشم بر راہ تو داریم شدہ ایامے چند — وقت آن شد کہ نہی جانب ما گامے چند

آنکہ ہرگز نفرستی سوی ما پیغامے چند — چہ شود گر کنم شاد بدشنامے چند

تا کے میل دلم را بہ خست سپے نبرد — دولت وصل تو خواہم ولا رامے چند

ہر صید دل ما دانۂ خال تو بس است — ہر دم از زلف منہ بر سر ما دامے چند

ما خرابا تی و بر ندیم تو با ما منشین — حیف باشد کہ نشینی تو بہ بدنامے چند

کامران این غزل نو بہمایون نفرست — باشد ارسال کند سوے تو انعامے چند

کرین گے، لیکن کامران جس نے باپ کی ہمت مردانہ اور جوش عمل ورا ثت مین پایا تھا، باپ کے تخت و تاج کے حصول کیلئے کیونکر قسمت آزمائی نہ کرتا، چنانچہ وہ ہمایون سے الگ ہوکر اس کا حریف بن گیا، ہمایون نے شیر شاہ سے پے در پے شکستین کھائین تو کامران نے ان شکستون سے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن اپنی قسمت کے لکھے ہوئے کو کیونکر مٹا سکتا تھا، ہمایون جب تیرہ سال کی آوارہ گردی کے بعد اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لیے لوٹا، تو پہلے اس نے اپنے بھائی ہمایون کے خلاف جنگ کی، کامران اس وقت کابل مین تھا، دونون بھائیون مین سخت جنگ ہوئی، کامران قلعہ مین محصور ہوگیا، مگر ہولناک جنگ جاری رہی، جب لڑائی طول کھینچی تو ہمایون نے بھائی کو ایک رقعہ لکھا، جس کو ابوالفضل نے اس طرح درج کیا ہے

اے برادر بدخواہ اے عزیز جنگ جوانہ تدبیر این کار (کہ باعث کار زار و موجب قتل و آزار مردم بیشمار است) باز آئی، و برمردم شہرے و لشکرے رحم نمائے، امروز این ہمہ مردم کشتہ می شود و فردائے قیامت،

بود خون آن قوم در گردنت · بود دست آن جمع در دامنت

ہمان بہ کہ بر صلح رائے آوری · طریق مروت بجائے آوری

مگر کامران نے اپنی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی مین سرشار ہوکر یہ شعر لکھ بھیجا،

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست · کہ بوسہ بر لب شمشیر آب دار دہد[۱]

اس جنگ مین کامران کو شکست ہوئی لیکن وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھا، موقع موقع سے وہ ہمایون کے خلاف جنگ کرتا رہا لیکن قسمت نے اس کا کبھی ساتھ نہ دیا، ایک بار شکست کھاکر سلیم شاہ سوری کے دربار مین پہونچا، جہان اس کو امید تھی کہ ہمایون کے خلاف اس کو امداد دی گئی

[۱] اکبر نامہ جلد اول ص ۲۲۸

لیکن یہان اس کی امید برنہ آئی اور اس کو ہر قسم کی ذلتین اٹھانی پڑین، سلیم شاہ نے پہلے اسکی علمیت کو نیچا دکھانے کی کوشش کی، تاریخ داؤدی ہے،

مرزا کامران ہمایون شاہ کے یہان سے بھاگ کر سلیم شاہ کے یہان پناہ گزین ہوا پہلی مجلس مین سلیم شاہ نے کامران مرزا کے امتحان طبع کے لیے تین شعر جن مین ایک اہل عراق کا، دوسرا فضلاے ہندوستان کا، اور تیسرا افغانستان کا تھا، پیش کر کے کہا کہ یہ اشعار کیسے ہیں؟ کامران مرزا نے کہا کہ آپ شعر کی خوبی کے متعلق سوال کرتے ہیں یا یہ پوچھتے ہین کہ یہ کس کے اشعار ہین؟ سلیم نے کہا کہ مین یہ جاننا چاہتا ہون کہ یہ تینون شعر کس کے ہین؟ کامران نے کہا کہ پہلا شعر جو آپنے پڑھا وہ عراق کے مغل کا، دوسرا شعر اہل ہند کا، اور تیسرا افغانی کا ہے، سلیم شاہ اور تمام حاضرین مجلس نے مرزا کامران کے فہم و فراست کی تعریف کی،

پھر بھی سلیم شاہ کے درباری اس سے تمسخر کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ اپنی ذہانت اور قوت گویائی سے ان کو خاموش رکھتا تھا، ملا بدایونی لکھتے ہین،

سلیم شاہ کبھی مرزا کو بلا کر مشاعرہ کرتا تھا، اور یہ صحبت بے لطفی سے گذرتی تھی، مرزا ان تکلفات اور تواضعات سے بہت تنگ آکر زندگی سے بیزار ہوگیا تھا، اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈھتا تھا، افغانی ہندی زبان مین اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور جب وہ دربار میں آتا تو وہ کہتے کہ مورو (مرغ) آرہا ہے، مرزا نے سلیم شاہ کے سامنے ایک مقرب درباری سے پوچھا کہ مورو کس کو کہتے ہین، درباری نے جواب دیا کہ جلیل القدر رانتن کو کہتے ہین، مرزا نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو سلیم شاہ بڑا مورو ہے اور شیر شاہ اس سے بھی زیادہ، (منتخب التواریخ ج ا ص ۹۰ ۳)

ایک موقع پر سلیم شاہ نے کامران کو اپنا شعر سنانے کو کہا، کامران نے جل کر برجستہ یہ شعر پڑھا،

گردش گردون گردان گردنان را گرد کرد ... بر سر اہل تمیزان ناقصان را مرد کرد

سلیم شاہ بہت خفیف ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

سلیم شاہ فحوائے کلام را دانستہ واین ادارا فرو بردہ بھو کلان پنہانی حکم فرمود تا مرزا چشم بند نگاہ دارند"[1]

کامران یہاں سے نکلا تو ادہر ادہر بھٹکتا رہا، کابل جا رہا تھا کہ ہمایون کے آدمیون کے ہاتھون گرفتار ہوا، کامران نے بے بس ہو کر ایک عرضداشت لکھ بھیجی[2]، لیکن اس کے دن پورے ہو چکے تھے، اس کا وہی حشر ہوا جو تیموری سلطنت کے ہزیمت خوردہ وعویداروں کا ہوا یعنی اس کی آنکھون کی روشنی زائل کر دی گئی، جب اس نعمت سے وہ محروم ہو گیا تو اس کا محبوب غلام بیگ ملوک اس کے پاس آیا، وہ اس کے ہاتھون کو اپنی آنکھون سے لگاتا اور یہ شعر پڑھتا تھا،

ہر چند کہ چشم برجست پردہ کشیدہ است ... بیناست بچشمی کہ بروی تو ندیدہ است

کتنا حسرتناک شعر ہے، فرشتہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایون بھی اس کا عبرتناک انجام دیکھنے آیا، وہ جب اس کے پاس پہنچا، تو کامران نے استقبال میں یہ شعر پڑھے،

---

[1] منتخب التواریخ ج ا ص ۳۹۵، [2] پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مسٹر بیورج کے ایک مضمون (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن بابتہ ۱۹۰۲ء ص ۱۳۲ - ۱۱۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس عرضداشت کے ساتھ کامران نے معذرت میں ایک غزل بھیجی تھی، مسٹر بیورج کو یہ غزل اکبرنامہ کے ایک قلمی نسخہ بلگرام میں ملی تھی لیکن افسوس ہے کہ مسٹر بیورج نے اس غزل کو اپنے مضمون میں نقل نہیں کیا، اور نہ یہ غزل اکبرنامہ کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہے،

زقدر و شوکت سلطان نگشت چیزے کم | زالتفات بہ مہمان سرائے دہقانی
کلاہ گوشۂ دہقان بآفتاب رسید | کہ سایہ بر سرش افگند چو تو سلطانی

ان کو سن کر ہمایون پر گریہ طاری ہو گیا[۱]

کامران کے لیے دنیا اور اس کی نیرنگیوں میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، ہمایون جب کابل جا رہا تھا تو اس نے سندھ کے قریب حج بیت اللہ کی اجازت مانگی جو مل گئی، بھائی کو رخصت کرنے کے لیے ہمایون جب اس کے خیمے میں آیا، تو کامران کی زبان پر پھر دو چبھتے ہوئے شعر تھے،

کلاہ گوشۂ درویش بر فلک ساید | کہ سایہ ہمچو تو شاہے فگند بر سر او
بجانم از تو ہرچہ رسد جائے منت است | گر ناوک جفا است دگر خنجر ستم

ان اشعار کی خلش ابوالفضل نے بھی محسوس کی، وہ لکھتا ہے،

اگرچہ بیت ثانی جانب شکر دارد، اما سخن شناس دریابد کہ از شکایت لبریز است آنحضرت (کہ جہان مردمی و مہربانی بودند) اینہا منظور نداشتہ رقتہا فرمودند"[۲]

کامران اپنے بچوں کو ہمایون کے حوالہ کر کے اپنی بیوی چوچک بیگم کے ساتھ حج کو چلا گیا، اور وہیں زندگی کے بقیہ دن گذارے، تین بار حج کی سعادت سے مشرف ہوا، آخری بار جب حج کا فریضہ ادا کر رہا تھا، کہ منا کے میدان میں ۱۱ ذی الحجہ ۹۶۴ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملا، کامران کی موت پر قطعۂ تاریخ متعدد شعراء نے لکھا ہے[۳]، مگر ملا بدایونی کو کامران کی ذات

---

[۱] فرشتہ ص ۲۴۲ نولکشور پریس، [۲] اکبر نامہ جلد اول ص ۳۳، [۳] مولانا قاسم کاہی نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا،

کامران آنکہ پادشاہی را | کس نہ بود ست ہمچو او در خورد
شد ز کابل بکعبہ و آنجا | جان بحق داد و تن بخاک سپرد

(باقی حاشیہ ص ۳۹۸)

سے شاید بڑی دلچسپی تھی، انھون نے خاقانی کے رنگ مین اس کا ماتم کیا ہے،

ہرگز بباغ عہد گیا ہے وفا نکرد　　ہرگز ز شست چرخ خدنگے خطا نکرد

خیاط روزگار بیالاے ہیچ کس　　پیراہنے نہ دوخت کہ آخر قبا نکرد

نقدے نداد دور کہ آخر بدل نشد　　بردے نیاخت دہر کہ آن را دغا نکرد

گردون در آفتاب سلامت کرا نشاند　　کورا چو صبح روشن اندک بقا نکرد

خاقانیا بچشم جہان خاک در فگن　　کو درد چشم دیدہ ترا دوا نکرد[1]

مرزا کی شعرگوئی کی تعریف ہر زمانہ کے مورخون اور تذکرہ نویسون نے کی ہے،

بدایونی نے لکھا ہے

"ہمیشہ با علماء و فضلا صحبت می داشت و اشعار او مشہور است"[52]

داؤدی مین ہے،

مرزا کامران در شعرآرائی و سخن فہمی طبیعت درست داشت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۳) گفت تاریخ او چنین کاہی　　پادشہ کامران بکعبہ مرد

ویسی نے لکھا

شہ کامران خسرو نامدار　　کہ در سلطنت سر بکیوان رساند

مجاور شد اندر حرم چار سال　　بکلی دل از قید عالم رہاند

ز بعد وقوف حج چارمین　　باحرام حج جان بجانان فشاند

چو در خواب ویسی در آمد شبے　　عنایت نمود و سوی خویش خواند

بگفتا ازپے شدت از فوت ما　　بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند

[1] بدایونی ج ۱ صفحہ ۴۵۳، ۴۵۲ ایضاً

صاحب ہفت اقلیم کہتا ہے :-

مرزا کامران در مضمار شاعری بردو مرکب سواری نمودہ"

نواب حسین قلی خان عشق مؤلف تذکرہ نشتر عشق نے لکھا ہے :

"طبع لطیف و معنی یاب داشت"

اس کے بعد مرزا کی موت پر جو قطعہ تاریخ درج کیا ہے، اس مین بھی اسکی شعر گوئی کے سلیقہ کی داد ہے۔

اختر برج سخن آن نکتہ دان ۔۔۔ وہ چہ شام از این جہان شد رہگرائے

از سر جاہش بگفتم سال فوت ۔۔۔ کامران آسودہ در فردوس ہائے

مجمع النفائس کے مؤلف نے مرزا کامران کے حسب ذیل اشعار کو خاص طور سے پسند کیا ہے :

بازو امانِ خود آن سر بہالا زدہ است ۔۔۔ کس بدامانش مگر دستِ تمنا زدہ است

عیب ما چند کنی قصہ عشقان بشنو ۔۔۔ کہ بیک جلوہ رہش و خرقہ تہ سازدہ است

سوئے مقصد نشد از ہیچ کسے رہبر ما ۔۔۔ بعد این فاک در پیر مغان و سر ما

صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہین

وے طبع موزون داشتہ و شعری چون در مکنون

صبح گلشن مین ہے :

طبع مستقیمش لطائف سخن رالیشت و پناہ

دیوان کامران کے مرتب پروفیسر محفوظ الحق صاحب رقمطراز ہین :

مرزا واقعی غزل گو ہے۔ اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اس کے کلام مین صفائی اور

سلاست کافی حد تک ہے، گو خیالات میں کوئی ندرت نہیں، اور نہ کلام میں ہمایون جیسی پختگی معلوم ہوتی ہے، لیکن طرز ادا قابل ستایش و داد ہے، کلام برجستہ و بے تکلف اور نمکین ہے، اور بعض اشعار میں تصوف کی بھی چاشنی ہے[1]

مرزا ابوالقاسم شوکتی مرزا کامران کی اولاد نرینہ میں مرزا ابوالقاسم بھی باپ کی طرح شاعر ہوا، شوکتی تخلص رکھتا تھا، ہفت اقلیم کا مؤلف اس کو فطین و ذکی بتاتا ہے، اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"مرزا ابوالقاسم در غایت فطنت و ذکا، در نہایت ملاحت و صفا، .... بشعر گفتن میلی تمام داشتہ و سخن نیک می رسید، و شوکتی تخلص می کرد این دو بیت مر او راست"

یار ہر شانہ کہ در زلف سمن سا زدہ است
نشتر غم بدل غم زدہ ما زدہ است

قصد کشتن من این قدر شتاب مکن
بخواہم از سستی مردا ضطراب مکن[2]

ریاض الشعراء کا مصنف لکھتا ہے کہ

"رخسارۂ حالش بزیور دانش و کمال آراستہ و پیراستہ بود"[3]

صبح گلشن میں ہے،

در بزم و رزم بہیبت و شوکت قدم می گذاشت[4]

مرزا ابوالقاسم اکبر کے حکم سے قلعہ گوالیار میں مقید رہا اور آخر میں اس کے حکم سے

---

[1] دیوان مرزا کامران مرتبہ پروفیسر محفوظ الحق صاحب، (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ)

[2] ہفت اقلیم قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی [3] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ [4] صبح گلشن ص ۳۳۹

قتل کر دیا گیا، فرشتہ کی روایت ہو کہ قتل کے وقت اس کی زبان پر یہ شعر تھا،

فلک بکشتن من این قدر شتاب مکن ‌‌‌‌‌‌ بخواہم از ستمت مرد اضطراب مکن[۱]

اس کے بعد مرزا کامران کی کوئی اولاد نرینہ نہ رہی، اس لیے کسی نے اس کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا،

نماند از کامران نام و نشانی[۲]

عسکری و ہندال معاصر مورخون نے عسکری و ہندال کا ذکر شعرا کی حیثیت سے نہین کیا ہے، لیکن بعض تذکرون مین ان دونون کے نام شاعرون کی فہرست مین داخل ہین مخزن الغرائب مین ہندال کی ایک رباعی ہے، جو ندرت کے لحاظ سے خوب ہے،

زان قطرۂ شبنم کہ نسیم سحری ‌‌‌‌‌‌ از ابر جدا کرد و بصد حیلہ گری

تا بر رخ گل چکاند از رشک پری ‌‌‌‌‌‌ حقا کہ ہزار بار پاکیزہ تری

اسی مین عسکری کے مندرجہ ذیل اشعار منقول ہین،

چنان بیخود شدم از دوری آن گلعذار امشب ‌‌‌‌‌‌ کہ ہر دم گریہ دارد و مید ہد بے اختیار امشب

چنین کہ خوے گرفتم باشنائی تو ‌‌‌‌‌‌ ہلاک می کندم آن شب جدائی تو

گوشہ میخانہ جائے دلکشائی بودہ است ‌‌‌‌‌‌ بے تکلف گوشہ میخانہ جائے بودہ است

اے عسکری ار مست مدامی خوش باش ‌‌‌‌‌‌ در معتقد بادہ و جامی خوش باش

گفتی بخرابات نباشم بے او ‌‌‌‌‌‌ با یار اگر درین مقامی خوش باش

شاہ ابوالمعالی ہمایون کی اولاد نرینہ مین اکبر کے علاوہ حکیم مرزا بھی تھا، اس شہزادہ کے ذوق کلام کا ذکر معاصر مورخون نے نہین کیا ہے، لیکن ہمایون کا ایک داماد یعنی مہر جان بیگم

---

[۱] فرشتہ ص ۲۴۱ نولکشور پریس ‌‌ [۲] ریاض الشعراء

کی لڑکی اور مرزا حکیم کی بہن فخر النسا کا شوہر میر شاہ ابو المعالی ایک خوش مذاق شاعر تھا، او شہیدی تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا میں ہے،

"شاہ ابو المعالی خوش طبع و سلیقہ بشعر موافق داشت"[1]

مرزا دانیال | اکبر کے تین لڑکے تھے، سلیم، دانیال اور مراد، جن میں دانیال فارسی اور ہندی کا شاعر تھا، اس کے ذوق شعری کا ذکر کرکے جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ

"بہ تفنگ و شکارے کہ بہ تفنگ کنند میل تمام داشت، یکے از تفنگہائے خود را یکہ وجنازہ نام نہادہ بود، این بیت را خود گرفتہ فرمودکہ بر آن نقش کنند"

از شوق شکارے تو شود جان تر و تازہ   بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ وجنازہ

اس کی ہندی شاعری کے بارے میں وہ رقمطراز ہے۔

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بزبان اہل ہند و باصطلاح ایشان شعرے می گفت بد نبود"[2]

دانیال کے دربار میں شاعروں کا ایک مجمع رہتا تھا، انہی میں ملا محمد رضا نوعی (المتوفی ۱۰۹۰ھ) اور میر حسین کفری تھے،

ملا رضا **نوعی** خبوشان (خراسان) کے رہنے والے تھے، صغر سنی میں باپ کے ساتھ ہندوستان آئے، مگر تھوڑے دنوں کے بعد وطن واپس چلے گئے، باپ کی وفات کے بعد پھر ہندوستان آئے، اور مرزا یوسف خان کے دربار میں ملازم ہوئے، اس کے ساتھ کشمیر گئے تو وہاں کی بہشت زار میں ان کی طبیعت میں بھی رنگ و بو پیدا ہوا، اور طبع آزمائی کرنے

[1] مآثر الامرا میں جلد سوم ص ۹۱ و ۱۸۹، نیز حالات کے لیے دیکھو اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۹۸ و ۲۰۶، طبقات اکبری جلد ۲ ص ۶۹ و ۱۹۵، منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۶۳-۵۷، [2] تزک جہانگیری ص ۱۷، نولکشور پریس

لگے۔ نوعی تخلص رکھا، اشعار خواص و عوام میں مقبول ہونے لگے،

رفتہ رفتہ بتقریب بہ سمع مبارک شاہزادہ عالی جاہ شاہزادہ دان (یعنی دانیال)

شاہ رسید آن قدردان نکتہ سنجان از روے خواہش نوعی را از مرزا یوسف خان

گرفتہ داخل بساط بوستان محفل حشمت و شوکت خود گردانید .... چون

داخل مداحان آن شہزادہ عالی مقدار گردید، قصائد غرا در مدح آن جوان بخت

عالی تبار گفت،[1]

مآثر رحیمی کا مولف لکھتا ہے،

بیت

شاہزادہ مومی الیہ (یعنی دانیال) را صحبت مولائی مذکور پسند افتادہ در ترقی و تربیت

او را کوشیدند و سر بے نیازی او را فرق فرقد سای گردانیدند"[2]

دانیال کی فرمایش پر ملا نوعی نے ایک مثنوی "سوز و گداز" لکھی جس میں ایک ہندو

عروس کے عشق کا قصہ مرقوم ہے، عورت کا شوہر بیاہ کے دن ایک چھت کے گر جانے سے

دبکر مر گیا، وہ ستی ہونے چلی، تو اکبر نے اس کو روکنا چاہا، لیکن شوہر کے عشق میں وہ آگ

میں کود پڑی، اسی واقعہ کو نوعی نے دانیال کی فرمایش سے منظوم کیا ہے،

نوعی کا قابل فخر کارنامہ "ساقی نامہ" ہے، جس کے صلہ میں مرزا عبد الرحیم خانخانان نے

اس کو دس ہزار روپے اور ہاتھی گھوڑے عنایت کیے تھے، اس ساقی نامہ میں سات سو اشعار

تھے، ابتدائی حصے ملاحظہ ہوں،

توئی اولین پیر میخانہا	بیادِ تو سرشگیر پیمانہا
زنامت کر زنگ لب و آبروست	لب لعل پیمانہ لبیک گوست

---

[1] میخانہ مولفہ ملا عبد النبی مرتبہ پروفیسر محمد شفیع [2] مآثر رحیمی جلد ۳ صفحہ ۱۳۰

بیا بوس نام تو در انجمن — کند شیشہ رامی زبان در دہن
ز نامت کہ پیمانہ ہر لبست — صراحی زمی پای تا سر لبست
بجز وری کہ منظور ہر محفل است — ز بزم تو بوے کباب دل است
صبوح چمن کافرین خوان تست — شکر خندۂ بزم مستان تست
توئی مجلس آرای ہشیار دست — چو گل بر سر و ہم چو ساغر بدست
ز بزمت کہ شد صبح دل شام او — چراغیست خورکرد گل نام او
گل و بادہ انشا گر راز تست — شب و روز زیر و بم ساز تست

میر حسن کفری خراسان کا رہنے والا تھا، تیموریوں کی علم نوازی کا شہرہ سنکر ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی، مآثر رحیمی میں ہے، "مدتے ملازم شہزادہ خورشید ہوا شاہزادہ دانیال شد، در ملازمت آن شاہزادہ بخشیار کمال تقرب و منزلتے بہم رسانید و قصائد غرا بمدح آن شاہزادہ گفتہ۔"

شاہزادہ کی وفات کے بعد عبدالرحیم خانخانان کی زلہ ربائیوں سے متمتع ہوا، [۱]

عبدالرحیم خانخانان کی شان میں بہت سے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، ان میں سے ایک ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے اس کے کلام کا اندازہ ہوگا،

اے گوہر خور ز آئینہ بار گہت — وین ظلمت شب نشان گرد رہت
یعقوب ز مصر و موسی از طور نیافت — آن بہرہ کہ من یافتم از خاک رہت

شہزادہ مراد — اکبر کے چھوٹے لڑکے شہزادہ مراد کے دربار میں بھی شعر و سخن کا چرچا رہا، نظیری نیشاپوری کی رسائی جب اس کی محفل میں ہوئی، تو اس کی تصویر مولانا تشبیلی اپنے

[۱] مآثر رحیمی ص ۵۰۰ جلد سوم

دلاویز انداز مین اس طرح پیش کرتے ہین،

"حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار مین رسائی حاصل کی، اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ ان اطراف مین فوجین لیے ہوئے پڑا تھا، نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا، دربار مین جانا چاہتا تھا کہ راہ مین ایک قدردان سخن کی نظر پڑ گئی، اس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے قصیدہ لکھکر پیش کیجیے، خود جاکر شہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار مین سجدہ بجا لانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان وشوکت دیکھکر نظیری کے حواس جاتے رہے، اس لیے آداب اور آئین سب بھول گیا، نقیبون نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ مین نے آجتک یہ شان وشوکت نہیں دیکھی تھی، اس لیے حواس ٹھکانے نہ رہے، یہ تمام واقعات نظیری نے خود قصیدہ مدحیہ مین لکھے ہین" (شعر العجم جلد سوم ص۱۳۶)

اس قصیدہ کے خاص خاص اشعار یہ ہین

دران بساط کہ بر خود مرا شعور نہ بود
زدور دیدۂ دانا دلے بمن افتاد

بمن گفت کہ اے زیب بخش مجمع انس
بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارکباد

بساط مجلس وآئین جشن فرورد یست
تو نیز جلوۂ آئین نظم خواہی داد

ہمین دو دید وبگفت وہنوز پیدا بود
کہ شد عزیز کزین قطرہ کرد دریا باد

چنان بپایۂ دولت ندم شتاب زدہ
کہ چند بار سرم در مقام پا افتاد

زبسکہ تیز بہ آن بارگاہ در رفتم
ادب ز پایۂ خود پاسے بہ فراز نہاد

ز دلفریبی آئین وفر سلطانی
بجاہ تہنیتم رسم سجدہ رفت از یاد

چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم
ندا رسید کہ اے روستاہی مادرزاد

بساطِ عرش و تکبیر، ترا چہ پیش آمد | حریمِ کعبہ و غفلت، ترا چہ حال افتاد
جواب دادم و گفتم بجرم معذورم | کہ تا ستم چنین دوستی نگشتم شاد

نظیری کا شہزادہ مراد سے بڑا قلبی تعلق تھا، شہزادہ کی موت پر اس نے بڑی دلسوزی کے ساتھ مرثیہ لکھا ہے،

اے بزم تیرہ رخ چون ارغوان کجا است | وے رزم در ہمہ شیر گیتی ستان کجا است
شوق سجود در حرمت تعظیم کمتر است | آن ناز صدر و سرکشی آستان کجا است
برگ و شگوفہ ریخت، ثمر از کجا خورم | بشکست شاخ برگ، مرا آشیان کجا است
کس را سر دو در خور این تعزیت نبود | پیدا کنید کاہ دل این استان کجا است
خلقے بہ شیون اند، و نگویند حال چیست | صبر سخن شنیدن و تاب بیان کجا است

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
این مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

نغمہ خاست، در پیالہ اے از ساغر افگنید | شاد بزم تیرہ پردہ از آن رخ بر افگنید
شمعے کہ دہر روشن از و بود، مردہ است | پروانہ را بہ پیلہ در بستر افگنید
در بزم او ز حلقۂ ماتم خرام نیست | این حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید
ریحان جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ | چینید و ہم بر آن قدحان پر و افگنید
رفت آن سرے کہ تاج بادِ سر فراز بود | بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید

خیزید تا بہ آن سر تابوت دم زنیم
عرفی کنیم و کار دو داغش بہم زنیم

نظیری نیشاپوری کے علاوہ مراد کے دربار سے مرزا لعلی بھی وابستہ تھا، مرزا لعل بیگ لعلی

ولد شاہ قلی سلطان بدخشی، تشکیل بجمیل، متواضع، اور خاکسار ہونے کے علاوہ شعر وشاعری اور تاریخ و سیر سے بھی ذوق رکھتا تھا، ملا عبد القادر بدایونی کو اس سے بڑی محبت تھی اور اس کے حسب ذیل شعر کو خاص طور سے پسند کیا ہے،

بہ رہگذار تو چون خاک رہ شدم ترسم | کہ نگذری بمن و بگذری براہ دگر[۱]

پرویز جہانگیر کے لڑکوں میں شہزادہ پرویز نے بھی شعر وشاعری اور علم وفن کی محفل سجائی، اس کے دربار کے بعض شعراء و فضلا حسب ذیل تھے،

حکیم فغفوری گیلانی، نام محمد حسین، مولد لاہجان تھا اس لیے فغفوری لاہجی بھی کہلاتا تھا، پہلے سمّی پھر فغفوری تخلص رکھا[۲]، ہندوستان آیا تو پرویز کے دربار کو اپنے فضل و کمال سے رونق بخشی اور اس کی شان میں بہت سے قصائد کہے، طب، ریاضی، موسیقی اور شاعری میں "یکتائے روزگار" سمجھا جاتا تھا، میخانہ میں ہے:

"حکیم فغفور یگانۂ سخن سرایان دہر و نادرۂ صیرفیان این عصر است........ از اکثر ناظمان نامی این عہد ممتاز در شعر فہمی و تازہ گوئی بے انباز بود" (ص۳۱)

اس دیوان میں قریب پانچ ہزار اشعار تھے، ساقی نامہ کے طرز پر ایک ترجیع بند لکھا ہے جس کی ابتدا میں اپنے زور بیان کا مظاہرہ اس طرح کیا ہے،

ساقی بدہ آن بادہ کہ خورشید شرار است | چون آتش گل ریز بدامان بہار است
آن آتش بے دود کہ موسیٰش محوسیت | وآن نور فروزندہ کہ سوزندۂ نار است
چون غنچہ جامش زدم شیشہ بخندد | گوئی کہ لبالب ز نشئہ لب یار است
آنجا کہ رسن تاب شود گیسوئے تاکش | صد مست چو منصور خمیازہ دار است

[۱] بدایونی جلد سوم صفحہ ۳۲۶، [۲] مخزن الغرائب،

موج قدح شد دل ما از دست حریفان — چون طرهٔ پر تاب که بر روی نگار است

خم کوی صلاحت می آتش زده در دی — نی خشت بود بر سر خم سنگ مزار است

آن روز که از مشرق خم مست صبوحیم — روزش شمار یم اگر روز شمار است

آن را که نظر نیست بر آئینه جامش — بر آئینه دیدهٔ او نور غبار است

برخاست دل ما ز جهان تا بچه افتاد — از غرقه این بحر دو عالم بکنار است

ما دجلهٔ کشتی یاد گرفتیم ز استاد

ما را خط بغداد بداز خطهٔ بغداد

ریاضی میں اس کی ایک مفید تالیف "رسالہ اصابع" ہے،[1]

میر ملکی قزوینی، اس کا باپ میر ظہیر الدین ابراہیم قزوین کے معزز لوگوں میں سے تھا، ملکی قزوینی اکبر کے جود و سخا کی شہرت سنکر ہندوستان آیا، اور شاہی دربار سے وابستہ ہوا، اکبر کی وفات پر اس نے جو مرثیہ لکھا تھا، وہ بہت مقبول ہوا، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

دارای روزگار و مدار زمانه رفت — امروز که خدای جہان از میانه رفت

آئینه دار دیدهٔ اہل نظر گذشت — رونق فزای دفتر این کارخانه رفت

سنگی رسید و شیشهٔ اہل وفا شکست — دردا که باعث سخن عاشقانه رفت

شایستهٔ شہی و سزاوار سروری — مسند نشین انجمن اکبرانه رفت

زد سکه بر سر زر خورشید خاوری

بر چرخ برد سکهٔ اللہ اکبری

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر پھر اس کے بعد امرا میر معز الملک، نہابت خان، خان جہان

[1] فہرست کتبخانہ شاہ اودھ، اسپرنگر ص ۳۹۱،

اور رستم مرزا اسکے خوان کرم کی ریزہ چینی کرنے کے بعد پٹنہ مین شہزادہ پرویز کے سایۂ عاطفت مین پناہ لی، اور کچھ مدحیہ اشعار کے ساتھ ایک ساقی نامہ اس کی خدمت مین پیش کیا جس کو اس کی مجلس کے تمام شرکا نے بہت پسند کیا، شہزادہ نے میخانہ کے مؤلف ملا عبدالنبی قزوینی سے اس ساقی نامہ کو میخانہ مین درج کرنے کے لیے خاص طور پر فرمایش کی، اس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہون۔

ولا مژدہ کام روز نوروز ماست — مے ارغوانی دل افروز ماست
شدہ رشک جنت گلستان ما — بہشت برین گشتہ بستان ما
نخواہیم جامے بجز جام مے — بجوئیم نامے بجز نام مے
چہ مے؟ آنکہ میخانہ اش جان تو — چہ مے آنکہ ..... مستان تو
بمن دہ کہ ہم رنگ مستان شوم — چو آتش سراپا گلستان شوم[1]

خود میخانہ کا مؤلف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی بھی شہزادہ پرویز کی علم نوازی کا معترف تھا، ملا عبدالنبی ملازم تو مرزا امان اللہ امانی، مرزا نظامی اور سردار خان کے رہے لیکن وہ اپنے ولی نعمت مرزا نظامی کے قیام پٹنہ کے زمانہ مین شہزادہ پرویز کی شعر و شاعری کی مجلسون مین بھی شریک ہوتے تھے، چنانچہ اپنی تصنیف میخانہ مین شہزادہ کی جا بجا مداحی کی ہے:

شہی کز مہر او دو لہاست لبریز — پناہ بے پناہا شاہ پرویز[2]
فخر ملکان و شاہ شاہان — سلطان زمانہ شاہ پرویز[3]

ملا عبدالنبی کی سب سے اہم تصنیف میخانہ ہے جس مین شعرائے متقدمین و متاخرین کے حالات کے ساتھ ان کے ساقی نامے درج ہین، ہندوستان

---

[1] میخانہ ص ۴۴۴، [2] ص ۲۲۵، [3] ص ۴۶۳

اسکے مایہ ناز اہل علم جناب محمد شفیع صاحب (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے بڑی محنت سے اسکو اڈٹ کرکے شائع کیا ہے
ملا عبد النبی کی دو اور کتابیں بھی ہیں، ایک دستور الفصحا، جو قصہ گوئی کے آداب پر قصہ خوانوں کے لیے
ایک دستور العمل ہے، دوسری نوادر الحکایات یا بحر النوادر جس میں کچھ قصے تھے،

علما و فضلا میں مرزا عبد اللہ اور مرزا محمد قاسم گیلانی پرویز کے دربار سے وابستہ تھے،
مرزا عبد اللہ نشاپور سے ہندوستان آئے، مرزا محمد قاسم معقولات و منقولات کے عالم تھے ہندوستان
آکر پہلے عادل شاہی دربار کے امیر الامرا شاہنواز خان شیرازی کے یہاں رہے، پھر عبد الرحیم
خانخانان کی فیاضیوں سے متمتع ہوئے، شہزادہ پرویز نے بھی ان کو اپنے یہاں بلا کر رکھا، اور
ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہا[1] جہانگیر کے دربار میں بھی ملازم رہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے،

شہریار جہانگیر کا لڑکا شہزادہ شہریار بھی شاعر تھا جنگ جانشینی میں جب اس کو شکست
ہوئی، اور اس کی آنکھوں کی بصارت زائل کر دی گئی، تو قید خانہ میں اسنے اپنے حسب حال
یہ دو شعر کہے، جس سے اس واقعہ کی تاریخ بھی نکلتی ہے،

ز نرگس گلاب ار چہ نتوان کشید — کشیدند از نرگس من گلاب
چو پرسد کسے از تہ تاریخ من — بگو کور شد دیدہ آفتاب[2]

دارا شکوہ علمی حیثیت سے تیموری شہزادوں کا گل سر سبد دارا شکوہ تھا، وہ
ایک باکمال مصنف، شاعر اور خطاط تھا، اس کو شروع میں تصوف اور بعد میں ہندو
مذہب سے گہرا شغف ہو گیا تھا، نثر میں اس کی تصانیف انہی دو موضوعوں پر ہیں
ان تصانیف سے دارا شکوہ کے جن مذہبی اعتقادات اور صوفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے
ان پر بحث کرکے ہم ناظرین کو اس کی جانب سے بدظن کرنا نہیں چاہتے، بلکہ صرف اس کے

---

[1] مزید حالات کے لیے دیکھو مآثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۳۹، [2] ید بیضا، ورق ۹۱

علمی کمالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے،[1] مگر اس کی تصانیف کی تاریخ وار ترتیب سے ناظرین کو خود اندازہ ہو جائے گا، کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ خالص اسلام سے ہٹ کر عامیانہ تصوف اور پھر ہندو مذہب کی طرف مائل ہو گیا،

(١٠٤٩ھ) ١۔ سفینۃ الاولیاء دارا کی یہ پہلی تصنیف ہے کہ جو اس نے اپنی عمر کے پچیسویں سال میں لکھی، اس کتاب کے شروع میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے، اور پھر خلفائے راشدین، حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے ائمہ کے مناقب ہیں، اس کے بعد اولیاء اللہ کے احوال ہیں، جن میں قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ سلسلوں کا ذکر خاص طور پر ہے، ایک باب میں متفرق سلسلوں کے صوفیائے کرام کے بھی کچھ حالات ہیں، آخر میں ازواج مطہرات اور بنات طاہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان خواتین کا ذکر ہے، جنھوں نے راہ سلوک میں کمال حاصل کیا، یہ کتاب مختلف مطبعوں میں چھپ گئی ہے، ١٨٥٣ء میں مطبع مدر آگرہ سے ایک انگریز مسٹر بیل کے اہتمام میں جو نسخہ شائع ہوا تھا، اس کے صفحات کی تعداد ٢١٤ ہے،

دارا شکوہ، نفحات الانس، کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیاء، اور طبقات سلطانی وغیرہ جیسے تذکروں سے مطمئن نہ تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان کتابوں میں صوفیائے کرام کے حالات سلسلہ بہ سلسلہ علیحدہ علیحدہ منقول نہ تھے، اور نہ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کی تفصیل بھی اطمینان بخش تھی، اس لیے ان خامیوں کو سفینۃ الاولیاء لکھ کر پورا کیا،[2] تمام تذکروں

---

[1] دارا شکوہ کی ایک تصنیف مجمع البحرین کو پروفیسر محفوظ الحق (پریذیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کیا ہے، اور اس دیباچہ میں دارا کی تصنیفات اور تراجم پر بڑی محنت و کاوش سے ایک انگریزی مقالہ لکھا ہے، جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی سابق رفیق دار المصنفین نے بھی مقدمہ عالمگیر میں دارا کی تصانیف پر بحث کی ہے، [2] سفینۃ الاولیاء مطبع مدر آگرہ ١٨٥٣ء، دیباچہ

نے اس کو ایک مستند تذکرہ قرار دیا ہے، سفینۃ الاولیاء کی تحریر کے وقت دارا شکوہ حنفی المشرب تھا، اور تصوف میں سلسلۂ قادریہ سے متوسل تھا، مگر آگے چل کر اس کے عقائد میں اسلامی تصوف کی شان بالکل مفقود ہو گئی،

اس کتاب کے ادب وانشاء کے متعلق دارا خود لکھتا ہے:

واگرچہ عبارت این کتاب راست پراست است و در عبارت آرائی مقید نشدہ وفارسی سادہ عام فہم نوشتہ لیکن بعضے جا اقتدار بعبارت نفحات الانس قطب الاولیاء قدوۃ الاتقیاء، نیر آسمان عرفان خورشید فلک ایقان حضرت مولای نور امامت والدین عبد الرحمٰن جامی قدس سرہٗ انشاء کہ کمال فصاحت ومتانت دارد وانشاء را استاد خود می داند کردہ در زبان روزمرہ خود را نیز ترک ساختہ[1]

۲۔ سکینۃ الاولیاء۔ دارا نے یہ کتاب اپنی عمر کے اٹھائیسویں سال ۱۰۵۲ھ میں لکھی اس میں اس نے اپنے پیر لسان اللہ ملا شاہ محمد یا محمد شاہ بدخشانی اور پیر کے مرشد میاں میر (ملاجیو) کے حالات، ملفوظات، کرامات اور ان کے خاندان اور خلفاء کے احوال کی تفصیلات لکھی ہیں،

اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:

سکینۃ الاولیاء .... اور کتابوں کی طرح اولیائے حق کے معتقدوں اور مخلصوں کے لیے بطور یادگار ہے، اور معلوم ہو جائے کہ کوئی زمانہ اس عالی گروہ سے خالی نہیں رہا، اور نیز یہ کہ اس زمانے میں بھی جب کہ ۱۰۵۲ھ ہے، اس قسم کے لوگ ہیں اور تھے،[2]

---

[1] سفینۃ الاولیاء ص ۴۷ [2] مجھکو سکینۃ الاولیاء کا فارسی نسخہ نہیں مل سکا، اس کا اردو ترجمہ جو فضل الدین ملک چنن الدین کے زئی تاجران کتب قومی منزل نقشبندیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا ہے، میرے پیش نظر ہے،

دارا نے راہ سلوک کی منزلیں جسطرح طے کیں، اس کا حال اس طرح لکھتا ہے:

جمعرات کے روز جو بیس سال کی عمر میں خواب میں فرشتہ نے مجھے آواز دی اور چار مرتبہ کہا "تجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا، جو روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی"۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہوگی، اور بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ دولت بخش دے گا، ان اللہ غفور رحیم، میں ہمیشہ اس دولت عظمیٰ کا طالب رہا، یہاں تک کہ ۲۹ ماہ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ایک دوست خدا کی صحبت میں پہنچا، وہ مجھ پر نہایت مہربان ہوا، جو بات دوسرے لوگوں کو ایک مہینہ میں حاصل ہوتی تھی، وہ مجھے پہلی رات میں مل گئی، اور جو کچھ دوسرے ایک سال میں حاصل کرتے تھے، مجھے ایک مہینہ میں حاصل ہوگئی، جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہنچتا، میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بغیر ریاضت یک بارگی پہنچ گیا، دونوں جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی اور فضل ورحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے، اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا"۔ (ص ۵)

گو ہم دارا کے صوفیانہ عقائد سے بحث کرنا نہیں چاہتے، لیکن یہ کہنا نامناسب معلوم نہیں ہوتا، کہ دارا نے جس عجلت اور تیزی سے راہ سلوک کی منزلیں طے کیں، وہ ہندوستان کے صوفیائے کرام میں کسی اور نے نہیں کیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بیس سال تک اپنے مرشد کے پاس رہ کر ریاضت کی، اور برسوں سمرقند، بغداد، ہمدان، تبریز، استرآباد، سبزوار، حصار، بلخ اور ہندوستان وغیرہ کی بادیہ پیمائی کرنے کے بعد راہ سلوک کی منزلیں طے کر سکے، حضرت بختیار کاکیؒ بیس برس تک رات کو مطلق نہ سوئے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے اتنے مجاہدے کیے کہ ایک بار حضرت معین الدین چشتی ان کے حجرے میں تشریف لائے

تو وہ ضعف سے ان کی تنظیم کے لیے کھڑے نہ ہو سکے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ۳۰ سال تک جنگلوں میں عبادت کی، اس لیے دارا کا یہ لکھنا کہ اس نے یکبارگی "سب کچھ" حاصل کر لیا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

دارا کو اپنے مرشد ملا جیون سے والہانہ عقیدت تھی، وہ ایک قصبہ 'باری' میں عزلت نشین تھے، اس لیے دارا ان کو باری تعالیٰ کہتا تھا، (حسنات العارفین ص۵۳)، ملا جیون نے خواب میں اس کو مشاہدہ اور مراقبہ کرنا سکھایا اور خواب ہی میں اپنے سینہ کی امانت اس کے سینے میں منتقل کی جس کے بعد دارا شکوہ کو سلوک میں فتح پر فتح حاصل ہوئی، (ص۱۲)

ملا جیون کو بھی اپنے مرید سے غیر معمولی شیفتگی تھی، وہ اپنے "یاروں" اور "مریدوں" سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں، تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے، تو خدا سے پھر جاؤگے" (ص۱۴) (العیاذ باللہ) وہ اپنے مریدوں کو دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، (ص۱۴)

لسان اللہ شاہ محمد، دارا کے اصلی مرشد کو بھی دارا سے بڑی محبت تھی، انھوں نے اس کی شان میں ایک غزل کہی تھی، لیکن یہ اس قدر غلط اور بے معنی یا اتنی مسخ چھپی ہے کہ بالکل مہمل ہو گئی ہے، ایک شعر جس کے کچھ معنی سمجھ میں آتے ہیں، یہ ہے:-

اے سپہر علم راز نقصان دل   روز سے شو وکرتو نشوی ہمزبان دل

ملا شاہ محمد کو دارا شکوہ سے یہ امید تھی، کہ وہ ہندوستان میں طریقہ قادری کو رواج دیگا، لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی، (ص۲۳)

دارا شکوہ نے اپنے مرشد کے خوارق و کرامات کی بہت سی تفصیلات لکھی ہیں، اور ان ہی کے ذریعہ سے ان کی روحانی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، آخر میں اس کے مرشد

کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کے احوال و کرامات بھی درج ہیں ، اور اس کے بعد ملا جیو کے خلفاء کا ذکر ہے ، دارا نے ان خلفاء کے اشعار کے انتخابات بھی اس کتاب میں دیے ہیں ، کتاب میں جا بجا کشف المحجوب ، نفحات الانس ، غنیۃ الطالبین ، تفسیر عرائس ، تفسیر قشیری ، فصل الخطاب ، بحر الحقائق تفسیر حسینی ، صحیح مسلم ، مشکوٰۃ ، معجم البلدان وغیرہ کے حوالے ہیں ، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابیں دارا کے زیر مطالعہ رہیں ،

۳ ۔ رسالہ حق نما :۔ میری نظر سے نہیں گذرا ،

۴ ۔ حسنات العارفین یا شطحیات :۔ دارا اس کتاب کی تمہید میں لکھتا ہے ،

کہ "وجد و ذوق" کی حالت میں اس کے منہ سے ایسے کلمات بلند حقائق" نکل جاتے تھے ، جن کو سن کر "پست فطرت" ، "دون ہمت" اور "زاہد خشک" نے اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتاویٰ صادر کئے ، اس تکفیر سے بچنے کے لیے اس نے مذکورہ بالا کتاب تالیف کی جس میں نہ صرف صوفیائے کرام اور علمائے عظام بلکہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ایسے کلمات اور اقوال نقل کئے ہیں جو اس کے خیال میں شطحیات ہیں ، ان اقوال سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے ، کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب ایک سالک شریعت و طریقت ، کفر و ایمان ، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے ، اور بےخودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں ، جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں ، لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتے ، چنانچہ دارا یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ راہ سلوک میں ایسے ہی مقام پر پہنچ کر اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوئیں ، اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا ،

دارا نے جتنے کلمات و اقوال نقل کیے ہیں ، ان پر مفصل بحث کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ

ان کلمات کی نسبت غیر معتبر، مشکوک اور مجہول الروایت ہے، اور بعض اقوال کی تشریح و توضیح صحت سے دور ہے، مگر اس مضمون مین ہم اس قسم کی بحث سے قصداً پرہیز کرنا چاہتے ہین، اس مین شک نہین کہ بعض شطحیات ایسی ضرور ہین، جو بعض صوفیائے کرام کی زبانون سے غیر اختیاری طور پر نکلین، لیکن وہ خود کسی حال مین بھی دارا کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے، کیونکہ اسلامی تصوف شریعت کے دائرہ سے الگ نہین ہے، اور شطحیات کو علما وصوفیہ مین سے کسی نے بھی روا نہین رکھا ہے، چنانچہ ہندوستان کے اکابر مشائخ اور صوفیہ کا عمل اسی پر رہا ہے، ان کے افعال و اقوال اس کے شاہد ہین،

۵ مجمع البحرین :- یہ کتاب دارا نے اپنی عمر کے ۴۲ وین سال مین لکھی، اس مین اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتایا ہے، اور ان دونون کو ملانے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت مین لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہین، توحید کے شیدائی ان دونون مین سے جس کی بھی تقلید کرین حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہین اس کتاب کی اشاعت پر دارا کو مرتد اور ملحد قرار دیا گیا، اور آگے چل کر اس کے یہی عقائد اس کے زوال اور موت کا سبب بنے، یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی اور آخری تصنیف ہے[1]

دارا کی تصانیف یہی پانچ ہین، اس کے بعد اس نے زیادہ تر ہندو مذہب کی کتابون کے ترجمے کئے یا کرائے، ان ترجمون کی تمہید مین دارا نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حنفی المشرب اور سلسلۂ قادریہ کا پیرو ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ ہندو ہونے کی کوشش کر رہا تھا، یا کم ازکم وہ اپنے عقائد کو ایسے سانچے مین ڈھال رہا تھا، کہ ہندو اس کی طرف مائل ہو کر تخت و تاج کے حصول مین اس کے معاون اور مددگار ہون،

---

[1] پروفیسر محفوظ الحق کلکتہ نے مجمع البحرین کو بہت ہی دقت نظر کے ساتھ اڈٹ کر کے اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا ہے،

۶ ۔ سرِ اکبر :- یہ اوپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے ، جو دارا شکوہ نے ۱۰۶۷ھ میں بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا ، اس کتاب میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر دی ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ اصل قرآن مجید یہی ہے ، (نعوذ باللہ) اس کی وجہ تصنیف کے متعلق وہ خود لکھتا ہے ، (نقل کفر کفر نہ باشد)

"جب یہ فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ ۱۰۵۰ھ میں کشمیر جنت نظیر گیا تھا ، تو میں نے عنایتِ الٰہی اور اس کے فضلِ نامتناہی سے کاملوں کے کامل ، عارفوں کے خلاصہ استادوں کے استاد ، پیشواؤں کے پیشوا ، اور حقائق آگاہ کے متقدا یعنی حضرت ملا شاہ سلمہ اللہ سے سیادت اور ارادت حاصل کی ، مجھکو ہر گروہ کے عارفوں کو دیکھنے اور توحید کے متعلق عالی باتیں سننے کا ذوق تھا ، اور تصوف کی بہت سی کتابیں نظر سے گذر چکی تھیں ، اور کچھ رسالے بھی تصنیف کیے تھے ، لیکن طلب توحید میں جو ایک بحر بیکران ہے ، اور بھی تشنگی ہر وقت بڑھتی گئی ، دقیق مسائل ذہن میں آتے تھے ، جن کا حل بجز کلام الٰہی اور استاذ ذات نامتناہی کے ممکن نہ تھا ، چونکہ قرآن مجید و عظیم اور فرقان کریم کی اکثر باتیں رمزی ہیں ، اور آج کل انکے جاننے والے کم ہیں ، اس لیے میں نے چاہا کہ تمام آسمانی کتابوں کو پڑھوں ، کیونکہ کلام الٰہی اپنی تفسیر آپ ہے ، یعنی جو بات مجمل ہوگی دوسری کتابوں میں مفصل پائی جائیگی ، اس تفصیل سے اجمال معلوم ہو جائے گا ، میں نے توریت ، انجیل ، زبور اور دوسری کتابیں پڑھیں ، لیکن ان میں توحید کا بیان مجمل اور اشارات میں تھا ، اور ان آسان ترجموں سے جن کو اہل غرض نے کیا ہے تھا ، مطالب معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے اس بات کی فکر میں ہوا کہ ہندوستان وحدت عیان میں توحید کی گفتگو کیوں بہت زیادہ ہے ، اور قدیم ہند کے ظاہری اور باطنی علماء کو وحدت سے انکار اور موحدوں پر کوئی اعتراض نہیں ، بلکہ ان پر اعتبار ہے ، برخلاف اس کے جہلائے وقت

خدا شناسوں اور موحدوں کے قتل، کفر اور انکار میں مشغول ہیں، اور توحید کی تمام باتوں کو جو کلام پاک اور صحیح احادیث نبوی سے ظاہر ہیں، رد کرتے ہیں، وہ خدا کے راستے کے راہزن ہیں، ان باتوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا، کہ اس قوم قدیم (یعنی ہندوؤں) کے درمیان تمام آسمانی کتابوں سے پہلے چار آسمانی کتابیں تھیں، رگ بید، سام بید، اتھربن بید ...... اور اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ پر یہ تمام احکام نازل ہوئے، اور یہ باتیں ان کتابوں سے ظاہر ہیں ...... اور محض توحید کے اشغال اس میں درج ہیں، جس کا نام اپنکہت ہے، اس زمانہ کے انبیاء نے ان کو علیحدہ کرکے ان پر شرح وبسط کے ساتھ تفسیریں لکھی ہیں، اور ہمیشہ ان کو بہترین عبادت سمجھکر پڑھتے ہیں، اس خاکسار کی نظر چونکہ وحدت ذات کی اصل پر تھی نہ کہ عربی، سریانی، عبرانی، اور سنسکرت زبان پر، اس لیے چاہا کہ ان اپنکہت کو جو کہ توحید کا خزانہ ہے اور جس کے جاننے والے اس قوم میں بھی کم رہ گئے ہیں، فارسی زبان میں بغیر کسی کمی اور بیشی اور نفسانی غرض کے لفظ بلفظ بالمقابل ترجمہ کرکے سمجھوں کہ یہ جماعت اس کو اہل اسلام سے پوشیدہ اور پنہاں رکھتی ہے، اس کا کیا بھید ہے؟ شہر بنارس جو اس قوم کا دار العلم ہے، اور جہاں پنڈت اور سنیاسی جو کہ سرآمد وقت اور بید اور اپنکہت کے جاننے والے تھے ...... اس خاکسار سے تعلق رکھتا تھا ...... ۱۰۶۷ھ میں بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا، اور توحید کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتیں جن کا میں طلب گار رہتا، لیکن حل نہیں پاتا تھا، اس قدیم کتاب کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں، جو بلاشک وشبہ پہلی آسمانی کتاب ہے، اور بحر توحید کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے، اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے، اور صراحۃً ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بعینہٖ اس کتاب آسمانی سرچشمہ بحر توحید اور قدیم کے حق میں ہے،

انہ لقرآن کریم فی کتب مکنون لا یمسہ الا المطہرون تنزیل من رب العالمین

یعنی قرآن کریم ایسی کتاب میں ہے، جو پوشیدہ ہے، اور اس کو نہیں چھوتے ہیں، مگر وہ جو کہ پاک ہیں، وہ نازل ہوئی ہے خداوند عالم کی طرف سے متعین طور سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ آیت توریت اور انجیل کے حق میں نہیں، لفظ تنزیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے حق میں ہے، چونکہ اپنکہت کہ ایک مخفی راز ہے، اصل و اخفا ہے، اور قرآن مجید کی آیتیں بعینہٖ اس میں پائی جاتی ہیں، پس تحقیق کہ چھپی ہوئی کتاب یہی کتاب قدیم ہے، اس فقیر کا جس نے بے جانی ہوئی چیز کو جان لیا، اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا، اس ترجمہ کے کرنے میں اس کے سوا کوئی مطلب اور مقصد نہ تھا، کہ وہ اور اس کی اولاد، اس کے دوست اور حق کے طلب گار فائدہ اٹھائیں"

مولانا شبلی مرحوم نے سر اکبر کے ترجمہ کو ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کی علمی نمائش گاہ میں دیکھا تھا اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھ کر ان پر جو اثرات طاری ہوئے ان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا کہ داراشکوہ بد عقیدہ اور بد دین ہے، اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بد دینی پھیل جائے گی، عام مورخوں کا خیال ہے، کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا، دلوں کا حال خدا کو معلوم لیکن اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصاً سنن بالکل مٹ جاتے" (مقالات شبلی ج ہفتم ص ۱۰۱)

علمی حیثیت سے اس ترجمہ سے یہ فائدہ ہوا کہ برہمنوں کا علمی بخل جاتا رہا، اور اب تک ان کے جو علوم محض راز ہائے سربستہ تھے، وہ بالکل فاش ہو گئے، اور اس فارسی ترجمہ کے ترجمے یورپ کی

مختلف زبانوں میں ہوئے، اور کہا جاتا ہے کہ جو متون کو اپنشد کے راز سرِ اکبر ہی کے ذریعہ معلوم ہوئے سرِ اکبر کا ایک خوش خط قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتبخانہ میں ہے، گمان یہ ہے کہ اس نسخہ کا خط دارا شکوہ یا اس کے کسی منشی کے ہاتھ کا ہے، آخر کی عبارت یہ ہے۔

این ترجمہ اپنکہات ہر چہار وید کہ موسوم بسرِ اکبر است و تمام معرفت نور الانوار از فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ خود بعبارت راست پراست در مدت شش ماہ آخر دوشنبہ بست و ششم ماہ رمضان سنہ یکہزار و شصت و ہفت در شہر دہلی، در منزل نگمبودہ با تمام رسانیدہ از گنج معرفت بہرہ ور از ہستی موہوم خلاص گشتہ بہستی حق رسید ہر کہ این ترجمہ را بخواند و دیگر نبیند، تمام شد کتاب ترجمہ اپنکہات موافق حق پذیرفت[۱]"

۲۔ بھگوت گیتا:۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، جس کے شروع میں یہ عبارت ہے:

"گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابو الفضل علامی از کتاب مہا بھارت از فن ششم کہ آنرا بحکم پرمیشور گوبند سری کرشن جیو ارجن سنباد"

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ شیخ ابو الفضل کا کیا ہوا ہے، لیکن برٹش میوزیم کے فہرست نگار نے اس کی بقیہ عبارت اور اس ترجمہ کی عبارت میں تطبیق نہیں پائی، جو اکبر کے عہد میں کیا گیا تھا[۲]، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے، اس کے فہرست نگار نے اس نسخہ کے ترجمہ کو دارا شکوہ کی طرف منسوب کیا ہے، اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابو الفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں[۳]، لاہور سے آرٹ پیپر پر نہایت

۱؎ معارف نمبر ۶ جلد ۱۴ میں سرِ اکبر کے موضوع پر ایک بہت ہی مفصل تبصرہ شائع ہوا ہے جس کا مطالعہ ناظرین کے لیے مفید ثابت ہوگا ۲؎ برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد اول ص ۵۹ ۳؎ انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول کالم ۱۰۸۹،

عمدہ طباعت کے ساتھ ایک صاحب نے بھگوت گیتا شائع کیا ہے جس کو فیضی کا ترجمہ بتایا گیا ہے اکبری عہد کے مختلف تراجم کی فہرست معاصر تاریخون مین درج ہے، اس مین میری نظر سے کہین یہ نہیں گزرا کہ فیضی نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تھا،

انڈیا آفس کے فہرست نگار نے ایک اور کتاب نادر النکات دارا شکوہ کی طرف منسوب کی ہے، مگر اس کا نام صرف سفینۃ الاولیا کے سلسلہ مین آگیا ہے، فہرست نگار نے اس کی کوئی تفصیل نہین لکھی ہے، پروفیسر محفوظ الحق کا خیال ہے کہ یہ کتاب شاید رسالۂ حق نما یا مکالمہ بابا لال و دارا شکوہ کا دوسرا نام ہو، کیونکہ خدابخش خان لائبریری پٹنہ مین جو آخرالذکر نسخہ ہے، اسکا دوسرا نام مخزن نکات بھی ہے،

خزینۃ الاصفیا کے مصنف دارا شکوہ کے تذکرہ مین لکھتے ہین:-

از تصانیف مشہورہ دسے کتاب سفینۃ الاولیا، وسکینۃ الاولیا، وسراکبر ودیوان اکسیر اعظم ورسالہ معارف وغیرہ است"

رسالہ معارف میری نظر سے نہین گذرا، دیوان اکسیر اعظم کا ذکر آگے آئیگا،

مخزن الغرائب کے مؤلف نے اپنے دیباچہ مین ان کتابون کی فہرست دی ہے جن سے انھون نے استفادہ کیا ہے، اس فہرست مین دارا شکوہ کی بیاض کا حوالہ ان الفاظ مین دیا ہے،

"بیاض محمد دارا شکوہ ولی عہد شاہجہان بادشاہ قادری تخلص صاحب مجمع البحرین کہ باصطلاح صوفیہ ہند نوشتہ"

مگر اس بیاض کا ذکر کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہین، ورنہ اس سے دارا کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہوسکتا تھا، لیکن مخزن الغرائب کے ... دقیق النظر تذکرہ نگار کا اس بیاض سے استفادہ کرنا دارا شکوہ کے کمال شاعری کی سند ہے،

پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مجمع البحرین کے دیباچہ مین مختلف ماخذون سے دارا کی بین اور تالیفات کا ذکر کیا ہے، پیرس کے قومی کتب خانہ مین ایک مخطوطہ **نگارستان منیر** ہے جس کے آخر مین ایک مرقع کا دیباچہ ہے، کتب خانہ ہذا کے فہرست نگار کا بیان ہے کہ اس دیباچہ کی تحریر دارا شکوہ کی ہے، پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ شاید دیباچہ اس **مرقع** کا ہو جو دارا نے اپنی محبوب بیوی نادرہ بیگم کو ۱۰۵۱ھ مین بطور تحفہ دیا تھا، مخزن ستمبر ۱۹۰۶ء مین دارا کی ایک فارسی **مثنوی** اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل (جلد دوم نمبر ۱) مین دارا کی ایک **تزک** کا ذکر ہوا ہے، مگر ان کتابون کے نام کسی تذکرہ اور تاریخ مین نہین پائے جاتے،

ان تالیفات کے علاوہ حسب ذیل کتابین دارا کے قلم سے نکلی گئین،

۱۔ **مکالمۂ دارا شکوہ و بابا لال**، بابا لال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) مین تھا، میان میر کا دوست تھا، اس لیے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی، اپنی کتاب شطحیات مین بابا لال کے متعلق لکھتا ہے:

بابا لال بیراگی که در کمال عرفانست و در ہنود بعرفان و متانت وے کسے دیده نشده، مرا گفتند، در ہر قومے عارفان کامل می باشند که حق سبحانه تعالی به برکت او آن قوم را نجات می دہد، و تو منکر ہیچ قومے مباش" (ص ۲۱ مطبع مجتبائی)

مجمع البحرین مین بابا لال بیراگی کا نام مسلمان صوفیۂ کرام کے ساتھ آیا ہے، (ص ۲۶) دارا شکوہ ۱۰۶۳ھ مین قندھار کی مہم سے واپس آیا تو لاہور مین بابا لال سے ملا، اور دونون کی گفتگو سات مجلسون مین ختم ہوئی، ان مکالمون کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندر بھان برہمن نے قلمبند کر لیا تھا، مکالمے دلچسپ ہین، ان مین یہ دکھلایا گیا ہے کہ حق و صداقت کسی

ایک مذہب کی ملکیت نہیں، اب سے بہت پہلے یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے مطبع مجیب ہند دریا گنج دہلی سے چھپ گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ایک ہندو لالہ چنجی لال نے کیا ہے،

۲۔ جوگ بشست : یہ سنسکرت کی مشہور کتاب "یوگ واسی شست" کا فارسی ترجمہ ہے، جو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے ایک درباری نے ۱۰۶۶ھ میں کیا، ترجمہ کی وجہ دارا نے یہ بتائی ہے:

اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے، ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ مقبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر ان سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے، جو اونچے پر کھڑے تھے، بشسٹ تھے، اور دوسرے رام چندر ...... میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا، بشسٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا، اور فرمایا کہ اے رامچندر یہ سچا طالب ہے، اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے، اس سے بغلگیر ہو، رامچندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے، اس کے بعد بشسٹ نے رامچندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی، تاکہ مجھے کھلا دے، میں نے وہ شیرینی کھائی، اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سر نو زیادہ ہوئی، اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص مقرر اس خدمت پر ہوا، اور ہندوستان کے پنڈتوں سے ..... اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا،[۱]

اس ترجمہ کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ منہاج السالکین کے نام سے مولوی ابوالحسن صاحب نے کیا ہے، جو نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ہے، اوپر کی عبارت سے معلوم ہوگا، کہ دارا ہندوؤں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا، کہ وہ بھی رامچندر

[۱] بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیری مرتبہ نجیب اشرف ندوی رفیق دارالمصنفین،

کی طرح ایک اوتار ہے،

۳۔ **تاریخ شمشیر خانی**: یہ شاہنامہ کی گویا تلخیص ہے، جو دارا کے حکم سے کی گئی، دارا کے وسیلہ سے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے **قصص الانبیا** کا نام بھی گنایا ہے،

دارا کی علمی سرپرستی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اہل قلم اپنی کتابیں لکھ کر اس کے نام سے منسوب اور معنون کرتے تھے، نور الدین محمد بن عبد اللہ بن عین الملک نے ۱۰۶۱ھ میں طب پر ایک ضخیم کتاب لکھی، اور اس کا نام **طب دارا شکوہی** رکھا، پیرس کے قومی کتب خانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس کا نام **علاجات داراشکوہی** ہے، ابراہیم مسکین نے اپنی کتاب ترجمۂ **اقوال واسطی** میں ابوبکر بن محمد بن موسیٰ الواسطی کے اقوال کا فارسی ترجمہ کیا، اور اس کو دارا شکوہ کے نام سے معنون کیا،

دارا نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا، اس کی شاعری کی داد اس کے مرشد نے "بے نظیر" اور "دلپذیر" کہکر دی تھی،[1] کلمات الشعراء کے مصنف سرخوش نے لکھا ہے:

"طبع بلند و ذہن رسا داشت، مطالب صوفیہ در رباعی و غزل منظوم می کرد و بحسب اعتقادی کہ بسلسلۂ عالیہ قادریہ داشت، قادری تخلص می کرد .... دیوان مختصر از وجمع شدہ"

خزینۃ الاصفیا کے مصنف کا بیان ہے کہ دارا شکوہ کے دیوان کا نام **اکسیر اعظم** تھا، اور وہ اس کی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کہتے ہیں:

"سخنش دریائے توحید است کہ از زبان گوہر افشان او روان گشتہ و یا خورشید و حدانیت است کہ از افق بیان مطلع انوارش طلوع شدہ مغربی باید کہ سخنش را بفہمد و دلی باید کہ معانی آن در دی امکان پذیرد" (خزینۃ الاصفیا، ص ۱۷۵ جلد اول)

[1] سکینۃ الاولیا ص ۱۴۲

دارا کا دیوان نایاب تھا، مگر کچھ دن ہوئے کہ خان بہادر ظفر الحسن صاحب (محکمہ آثار قدیمہ) کو اس کے ایک دیوان کا نسخہ ملا ہے، موصوف نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک ماہانہ جلسہ (جولائی ۱۹۳۹ء) کے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ اس دیوان میں دارا کی ۱۳۴ غزلیں اور ۲۰ رباعیاں ہیں، اور یہ نسخہ دارا کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا، اب تک شاید اس دیوان کی طباعت نہ ہو سکی ہے، مختلف تذکروں میں ہم کو دارا کے جو جستہ جستہ اشعار ملے ہیں، ان کو ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کرتے ہیں، اس سے دارا کے ذوق شعری کا اندازہ ہوگا،

تذکرۂ سرخوش:-

ہر خم و پیچی کہ شد از تاب زلف یار شد — دام شد، زنجیر شد، تسبیح شد، زنار شد

خاطر نقاش در تصویر جسمش جمع بود — چون بزلف او رسید آخر پریشانی کشید

بشکست دل ابلہ از گردش پایم — در کار من انہم گرہی بود کہ واشد

نقد، مال باشد سرگرانی — زوزن زر فزاید بار دستار

بخیہ بر خرقہ فقر کشان — موج آب حیات را ماند

ہمہ چیز تو خوب لیک این بہ — کہ تو بیاد بہ می آئی

تا دوست رسیدیم چو از خویش گذشتیم — از خویش گذشتن چہ مبارک سفری بود

مخزن الغرائب: رباعی

معروف شدم تا کہ بعرفان گشتم — عارف شدم و ز خویش عریان گشتم

پیدا کردی مرا ولیکن من ہم — پیدا کردم ترا و قربان گشتم

دیگر

عارضت دل و جان نو مزین سازد — خار یکہ بود باشش گلشن سازد

کامل ہمہ را ز نقص بیرون آرد　　یک شمع ہزار شمع روشن سازد

حسنات العارفین مین دارا شکوہ نے شطحیات کی تائید و حمایت مین بکثرت اشعار نظمین اور رباعیان لکھی ہین، ان مین جو اشعار اور رباعیان اس نے اپنی طرف منسوب کی ہین ان کو ہم ذیل مین درج کرتے ہین، مثلاً وہ اس مضمون کو کہ ذاکر مذکور سے غافل ہو سکتا ہے، مگر اس کا غافل ہونا عوام کے غافل ہونے سے مختلف ہے، یون ادا کرتا ہے،

خوش گرچہ بیاد خود نشستن ہمہ وقت　　این قید چہ لازم است بر من ہمہ وقت

غافل شدن خلق ز حق از حق ست　　خود را تعب است یاد کردن ہمہ وقت

یا توحید کی حقیقت خود توحید کو فراموش کرنا ہے،

توحید خموشی ست و فکر است مدام　　بحث آمد و شد زدست توحید تمام

یک گفتن تو بہین قوی ثابت کرد　　توحید، دو ز نقطہ چون گیری نام

ابو عبد اللہ خفیف سے پوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے، تو فرمایا "غفلت را ہم وجود اللہ دانستن" دارا نے اس کو اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے،

ہر چند کہ خلق را گرفتہ کوبی　　غفلت شدہ است بر ہمہ مستولی

مشغول بحق ست بفہم ثابت شد　　ہر کس کہ بہر چیز کند مشغولی

جو شخص خدا کے ساتھ مشغول ہے، اس کے لیے ایمان کا سوال باقی نہین رہتا،

کافر گفتی تو از پے آزارم　　این حرمت ترا است ہمی پندارم

پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم　　من مذہب ہفتاد و دو ملت دارم

منصور نے صرف اپنے مین خدا کو دیکھا، لیکن عارف ہر چیز مین خدا دیکھتا ہے

عارف بجز و اطلاق خدائی نکند　　از ذات لطیفت خود جدائی نکند

گر بندہ کسے بود خدا او باشد	چون جملہ خدا است خود نمائی نکند

توحید علم سے حاصل نہین ہوتی ہے لکھنا اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے،

خواہی کہ شوی واصل ارباب نظر	از قال بحال بایدت کرد گذر
از گفتن توحید موحد نشوی	شیرین نشود دہان ز نام شکر

عارف کسی کی پیروی نہین کرتے ہین،

ہر دم برسد بعارفان ذوق جدید	خود مجتہد اند نے ز اہل تقلید
شیران نخورند جز شکار خود را	روباہ خورد رفتادہ لحم قدید

دنیا کی تمام چیزون کو معرفت حاصل ہے، لیکن یہ راز صرف عارف کو معلوم ہوتا ہے۔

توحید شناخت ہر کرا حالی نیست	در راہ طلب ہمت او عالی نیست
خوش آنکہ میان خویش حق را بشناخت	او در ہمہ جاست ہیچ جا خالی نیست

عرفان اپنے کو پہچاننے نہ کہ اپنے کو فنا کر دینے مین ہے۔

کے کار تو در شمار حق می آید	تا پیش تو در اعتبار حق می آید
باید کہ تو عین خویش دانی حق را	فانی شدنت چہ کار حق می آید

بر عارف اطلاق مردن جائز نیست وجہ جان بجانان پیوست آب آب شد و خاک خاک شد

ہوا ہوا و آتش آتش،

بیرون و درون کوزہ پر بود ہوا	پیچید درون کوزہ آواز و صدا
کوزہ چو شکست وگشت آواز آواز	بشکست حباب و گشت عین دریا

خدا کا نام لے کر ذکر کرنا غفلت کا باعث ہے۔

ہستی وجود خویشتن کردم رد	گر دید مساویم ہمہ نیک و بد

اکنون نتوان نام خود و نامش برد　　گرنام بگیرم ز من او می رنجد

فقیر اور عارف کا کوئی نام نہین ہوتا،

یک ذرہ ندیدیم ز خورشید سوا　　ہر قطرۂ آب ہست عین دریا

حق را بچہ نام کس نتواند خواندن　　ہر نام کہ ہست ہست از اسما خدا

دارا شاہ دلربا کو ایک رقعہ مین لکھتا ہے، کہ اس کے دل سے اسلام مجازی محو ہوگیا، اور اب کفرِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور اس کفرِ حقیقی کی قدر معلوم کرنے کے بعد وہ زنار پوش، بت پرست بلکہ خود پرست اور دیر نشین ہوگیا ہے، اور اس کے لیے کسی چیز کے اقرار و انکار کا سوال باقی نہین رہا ہے،

مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست　　بدانستے کہ دین در بت پرستی است

اگر کافر ز اسلام مجازی گشت بیزار؟　　کرا کفرِ حقیقی شد پدیدار،

درون ہر بتے جانیست پنہان　　بزیر کفر ایمانیست پنہان

تبر سازادہ دادم دل بیکبار　　مجرد گشتم از اقرار و انکار[1]

داراشکوہ نہ صرف شاعر تھا، بلکہ شاعرون کا سرپرست اور مربی تھا، میر رضی دانش مشہد سے ہندوستان آیا، تو دارا ہی کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر درجۂ عروج پر پہنچا، مراۃ الخیال کا مولف میر رضی دانش کے ذکر مین لکھتا ہے:

"از تربیت کردہ ہاے شاہ بلند اقبال سلطان داراشکوہ است وبدست یاری استعداد و پایمردی طالع بمحفل ہمایونش راہ دانست"

رضی دانش کے متعلق مخزن الغرائب مین ہے:

---

[1] رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی صفحہ ۳۲۳،

شاہزادہ داراشکوہ ...... و بیرا تہ بیت کلی فرمودہ از باعث قدر دانی شہزادہ نہایت عزت و شہرہ بلند یافت"

مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے، کہ رضی دانش کی مندرجۂ ذیل غزل پر دارا نے ایک لاکھ روپے بطور انعام دیئے[1]

موسمے آن شد کہ ابرِ تر چمن پرور شود | نکہتِ گل مایۂ شور جنون در سر شود
تاک را سیراب سازے ابرِ نیسان در بہار | قطرہ تا مے میتواند شد چرا گوہر شود
نالۂ بلبل نہان در پردۂ برگِ گل است | بید ماغم کاش ازین یک ذرہ نازک تر شود
ما بذوقِ گریۂ مستی درین بزم آمدیم | مے بدہ ساقی بقدر آنکہ چشمم تر شود
راز پوشیدن نیاید دانش از بے تابِ عشق | در میانِ انجمن پروانہ خاکستر شود

مراۃ الخیال میں ہے کہ دارا کو مطلع بہت پسند آیا، لیکن سرخوش رقمطراز ہے کہ اس کو دوسرا شعر مرغوب ہوا، چنانچہ اس شعر کو مصرع طرح بنا کر شعراء کو غزلیں لکھنے کی فرمائش کی، اس نے بھی اس پر ایک غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے،

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن | قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود[2]

داراشکوہ اپنے میر منشی چندر بھان برہمن کی نثر و نظم کی سادگی کا بھی دلدادہ تھا، اور یہ مراۃ الخیال کے مولف کے لیے باعث تعجب ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"عجب کہ شاہزادہ باآن ہمہ مستعدان کہ در عرصۂ روزگار برنگ آمیزی الفاظ آبدار صفحہ خاطرِ اربابِ دانش را چون شگفتہائے موسم بہار ہزار رنگ گلگون می ساختند خاطر مبارک بسخن سادہ اش فرود آوردہ بود، این معنی خالی از دو چیز نبودہ باشد، یا مذاق شاہزادہ

[1] مراۃ الخیال، کلکتہ ایڈیشن ص ۲۵۵ [2] سرخوش مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

یعنی طرز آشنائی داشت، یا او بہ ورطۂ بدین پایہ رسید؟

دارا شکوہ کو برہمن کا یہ شعر بہت پسند تھا،

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار　　بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

دارا شکوہ نے برہمن سے شاہجہان کے سامنے بھی یہ شعر پڑھایا، شاہجہان سنکر برافروختہ ہوا لیکن افضل خان نے اس کا غصہ سعدی کا یہ شعر پڑھ کر ٹھنڈا کیا،

خر عیسیٰ گرش بمکہ برند　　چون بیاید ہنوز خر باشد[1]

چندربھان برہمن کے علاوہ محمد علی ماہر اور بنوالی داس ولی بھی دارا شکوہ کے ساتھ کچھ دنون وابستہ رہے، محمد علی ماہر کا ذکر پہلے آچکا ہے، دارا شکوہ نے ان کو مرید خان کا خطاب دیا تھا، بنوالی داس[2] دارا کے منشیون مین سے تھا، ملا شاہ بدخشی کی صحبت مین فقر و درویشی سے متاثر ہوا، اور ترک تجرید کی زندگی اختیار کرلی، اور دارا کی ملازمت سے کنارہ کش ہوگیا، دارا نے اس کنارہ کشی کو پسند نہین کیا، اور کچھ برہم ہوا، مگر ولی نے بطور معذرت یہ رباعی لکھ بھیجی،

بشنو ز ولی وفای دنیا ای شاہ　　مغرور مشو بدولت و حشمت و جاہ

ہر چند چو ورد ہمے لنماید لکن　　آن قطرۂ شبنم است بر نوک گیاہ[3]

مگر برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست[4] سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا رباعی بنوالی داس کی تاریخی تصنیف راجاولی کے آغاز مین مرقوم ہے، یہ تاریخ راجہ جدھشٹر سے شاہجہان کے عہد تک کی ہے[5]، بنوالی داس نے کچھ مثنویان بھی لکھین، مثنوی ولی رام کا ذکر کتبخانہ شاہ اودھ کی فہرست مین ہے۔ (ص ۵۸۹)

[1] مرآۃ الخیال ص ۱۴۱، [2] روز روشن مین نوازی داس لکھا ہی مرقوم ہے بعض جگہ بندانی داس بھی ہے۔ [3] روز روشن ص ۷۱۲، [4] برٹش میوزیم کیٹیلاگ جلد دوم ص ۹۰۵،

دارا شکوہ فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا یہ فن اس نے شاہجہانی عہد کے مشہور استاد آقا عبدالرشید دیلمی سے سیکھا، اور وہ اس کا بہت ہی محنتی اور لائق شاگرد تھا، تذکرۂ خوشنویسان میں ہے،

"دارا شکوہ پسر شاہجہان بادشاہ شاگرد عبدالرشید آقاست با وجود اشتغال امور شاہزادگی و دیگر علوم، بہ عبد آقا عبدالرشید شاید کسے مثل او نوشتہ باشد"[۱]

دارا کو نستعلیق اور نسخ دونوں میں کامل مہارت تھی، پروفیسر محفوظ الحق نے اس کی خطاطی کے بہت سے نمونوں کا ذکر مجمع البحرین کے دیباچہ میں کیا ہے، مثلاً اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کلام پاک بخط نسخ کتب خانہ باغ لائبریری حیدرآباد دکن میں ہے جس کے حروف شروع سے آخر تک سنہرے ہیں، ایک مرقع مجموعہ کا نسخہ بخط نسخ اور ایک "دہ پند ارسطو" کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں محفوظ ہیں، آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کے خط کی دو کتابیں ہیں، رسالہ حکمت ارسطو اور شرح دیوان حافظ (فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول ص۳۹) ان کے علاوہ اس کی لکھی ہوئی وصلیاں مختلف جگہوں میں پائی جاتی ہیں، بعض کتابوں پر اس کے دستخط اور مختصر تحریریں ہیں، جو خطاطی کے نادر نمونے کہی جا سکتی ہیں،

سپہر شکوہ | خزینۃ الاصفیا کے مصنف کا بیان ہے کہ دارا شکوہ کے قتل کے بعد جب اس کا نو سالہ لڑکا اورنگزیب عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس بچہ کا حال پوچھا، بچے نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا،

[illegible] دل من کمتر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

عالمگیر یہ جواب پا کر رنجیدہ ہوا، اور بولا مجھ کو باپ کو مارنا اور اس کے بچے کی پرورش کرنا [illegible]

---

[۱] تذکرۂ خوشنویسان، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص۹۸

کا کام نہیں، چنانچہ اس بچہ کو مروا ڈالا،[1] خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے نو سالہ بچے کا نام نہیں لکھا ہے، مصنف موصوف کی مراد شاید سپہر شکوہ سے ہو، مگر یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ عالمگیر نے اپنے سولھویں سال جلوس ۱۰۸۳ھ میں اپنی لڑکی نواب زبدۃ النساء بیگم کو شہزادہ سپہر شکوہ کے حبالۂ عقد میں دیا تھا۔[2]

شجاع و مراد

شاہجہان کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لیے جو خونریز جنگ ہوئی، اس میں مورخین شجاع اور مراد کا عبرتناک انجام دکھانے میں اس قدر محو ہو گئے، کہ ان دونوں کے علمی فضل و کمال کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ شاہجہان کے دو لڑکے دارا اور اورنگ زیب جس تعلیم و تربیت کی بدولت آسمان علم پر مہر و ماہ بن کر چمکے، ظاہر ہے کہ اس سے شجاع اور مراد بھی ضرور فیضیاب ہوئے ہوں گے، مگر جس طرح وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے، اسی طرح ان کے علمی اوصاف بھی صفحۂ تاریخ سے گم کر دیئے گئے، لیکن ان دونوں کی علمی قابلیت ان کے رقعات سے اور ان کی علم نوازی کا حال ان کے درباری شعراء اور متوسلین سے معلوم ہو سکتا ہے، شجاع اور مراد کے رقعات مختلف کتابوں میں جستہ جستہ ملتے ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اورنگ زیب اور دارا کی طرح گو بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تو نہ تھے، پھر بھی ان کی تحریروں میں اس زمانہ کے ذوق ادب کی پوری چاشنی ضرور ہے۔

شجاع اور مراد دونوں شعراء اور ارباب کمال کے قدردان اور سرپرست تھے، ملا محمود جونپوری شاہجہانی عہد کے بہت ہی ممتاز عالم تھے، فلسفہ میں ان کی تصنیف شمس بازغہ اور معانی و بیان میں فرائد فی شرح الفوائد اب تک نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں، ۱۰۶۲ھ میں جب انکا انتقال ہوا، تو ان کے استاد مولانا محمد افضل جونپوری پر اتنا اثر ہوا کہ شاگرد کی وفات کے بعد ان کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی، اور کل چالیس روز کے بعد وہ بھی شاگرد سے جا ملے،[3] شجاع ملا محمود جونپوری

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۱۵۸ ج ۱، [2] مآثر عالمگیری اردو ترجمہ ص ۱۳۶ دار الترجمہ حیدرآباد دکن، [3] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۲۱،

کے فضل وکمال سے فیضیاب ہونا چاہتا تھا اس لیے ان کو اپنے دربار میں آنے کی ان الفاظ میں دعوت دی جس سے اس کے دل میں ان کی عزت واحترام کا اندازہ ہوتا ہے،

"افادت و افاضت پناہ فضائل وکمالات دستگاہ ملا محمود بعنایت بے نہایت خسروانی ممتاز گشتہ بداند کہ چون بیامن برکات الٰہی خاطر فیض آثر ہموارہ متوجہ آن ست کہ ارباب علم و حکمت و اصحاب دین و ملت از ملتزمان محفل فیض منزل بودہ، دقائق علمی و حکمی را بموقف عرض می رسانیدہ باشند و آنچہ بر ضمیر الہام پذیر ما کہ آئینہ صور غیبی و گنجینۂ اسرار لاریبی است پرتو انداختہ باشد، بآن جماعت می فرمودہ باشیم تا کارہا بر وفق احکام الٰہی و سنت نبوی بعمل می آمدہ باشند بنابران از روے مہربانی یاد آن دانش آگاہ حقائق انتباہ نمودہ طلب فرمودہ ایم کہ بدرقۂ الطاف سلطانی طریق سعادت پیمودہ خود را بشرف حضور پُر نور فیض سرا سر سعادت معزز گرداند بعد ازان کہ مشرف اندوز ملازمت گردد و چندے فیض ظاہر و باطن از حضور معلی برگیرد اگر خواہد بوطن معاودت نماید، او را مشمول عنایات و مورد توجہات فرمودہ رخصت انصراف ارزانی خواہیم داد، و اگر خواہش بودن درین آستان سلطنت آشیان داشتہ باشد، بنوعے کہ باطمینان دل و فراغ خاطر گذراند، در باب او توجہ مبذول خواہیم داشت، باید کہ بمجرد وصول این منشور کرامت وا فضال بے توقف روانہ عتبہ بوس گردد و در عہدہ شناسد"[1]

فارسی سخنگویوں میں شیخ منعم لاہوری[2]، اور ہندی شعرا میں چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد شجاع کے مقربین خاص میں تھے، چنتامن اپنے عہد کا بہت ہی مشہور سنسکرت کا عالم تھا، اسکی

---

[1] رقعات عالمگیری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۲۴۳ [2] ان کی شاعری کے نمونے کے لیے دیکھو مخزن الغرائب قلمی نسخہ ص ۴۰۸ دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندی کلام کا مجموعہ "کبت بچار" کے نام سے موسوم ہے، اس میں سلطان زین الدین محمد بن شاہ شجاع کی مدح میں بھی بہت سی کبتیں ہیں۔[1]

شاہزادہ مراد کا مصاحب شاعر سعید قریشی تھا، جو ملتان کا باشندہ تھا، جب مراد کو گجرات کی نظامت تفویض ہوئی تو سعید قریشی بھی اس کے ساتھ گیا، اور اپنی بذلہ سنجی، شیریں بیانی، اور شعر گوئی کی بدولت مراد کی نگاہوں پر اتنا چڑھا کہ دربار کے تمام امراء اس پر فریفتہ ہو گئے، مراۃ الخیال کا مصنف اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے،

"بیان بزرگی صوری و شرح حالت معنوی و ذکر وسعت مشرب و اظہار محاسن شیم و ابراز مکارم اخلاق و اداے کشادگی پیشانی و تقریب تعلیق وقت و تحریر استعداد سخنش زبان قلم و قلم زبان نشاید"

دوران ملازمت میں ایک روز سعید قریشی مراد کے دربار میں جانا چاہتا تو دفعتاً چیلوں نے جو یکے از چیلہ ہا بود، اندر آنے کی اجازت نہ دی، سعید قریشی نے فوراً یہ رباعی لکھ کر مراد کے پاس بھیجی:

اے شاہ جناب تو جناب اللہ است   ہر حکم تو چون حکم کتاب اللہ است

این چیلہ و بوفضل متاع درست   ابلیس بہشت نائب باب اللہ است

مراد رباعی پڑھ کر بہت محظوظ ہوا، اور سعید قریشی کو زنانخانے کے علاوہ ہر جگہ بے تکلف جانے کی اجازت دیدی،

ایک بار عید اضحی کے موقع پر مراد نے چاہا کہ خود اپنے ہاتھ سے بکرا ذبح کرے، بکرے کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا، مراد نے بکرے کی آنکھوں کو دیکھا، اس کی نظر سعید قریشی کی طرف اٹھی، سعید قریشی

[1] تذکرۃ الکرام جلد دوم ص ۴۹۳

نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ،

عید است و قربانست و من ہم تو آنم کہ قربانت شوم　　ہمچو چشم گوسپند کشتہ حیرانت شوم

ایک دفعہ عید [illegible] کے وقت جب مراد کی سواری عید گاہ جا رہی تھی، سعید قریشی مجرا کے لیے حاضر ہوا، مراد نے اس سے [illegible] کہا کہ [illegible] مراد کی تہنیت میں اس نے کچھ کہا ہے یا نہیں ، اتفاق سے سعید قریشی نے کچھ [illegible] کہ جب مراد نماز میں مشغول ہو گیا، سعید قریشی کو موقع مل گیا، اس درمیان میں اس نے ایک غزل تیار کر لی، مراد نماز پڑھ چکا تو سعید نے غزل پیش کی، مراد شراب کا بڑا دلدادہ تھا، اس غزل میں اس کی خاص رعایت رکھی ہے ،

روز عید است لب خشک تو آلود کنید　　چارۂ کار خود ای تشنہ لبان زود کنید

دیر گاہیست کہ از دیدۂ ما ن دو د [illegible]　　زود باشید بکف جام زر اندود کنید

شربت عید [illegible]　　ترش و اردی دل خستہ [illegible] کنید

[illegible]　　گر [illegible] کنید

ہست [illegible] شاہ مراد　　بہر [illegible] کہ اندیشہ [illegible] کنید

[illegible]　　[illegible] کنید

[illegible]　　[illegible] کنید[1]

شاہزادہ مراد [illegible] سعید قریشی کی اس بدیہہ گوئی پر حیرت کا اظہار کیا ، مراد کی [illegible] اس کے دربار کی رنگینیوں کی خبر شاہجہان کو پہنچی تو اس نے ایک [illegible] سعید قریشی کو [illegible] تھا، اس [illegible] قریشی کی جان کے لالے پڑ گئے [illegible]

[1] مرآۃ الخیال [illegible]

مراد کو اطلاع کیے بغیر گجرات سے نکل بھاگا، مراد کو خبر ہوئی تو اس کی جدائی گوارا نہ کر سکا اور اس کو واپس بلانے کے لیے قاصد دوڑائے، لیکن سعید قریشی نے واپس آنے کے بجائے یہ غزل معذرت میں لکھ بھیجی،[1]

مشکل بود بکوی تو دیگر نشست ما — پیچیدہ دامن لطف تو بر شکست ما

چون سبزہ در رہ تو بجز پا فتادگی — اے سرو من بگو کہ چہ آید ز دست ما

در دم کہ با رقیب تو خاطر نشان کند — جز تیر بے خطا کہ برآمد ز شست ما

دل بستہ در خیال میان بتے نبندد لعبت — سد سکندری شدہ این بند بست ما

فارغ ز دین و کفر شدہ بعد ازین سعید — ما و سر نیاز و بت خود پرست ما

سلطان محمد | اورنگزیب عالمگیر کا سب سے بڑا لڑکا اور نواب بائی کے بطن سے تھا، اورنگزیب ایک شفیق اور دور اندیش باپ کی طرح اپنے لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا کہ اس کے بعد اس کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا جانشین لائق اور ہوشمند شخص ہو، مگر اس کی یہ کوشش بار آور نہیں ہوئی، سلطان محمد کو مختلف اوقات میں سفر و حضر کی حالت میں سونے جاگنے، نہانے دھونے، کھانے پینے، اور نماز و وظائف میں مشغول ہونے، لکھنے پڑھنے اور شکار کھیلنے دربار منعقد کرنے یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے، امراء سے ملنے جلنے اور فوجوں کے معائنہ کرنے وغیرہ کا لائحہ عمل لکھتا رہتا تھا، اس میں خاص اوقات میں کلام پاک کی تلاوت اور عربی زبان کے مطالعہ کی بھی تاکید ہے، مگر سلطان محمد کو تعلیم سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی، اس لیے اورنگزیب کبیدہ خاطر ہو کر اس کو لکھتا ہے:-

"ما ازین کہ ایشان را پیش انداختہ در خدمت خود بشکار بردہ ایم تاسف داریم چہ

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۶۳،

چہ آن بلند اقبال تا لذت شکار یافتہ اند، از اکتساب کمالات از خواندن و نوشتن و مانند آن دست باز داشتہ، چندان رغبتے باین امور ندارند ایشان را چون خواہم گذاشت کہ بدین شغل از کسب کمال باز مانند"

سلطان محمد کو اورنگزیب کی خاص ہدایت تھی کہ وہ ترکی زبان سیکھ کر اس مین بول چال کی مہارت پیدا کرے، مغل فوج مین ترکی النسل سپاہی اور افسرون کی تعداد کافی ہوتی تھی، اس لیے اس سے براہ راست تعلق رکھنے کے لیے ترکی زبان کا سیکھنا تیموری شاہزادون کے لیے ضروری تھا، مگر سلطان محمد کو اس زبان سے رغبت نہ تھی، چنانچہ جب وہ شمالی ہند کی ایک مہم پر روانہ ہوا تو ترکی کے استاد کو ساتھ نہ لے گیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا، اس نے غصہ کی حالت مین ایک خط لکھا، کہ استاد کو اپنے پاس بلا کر ترکی مین گفتگو کرنے کی مشق جاری رکھے، سلطان محمد نے اپنے استاد کی پیری و ناتوانی کا عذر کر کے اس سے اغماض کرنے کی کوشش کی، مگر اورنگزیب نے قبول نہ کیا، اور دوبارہ ایک غضب آلود رقعہ لکھا،

"پیری و ناتوانی او عذر نمی شود، و اگر باشد، عذر بے فراست، آن جوان بخت در حضر نیز او را معدوم انگاشتہ و این خیال کہ او نوکر است و مبلغہا در وجہ مواجب از سرکار زائد یافتہ اصلا التفاتے بخواندن ترکی نداشتند و بہ تہیئت عالی از تعین معلمان کسب کمالات ایشان است و الا این ہمہ منزلت آن مردم چرا باید کشید؟ ہرگاہ آن والا گہر قدر این عواطف ندانستہ و فرصت را مغتنم نداشتہ در تحصیل امورے کہ سبب آراستگی و کمال نفس انسانیت ابنائے سلاطین را پیرایہ خوشتر از آن نیست رغبتے نمی نمایند، مارا چہ زیان، الحال کہ بہوش آمدہ اند و نیک را از بد می شناسند، و آنچہ بہبود ایشان باشد خود آگاہی نخواہند نمود"

اورنگزیب سلطان محمد کو فارسی تحریر و تقریر مین ہموار و پاکیزہ گفتگو کی بھی برابر ہدایت کرتا رہتا تھا

اور اس کیلئے خاص خاص کتابوں خصوصاً اکبرنامہ کے مطالعہ کی تاکید کرتا تھا، ایک رقعہ میں ہے،

"اگر در نوشتن احتیاط نمود و عبارت مطابق آداب و قاعدہ نباشد جاے انفعال است

در اوقات فرصت بمطالعۂ کتب نیز علی الخصوص اکبرنامہ پرداختہ از مشق انشار غافل نہ گردند،

و ہمگی جہد مصروف آن سازند کہ تقریر و تحریر پاکیزہ و پسندیدہ شود تا معانی الفاظ

و ربط مناسب آن بواقعی خاطرنشان نہ گردد، در گفتن و نوشتن بکار نبرند و ہر چہ بگویند و

بنویسند باید کہ فہمیدہ و سنجیدہ باشد"

چنانچہ سلطان محمد نے اکبرنامہ کا مطالعہ شروع کیا اور جب اورنگزیب کو خط لکھا تو اکبرنامہ کے مصنف کی تقلید میں "بسم اللہ" کے بجائے "اللہ اکبر" اور "جل جلالہ" تحریر کیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا تو اس نے تنبیہ کی،

"مقصود از خواندن اکبرنامۂ شیخ ابوالفضل تتبع عبارت آن کتاب است نہ اتباع مذہب

مصنف کہ از روے بدعت اسلوب سنن را تغیر دادہ ...."

اسی طرح سلطان محمد نے اکبرنامہ کی تقلید میں اپنے عریضہ کو "نشان والا" اور مہر کو "مہر خاص" لکھا تھا، اورنگزیب نے اس پر بھی فہمائش کی، کہ یہ الفاظ شاہی رقعہ اور مہر کے لیے خاص ہونے چاہئیں،

ایک بار سلطان محمد نے اورنگزیب کو لاپروائی میں خراب کاغذ پر بُرے مسطر میں رقعہ لکھ دیا، اورنگزیب نے اس کو ڈانٹ کر لکھا،

"ہر چہ بنویسند درست نگاہ داشتہ بر کاغذ نفیس بہ اوقات نوشتہ باشند بے پروائی

حسن خط را بہم نزنند"

مگر افسوس ہے کہ اورنگزیب کی یہ ساری تربیت رائیگاں گئی، اور سلطان محمد عنفوان شباب

ہی میں دنیا سے چل بسا،

محمد اعظم شاہ یہ عالمگیر کا منجھلا لڑکا بائی اودے پوری کے بطن سے تھا، اور شہزادوں کی طرح اس کی بھی اعلیٰ تعلیم ہوئی، مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس کے علم و فضل کی تعریف کی ہے، اس زمانہ کے بعض مشہور شعراء مرزا عبدالقادر بیدل، محمد حسین شہرت، امیر محمد شمید، تربات، راسخ، اور حاجی اسلم سالم کی صحبت میں شریک رہنے کی وجہ سے خود بھی کبھی کبھی شعر موزوں کر لیتا تھا، اس کی ایک رباعی ہے،

قدر سخن از دو عالم بیش است | باخیل خیال باد شہ درویش است
چوں مصرع شوخ نیست فرزند عزیز | یک معنی بیگانہ بہ از صد خویش است[1]

اکبر و کام بخش شاہزادہ اکبر ملکہ دلرس بانو کے بطن سے تھا، ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں کے خلاف جنگ میں مشغول تھا کہ ان کے ورغلانے پر باپ سے منحرف ہو کر باغی ہو گیا، اور جب اس کی بغاوت ناکام رہی تو ہندوستان سے بھاگ کر ایران چلا گیا، اور وہاں ۱۱۱۸ھ جلوس عالمگیری میں فوت ہوا، عالمگیر اس کی دو باتوں کا مداح تھا، ایک یہ کہ اس نے نماز باجماعت کبھی قضا نہیں کی، دوسرے مذہب کا اتنا دلدادہ تھا کہ مذہبی جوش میں مخالفین ملت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا[2]،

کام بخش اودے پوری کے بطن سے تھا، عالمگیر کے ۳۰ ویں سال جلوس میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، عالمگیر نے اس خوشی میں اس کو خلعت دو اسپ با ساز طلاء، دسر پیچ مرصع و مالائے مروارید و سپر با گل مرصع و ترکش با کمان عطا کیے[3]، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے، کہ تحصیل علوم میں اپنے تمام بھائیوں پر سبقت لے گیا تھا، اس کو ترکی زبان میں خاص مہارت حاصل تھی، اور مختلف اقسام کے خطوط کی کتابت میں استاذ زمانہ تھا[4]،

---

[1] تذکرہ روز روشن ص ۵۵ [2] مآثر عالمگیری دار الترجمہ عثمانیہ ص ۹۳ [3] ایضاً ص ۱۰۸ [4] ایضاً ص ۴۹۳

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی تاریخ جنگ وجدل اور انتشار و اختلال کی ایک داستان ہے، مؤرخین اس دور کے خون آشام واقعات کو قلمبند کرنے میں ایسا محو ہوگئے، کہ ان کی ساری توجہ بادشاہ وقت اور امرا کی سیاست اور ریشہ دوانیوں میں الجھ کر رہ گئی، اس لئے شاہزادوں کے علمی حالات پر تاریکی کے پردے پڑ گئے، حالانکہ اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان کے بارے میں عام طور سے مشہور ہے، کہ جب اس نے اشوک کے دارالسلطنت پاٹلی پتر یا شہر پٹنہ کو عظیم آباد کے نام سے مستقر حکومت بنایا تو وہ شاہجہان آباد دہلی ہی کی طرح سیاسی اور علمی حیثیت سے نمایاں ہوگیا، مگر اس زمانہ کی علمی مجلسوں کے غلغلے مستند متداول تاریخوں میں بلند نہیں ہوئے، اس لیے شہزادہ عظیم الشان کے علمی کارناموں پر اعتبار و وثوق کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جاسکتی،

آخری شاہان تیموریہ سے اکبری جاہ وجلال، شاہجہانی سطوت و شہامت، اور عالمگیری تدبیر و ہوشمندی رخصت ہوچکی تھی، اسی کے ساتھ وہ اپنی زبان بھی کھو بیٹھے تھے، محمد شاہ کے زمانہ سے دربار میں عام چرچا اردو زبان ہی کا رہنے لگا، اور زمانہ کے عام مذاق کے مطابق دربار کے شہزادے اسی زبان میں غزل گوئی کی مشق کرنے لگے، غزل گو شہزادوں کی تعداد بہت ہے، لیکن ہم مثال کے طور پر صرف دو چار ایسے شہزادوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کی سخنگوئی اور علم نوازی کا حال بعض مستند تذکرہ نویسوں نے بھی لکھا ہے، لیکن ان کے علمی ذوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک ایسے باکمال شہزادہ کا ذکر ضروری ہے، جو اگرچہ تخت و تاج کے وارثوں میں نہ تھا لیکن علمی حیثیت سے تیموری خاندان کا نہایت ممتاز شہزادہ تھا،

مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی

یہ مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی ہے، یہ شاہ عالم بادشاہ کا ہم جد اور اورنگزیب عالمگیر کی پوتی نواب عفت آرا

بیگم کا نواسہ تھا، ۱۱۶۳ھ میں قلعۂ معلی دہلی میں پیدا ہوا، اور وہیں تعلیم و تربیت پائی، یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، بادشاہ وقت اور شہزادے ایک غیر اسلامی حکومت کے وظیفہ خوار اور نظربند ہو کر رہ گئے تھے، اظفری بھی قلعۂ معلی دہلی میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا، مگر کچھ عرصہ کے بعد خفیہ طور سے وہاں سے فرار ہو گیا، اور جے پور، جودھپور وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا، نواب آصف الدولہ نے اس کی پذیرائی کی، اظفری لکھنؤ میں سات سال تک رہا، وہاں سے مدراس پہنچا، اور وہیں ۱۲۳۴ھ میں سپرد خاک ہوا۔

اظفری کو عربی فارسی اردو اور ترکی چاروں زبانوں میں مہارت تھی، آخر عمر میں مدراس پہنچ کر انگریزی بھی سیکھ لی تھی، مختلف علوم و فنون مثلاً طب، رمل، عروض، قافیہ اور خصوصاً فن شاعری میں دسترس رکھتا تھا، فارسی اردو اور ترکی میں صاحب دیوان بھی تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کا فارسی اور ترکی دیوان مفقود ہے، اس کا اردو دیوان مدراس یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والا ہے، یہ سطور لکھتے وقت اس کی ایک کتاب واقعات اظفری پیش نظر ہے، جس کا اردو ترجمہ مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، اس میں اظفری نے اپنے سفر کے علاوہ قلعۂ معلی کے بہت سے حالات لکھے ہیں، اس لئے یہ کتاب تاریخی اور جغرافی حیثیت سے بھی اہم ہے، اس میں شاہ عالم کے زمانہ کے بہت سے ایسے حالات درج ہیں، جو عام سیاسی تاریخوں میں نہیں ملتے، نظربند شہزادوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، جاہ و حشم اور عملیات کے متعلق بھی بہت سے معلومات ہیں، پھر قلعہ سے فرار ہونے کے بعد اس نے جن جن مقامات کی سیر کی، وہاں کی عجیب عجیب چیزوں، رسم و رواج اور معتقدات کا بھی ذکر کیا ہے، آخر میں اپنی تصنیفات و تالیفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

اپنے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں میں نے ایک سال کے اندر ایک ترکی چغتائی لغت کی

کتاب تالیف کی جس میں قدیم مؤلفین کے طرز کے خلاف تفصیل کے ساتھ آسان طریقے پر نئے نئے فوائد لکھے ہیں ۔

ایک مہینہ میں نسخہ "محبوب القلوب" کا مقفیٰ نثر میں فارسی زبان میں ترجمہ اور کچھ اس پر اضافہ کیا ہے، اصل کتاب میر نظام الدین علی شیر متخلص بہ نوائی کی تصنیف اور ترکی زبان میں ہے ۔

ایک ہفتہ میں "نصاب ترکی" "صنعت مقلوبات میں مرتب کیں، جس میں دو سو بیس شعر ہیں، تین روز میں امیر خسرو کی "خالق باری" کے جواب میں اسی وزن پر ایک مختصر رسالہ ترکی اور ہندی زبان میں مرتب کیا ۔ اس میں ساڑھے چھ سو شعر ہیں، اور اسکا نام میں نے تنگری تار رکھا ہے ۔

حکیم حسین رضا خان کی استدعا پر جو ہماری سرکار کے ملازم ہیں، چند ہفتوں کے اندر بقراط کے "رسالہ قبریہ" کا فارسی میں ترجمہ کیا پھر اسے نظم کا لباس پہنایا، یہ رسالہ عربی زبان میں مریضوں کی ردی علامتوں کے بیان میں ہے ۔

اس کے بعد نسخہ "سانحات" کی تالیف میں مشغول ہوا جس میں میری اکثر تصنیفیں تنبیہیں مذکور ہیں، اب تک اس میں ایک سو نو سانحے درج ہو چکے ہیں ۔

جس وقت میں عظیم آباد پہنچا تو رائے ٹیکا رام کی خواہش پر سات دن کے اندر ایک اور کتاب "نصاب ترکی چغتائی" تصنیف کی جس میں چار سو باون اشعار ہیں، رائے ٹیکا رام ہمارا موروثی خانہ زاد ہماری سرکار کا بخشی ۔۔۔۔۔۔ ہے ۔

جب میں مقصود آباد میں وارد ہوا تو ۔۔۔۔۔۔ مرزا جان ٹپش کی خواہش پر اپنے واقعات کی تالیف شروع کی (واقعات اظفری مراد ہے)

مرزا جہاندار شاہ | شاہ عالم ثانی کے جن لڑکوں نے باپ سے شعر و شاعری کا ذوق ورثہ میں پایا، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

مرزا جہاندار شاہ، مرزا احسن بخت، مرزا سلیمان شکوہ (مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ)

شاہ عالم نے مرزا جہاندار شاہ کو ولی عہد بنایا تھا، مگر اس نے عالم شباب میں سفر آخرت کیا، واقعات اظفری، طبقات الشعراء، مجموعۂ نغز، تذکرۂ ہندی اور گلزار ابراہیم اور گلشن بے خار میں اس شاہزادہ کا ذکر شاعروں کی فہرست میں اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے، واقعات اظفری کے مصنف کا بیان ہے کہ شاہزادہ جہاندار شاہ بہت بذلہ سنج، ظریف اور شوخ طبع تھا، اس کے اردو اشعار میں بڑی شوخی تھی، موسیقی سے بھی ذوق رکھتا تھا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں جہاندار تخلص کرتا تھا،

طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق سنبھلی میں ہے،

جوانی بود مجمع قابلیت ...... جدت ذہن وجودت طبع وفہم رسا وفکر بجا داشت واشعار فارسی وہندی ہر دو را موزون می ساخت"

قدرت اللہ قاسم نے اس کو "شیریں گفتار" لکھا ہے، گلزار ابراہیم کے مصنف نے اس کچھ دو سخا کے بیان میں بڑی نرم زبانی دکھائی ہے، یہ شاہزادہ ۱۱۹۸ھ میں دہلی سے لکھنؤ آیا اور یہاں آکر اس نے جو علمی بزم سجائی اس کا حال گلزار ابراہیم میں اس طرح ہے:

اس شاہزادہ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر راغب تھی کہ مہینے میں دو مرتبہ مشاعرہ کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی، شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیجکر مشاعرے کے دن بلواتے اور ہر ایک سے نہایت التفات اور عنایت کے ساتھ گرمجوشی فرماتے، چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہہ بھیجا کہ

کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، از بس کہ ان صحبتون مین مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی مین حاضر ہون اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض مین بوؤن، پذیرانہ ہوا، اور پھر چوبدار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر ہونا مشاعرے مین نہایت ضروری ہے، مناظرہ کا مطلق ہمارے یہان نہین دستور ہے، غرض ایا سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل ہوا، مکرر غزلین اس دن از راہ تفضلات کے پڑھوائین، اور ہر شعر پر کیا کہون کہ کیا کیا عنایتیں فرمائین، پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو مورد عنایت و امداد فرمایا۔[1]

اس شہزادہ کا انتقال ۱۲۰۱ھ مین بمقام بنارس ہوا، مختلف تذکرون مین اس کے اشعار منقول ہین، نمونہ کے طور پر ہم یہان اس کے کچھ اشعار درج کرتے ہین،

واقعات اظفری:-

تری جب سے الفت کے پالے پڑے ہین ۔۔۔ ہمین اپنے جینے کے لالے پڑے ہین
پھرے ڈھونڈتے پا برہنہ تجھے ۔۔۔ یہانتک کہ پاؤن مین چھالے پڑے ہین

فارسی کلام

فتادہ مشکل دیگر ز عشق جان مرا ۔۔۔ کہ کس نمی شنود شرح داستان مرا
فزودہ ایم بغرورت ز غرض بیتابی ۔۔۔ بازین گناہ برآرد کسے زبان مرا
دلم ز سینہ برآرید و پیش او ببرید ۔۔۔ ز نام یار رسانید این پیام مرا

---

[1] گلزار ابراہیم، انجمن ترقی اردو صفہ ۹۔ گلشن بے خار مین اس شہزادہ کے متعلق یہ الفاظ ہین:-
"بفہم و فراست و عقل و کیاست ممتاز اقران و امثال خود بودہ"

طبقات الشعراء :-

زلف آشفتہ جو رخ پہ صنم رکھتے ہین | روز اور شب کو باعجاز ہم رکھتے ہین
میرا دل اشکبار بھی کچھ گل سے کم نہین | منظور ہو جو گوشہ دستار کے لیے
بجز حبیب آستین نہین مونس جہان مین کوئی | دیکھا تو اپنے دیدۂ خونبار کے لیے
اس زلف عقدہ گیر کا کیا ذکر لے صنم | بس ہے جہان کے سبحہ و زنار کے لیے

گلزار ابراہیم مین ہے :-

نہ پوچھو دہر مین کیا کرچلے ہم | اسی ہی آرزو مین مرچلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے مین | بسان شمع رو رو کر چلے ہم

تذکرہ ہندی :

کونسی بات تری ہم سے اٹھائی نہ گئی | پر جفا جو یہ تری قت کی لڑائی نہ گئی
قصہ ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے | وضع نالہ کی مرے اس سے اڑائی نہ گئی
بیمار عشق اتنک جا نبر بھی کوئی ہوا ہے | تو اسے طبیب ناحق میری دوا کرے ہے
پہچانا نہ گیا تو آگے غنا ہے اسے جاندار | دیتا تو ہے دل اس کو لیکن برا کرے ہے
کون دلکش ہے لے جاندار آج گذرا باغ مین | ہاتھ مین ہر شاخ گل کے مے کا پیالہ دیکھنا

مرزا احسن بخت قدرت اللہ شوق سنبھلی نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء مین شہزادہ کا ذکر ان الفاظ مین کیا ہے :

ازراہ قابلیت ذاتی برائے تفنن طبع گاہے متوجہ فن شعر می شود و سال و آن غزل فارسی و ہندی ہم می رساند این چند ابیات آن احسن بخت کہ بزبانی بعضے منقول و منصب ایران او بسمع رسید تحریر می آید اگرچہ نو مشق است فاما ذہن صاحب فکر

مناسبت دارد "

اس کے بعض اشعار یہ ہین :-

فرقت مین اسکی یارب کھنچین ہم آہ کب تک | آنکھین تو تھک گئی ہین دیکھینگے راہ کب تک
یاد ہے گلعذار کی صورت | گل سے ہے نظرون مین خار کی صورت
کیا قیامت ہوا سکی نوک مژہ | خنجر آبدار کی صورت

مرزا سلیمان شکوہ | شعراون کے آخر زمانہ مین مرزا سلیمان شکوہ کا نام علمی حیثیت سے بہت نمایان ہے۔ اس شہزادہ کے متعلق قدرت اللہ شوق کا بیان ہے،

"فرزن قابلیت وعلم ومعدن وانسانیت وعلم .... از بسکہ جودت طبع وحدت ذہن بسیار دارد، از راہ قابلیت ذاتی گاہے متوجہ فن شعر می شود وغزل فارسی وہندوی ہم می رساند واکثر درخدمت او مشاعرہ شعرا می شود،

گلشن بے خار مین ہے :-

مرزا سلیمان شکوہ .... مدتے جلوہ فرمائے لکھنؤ بود، اکثر شعرائے آنجا از خوان نعمتش بہرہ ور وکامیاب بودند۔ چند سال است کہ دہلی وارد شدہ بود، الحال تربیت شعرائے مستقر الخلافۃ اکبرآباد است" (ص ۱۴۶، مطبع دہلی اردو اخبار پریس)،

سلیمان شکوہ نے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ مین جو علمی مجلس آراستہ کی تھی، آزاد نے اسکی تصویر اس طرح دکھائی ہے،

"مرزا سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے تھے ،...... شاعر بھی تھے، چنانچہ عام اہل دہلی کے علاوہ شعراء کا مجمع دونون وقت ان کے ہان رہتا تھا، سودا، میر ضاحک، میر سوز وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا، مصحفی، جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعرون اور شعر فہمون کے

جلسے رہتے تھے، جو محفل اپنے گلشن فصاحت کے گلدستون سے سجائی جاتے وہان کی رنگینیان کیا کچھ ہون گی، جی چاہتا تھا کہ ان کی باتون سے گلزار کھلا دون، مگر اکثر پھول ایسے فحش کے کانٹون مین الجھے ہوئے ہین کہ کاغذ کے پرزے ہوتے جاتے ہین، اس لیے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، جب سید انشا پہنچے، تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا، بزرگون سے سنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور اکثر غزلین بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی یا کہی ہوئی ہین،

فحش کانٹون سے مراد شاید سلیمان شکوہ کے دربار کے اہل علم اور شعرا کا حسد اور رشک و رقابت ہو، مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) تذکرۂ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی کے مقدمہ مین رقمطراز ہین:—

دلی کے شہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اس زمانہ مین لکھنؤ مین تھے، صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی، اور سارا ٹھاٹھ وہی قائم کر رکھا تھا، دلی سے جو جاتا پہلے ان کی سرکار مین اپنا ٹھکانا ڈھونڈتا، شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے، اور شعرا اور اہل کمال کے قدردان تھے، انشا، جرأت، سوز، مصحفی وغیرہ انھی کے دربار مین ملازم تھے، یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے، بارہ سو سات آٹھ ہجری مین مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار مین داخل ہوئے، ہمارے درباروں مین حسد و رشک، رقابت و غمازی اور سازو باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے ....

انشا، جرأت، اور مصحفی خواجہ تاش او ر ہم پیشہ تھے، اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد مین بڑھتے بڑھتے جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی، .... غرض ایک ہنگامہ برپا

ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم ...... بھی لینے لگے، اور شہر والون کو ایک دل لگی ہاتھ آ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ انشا، اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے، اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی، صاحب عالم کی نظرین ان کی طرف سے پھر گئین۔"

طبقات الشعرا مین مرزا سلیمان کے اشعار کے جو نمونے ہین ان مین سے بعض یہ ہین:

کس سے سلیمان پوچھے اس کے مکان کا پتا | واقف حال کب کوئی اسکے ہے بود و باش سے

وفور اشک سے کیونکر ہو اپنی چشم تر خالی | جو دریا جوش سے بہتا ہے سو ہوتا ہے کم خالی

بھرا آتا ہے دل جب دیکھتے ہین شکل سائل کی | نہین ہوتا ہے ظرف ہمت اہل کرم خالی

تاج شہی کا وارث تو کیون نہ ہو سلیمان | تیمور کا تو پوتا عباس کا نواسا

گلشن بے خزان مین ہے:-

جنازہ تیرے دیوانے کا اس توقیر سے اٹھا | کہ شور نالہ ہر یک خانۂ زنجیر سے اٹھا

گالیان سیکڑون ہر بات مین اٹھنے لگے | دیکھو جھڑتے ہین کیا منہ سے مرے یار کے پھول

مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ | یہ بھی شاہ عالم کا لڑکا تھا، شاعری مین قمر تخلص رکھتا تھا، [illegible]

شوق سنبھلی کا بیان ہے:

"جوانے بود وجیہہ جمیع قابلیت و نیز عالی حوصلہ و خوش سلیقہ قدردان انسان کامل بسیار قابل و خوش تلاش و خوش فکر بود، قاما اجلش مہلت نداد"

واقعات اظفری مین ہے:

"ہر علم و فن خاصکر خوشنویسی اور آداب و حکمت مین سارے تیموری خاندان مین منتخب تھے، آہ کہ پچیس سال کی عمر مین بعارضہ سرسام دنیا سے چل بسے۔" (۱۹۵)

اس کے بعض اشعار یہ ہین:

نہ ہوتا آفتاب عشق کا جلوہ اگر پیدا — تو کب ہوتا شب تاریک سے نور سحر پیدا
جلا مت استخوان میری تجھے اے عشق کہتا ہوں — ہوا ہے اس نیستان بیچ دل سا شیر نر پیدا
قمر اس بت نے جب سے صندلی پوشاک پہنی ہے — ہوا ہے ایک عالم کو تب ہی سے درد سر پیدا

کوئی سینے پہ نہ آیا مجرموں کے غیر صبر — مفت میزان ستم میں ہم گئے قاتل کو تل
اے قمر دلگیر مت ہو کھول دینگے آن میں — حضرت مشکل کشا عقدے تری مشکل کی کل

بہادر شاہ کے زمانہ میں قلعہ معلی شعر و شاعری کا گہوارہ تھا، جیسا کہ "آخری شاہان تیموریہ کے ذکر" کے سلسلہ میں اوپر بیان کیا جا چکا ہے قلعہ معلی کے شہزادوں میں شاید ہی کوئی ایسا شہزادہ ہوگا جس کو شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رہا ہو، اور وہ مشاعروں میں حصہ نہ لیتا رہا ہو، لیکن اس کی تفصیلات طویل بھی ہیں، اور اردو کی بعض مطبوعہ کتابوں میں ان کے جستہ جستہ حالات بھی ملتے ہیں، اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں،

شہزادیاں

ہندوستان کے شاہان تیموری کی علم دوستی اور حسن مذاق کا یہ نمایاں ثبوت ہے کہ جہاں انھوں نے حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے اور ملک داری کے لیے اپنے شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا، وہاں انھوں نے شہزادیوں کو بھی اس سے محروم نہ رکھا، اور نہ صرف ان کے درباروں میں علم و فن کی مجلسیں قائم تھیں، بلکہ ان کے خلوت کدوں میں بھی علم و ادب کی بزم آراستہ تھی، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فتوحات کی معرکہ آرائیوں اور جنگ جانشینی کی خون آشامیوں کے باوجود تیموریوں نے جلوت اور خلوت دونوں کو علم و ہنر کی شمع سے منور رکھا، چنانچہ علمی حیثیت سے تیموری شاہزادوں کے ساتھ ایسی تیموری شاہزادیاں بھی ملتی ہیں، جن کی ذات پر ارباب علم و فضل کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے،

گلبدن بیگم

تیموری شاہزادیوں کی علمی بزم میں سب سے پہلے گلبدن بیگم پر نظر پڑتی ہے جو بابر کی بیٹی تھی، بابر کے لڑکوں میں ہمایون کامران، ہندال اور عسکری نے میراث میں علم، ادب، شعر و شاعری کا ذوق پایا، اسی دودمان فضل و کمال کے گہوارہ میں گلبدن بیگم نے بھی پرورش پائی اور اپنی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کی قابل قدر انشا پرداز اور شاعر ہوئی، فارسی زبان میں اس کی ایک مستقل تصنیف ہمایون نامہ ہے، جو اپنے طرز انشاء کے لیے ایک بے مثل کتاب اور بابر و ہمایون کے عہد کے تمدنی، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لیے ایک قیمتی ماخذ ہے،

یہ کتاب دراصل اکبر کے حکم سے اکبرنامہ کی ترتیب و تدوین کے وقت بابر اور ہمایون کے

متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک اہم تاریخی تصنیف ہوگئی، یہ کتاب عرصہ تک پردۂ گمنامی میں پڑی تھی، لیکن انگلستان کی ایک علم دوست خاتون نے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، اور اس کو بڑی محنت و کاوش سے اڈٹ کر کے ۱۹۰۲ء میں لندن سے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں خاتون مذکورہ نے گلبدن بیگم کی مفصل سوانح عمری لکھی اور کتاب میں بیگمات کے جتنے نام آئے ہیں، ان سب کے بھی حالات قلمبند کیے، اس کے علاوہ جابجا جو ترکی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان کی تحقیق کی، اور پھر فارسی متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر مولانا شبلی مرحوم کو بڑی خوشی ہوئی تھی، اور اس پر الندوہ جلد نمبر میں ایک مفصل ریویو لکھا تھا جس سے بہتر ریویو آج بھی کوئی اہل قلم نہیں لکھ سکتا ہے۔ مولانا مرحوم نے اس کتاب کی جو خصوصیات اور خوبیاں بتائی ہیں، ہم اس مضمون میں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ایک عدیم المثال ادیب اور مورخ کی تحریر کی روشنی میں اس کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

اس کتاب کی انشا پردازی کے متعلق مولانا مرحوم رقمطراز ہیں،

"فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا نمونہ ہے تو وہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور نعمت خان ان پر نثار کر دیے جائیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ کی عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کر دیتی ہے۔"

عبارت کی سادگی اور طرز ادا کے بے ساختہ ہونے کی مثالیں بکثرت ہیں ہم طوالت کے

خیال سے ان کو یہاں پر نقل نہیں کرتے، مولانا شبلی نے نمونے کے طور پر چند اقتباسات پیش کیے ہیں، جو مقالات شبلی جلد چہارم میں پڑھے جا سکتے ہیں، البتہ مولانا مرحوم نے جو روزمرہ کے محاورے کتاب سے چن کر جمع کیے ہیں، ان میں سے بعض ملاحظہ ہوں:

پائے می داد (ہار جاتا تھا)، طرفگیہا می کرد (شوخیاں کرتا تھا)، بیا ئید تا یکدیگرم را دریا بیم (آؤ گلے لگیں)، خفتن شد (سونے کا وقت آیا) سر حضرت شوم (آپ پر قربان ہوں) رستا ئی گری (گنوارپن) وغیرہ وغیرہ، مولانا شبلی کا بیان ہے کہ اس قسم کی روزمرہ کی زبان اس عہد کی تصنیفات میں بہت کم ملے گی،

مولانا شبلی رقمطراز ہیں کہ تاریخی حیثیت سے اس کتاب کی قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس عہد کے تمدن، شائستگی، معاشرت اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا گیا ہے، مثلاً وہ کسی شادی یا جلسہ کی تقریب کا حال لکھتی ہے، تو اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتی ہے، عورتوں کے متعلق وہ بہت سے نئے معلومات فراہم کرتی ہے، مثلاً عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ وہ فنون سپہگری سے بھی خوب واقف ہوتی تھیں، سفر اور سیر و شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں، بعض اوقات وہ مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں، مہر انگیز بیگم (یعنی مظفر حسین مرزا بیگم کی بیٹی) کے بارہ میں لکھتی ہے، کہ وہ مردانہ لباس میں ملبوس رہتی تھی، اور مختلف ہنر مثلاً تیر اندازی، چوگان بازی، تیراندازی اور ساز بجانے میں ماہر تھی، ہمایوں جب ایران گیا تو اس کی ایک بہن ہمیشہ ایک گھوڑے پر سوار اس کے عقب میں چلتی تھی، خاندان کے آدمی جب ایک جگہ مل کر بیٹھتے تھے، تو عورتیں بھی گانے میں شریک ہوتی تھیں، لیکن یہ احتیاط رہتی تھی، کہ اس وقت کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو، عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا، بابر کی بیوی ماہم بیگم کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس تک پیدل استقبال کو گیا، ملکی معاملات میں عورتوں سے بھی مشورے لیے جاتے تھے،

اور ہر قسم کے امور میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی وغیرہ وغیرہ، مولانا شبلی مرحوم نے اس کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ گلبدن بیگم تاریخی واقعات لکھنے میں اس بات سے بخوبی واقف ہے، کہ کس واقعہ کو سمیٹ کر اور کس واقعہ کو پھیلا کر لکھنا چاہیے، وہ خوب جانتی ہے کہ کونسا واقعہ کیا اثر رکھتا ہے، اور اس لیے اس کے اسباب و علل سے کہاں تک بحث کرنی چاہیے،

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دار المصنفین) میں گلبدن بیگم کا نام بھی شعراء کی فہرست میں درج ہے، لیکن دونوں تذکروں میں اس کا صرف مندرجہ ذیل ایک شعر منقول ہے اور مسز بیورج نے اسی شعر کو ہمایون نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے تذکرۃ الخواتین سے نقل کیا ہے،

ہر پری رو کہ او با عاشق خود یار نیست
تو یقین میدان کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

اکبرنامہ (جلد سوم ص ۸۱۷) میں ہے کہ گلبدن بیگم کے عالم نزع میں مریم مکانی اس کے سرہانے کھڑی تھی، دونوں میں بڑی محبت تھی، مریم مکانی گلبدن بیگم کو بیگم جیو کہکر بار بار پکار رہی تھی، گلبدن بیگم نے آخری بار آنکھیں کھولیں، اور مریم مکانی کی طرف دیکھ کر یہ مصرع پڑھا،

من نہ مردم عمرت باد دارزانی

گلرخ بیگم | بابر کی ایک دوسری لڑکی گلرخ بیگم صالحہ سلطان بیگم کے بطن سے تھی، وہ بھی شعر و شاعری سے ذوق رکھتی تھی، اور اشعار موزون کرتی تھی، صبح گلشن مؤلفہ نواب علی حسن خان مرحوم میں اس کی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

"بگلرخی شگفتہ روئی و سلیقہ شاعری سرآمد زمرۂ نسوان، غنچۂ دہانش بنسیم اشعار لطیفہ شگفتہ گشتی"

ریاض الشعراء، مخزن الغرائب اور صبح گلشن میں اس کی طرف یہ شعر منسوب ہے:-

پیچگاہ سرو قد گل رخسار بے اغیار نیست
راست بود است آنکہ در عالم گل بے خار نیست

سلیمہ سلطان بیگم | یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی، پہلے خانخانان بیرم خان سے بیاہی گئی، اس کے انتقال کے بعد اکبر کے حبالۂ عقد میں آئی، سیاسی واقعات میں اس کا نام نمایاں اس وقت ہوا جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، سلیمہ سلطانہ ہی کی مساعی جمیلہ سے اکبر اور سلیم میں مصالحت ہوئی، اس سلسلہ میں اکبرنامہ، منتخب التواریخ اور لب التواریخ میں اسکا ذکر بار بار آتا ہے، جہانگیر اس کی علمی قابلیت کا معترف ہے، اس کے انتقال پر تزک جہانگیری (ص۱۱۴ نولکشور پریس) میں لکھتا ہے:-

"بجمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند، در زنان این مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود"

اس کو شعر و شاعری سے بھی زیادہ مناسبت تھی، آئین اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، اور مآثر الامرا (جلد اول ص۳۷۶) میں ہے کہ اس کا تخلص مخفی تھا لیکن مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ اسکا تخلص مخلص تھا، تذکروں میں صرف اس کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے:

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جان گفتہ ام　　　مست بودم زین سبب حرف پریشان گفتہ ام

مخزن الغرائب (ورق ۳۶۰) میں فیضی کے مرثیہ پر حسب ذیل رباعی درج ہے، جو ایک خاتون کاملہ بیگم کے ذکر میں نقل کی گئی ہے، کاملہ بیگم کے حال میں کسی قسم کا کوئی تعارف نہیں، مگر تذکرہ نگار نے رباعی لکھنے سے پہلے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بعض نسخوں میں رباعی سلیمہ بیگم کی طرف بھی منسوب ہے۔

فیضی مخور این غم کہ دلت تنگی کرد　　　با پاے امید عمر لنگی کرد

میخواست کہ مرغ روح بیند رخ دوست　　　زین واسطہ از قفس شتابنگی کرد

مورخین سلیمہ بی بی کی کتب بینی کے شوق کے بھی معترف ہیں، اس شوق کی تکمیل کے لیے اس کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔

ماہم بیگم | یہ بیگم وو دمان تیموری کی چشم و چراغ تو نہ تھی، لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے تیموری بادشاہ

یعنی اکبر بادشاہ کی مرضعہ تھی، اس لیے اس کا ذکر اس سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا، ماہم بیگم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی، اسی لیے علم و فضل کی ترویج کی خاطر اس نے دہلی میں ایک اعلیٰ پیمانہ کا مدرسہ خیر المنازل کے نام سے قائم کیا، سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ مدرسہ پرانے قلعہ کے پاس واقع تھا، اس کی عمارت اب منہدم ہوگئی ہے، اس پر جو کتبہ منقوش تھا، اس کو سر سید احمد خان نے اپنی کتاب (باب اول ص۱۴۵) میں نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے:-

بدوران جلال الدین محمد — کہ باشد اکبر شاہان عادل

چو ماہم بیگم عصمت پناہی — بنا کرد این بنا بہر افاضل

وے شد ساعی این بقعہ خیر — شہاب الدین احمد خان باذل

زہے خیریت این بقعہ خیر — کہ شد تاریخ او "خیر المنازل"

اس مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے لیے ایک بہت ہی حسین مسجد بھی تھی، ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ نے اس مسجد کو دیکھکر اس کا دلکش نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"مسجد پانی سے گھسے ہوئے نوکدار پتھروں کی بنی ہوئی ہے، جہاں نقش و نگار ہیں، وہاں سرخ پتھر اور گرانیٹ لگائے گئے ہیں، پھاٹک گو اب مسمار ہو چکا ہے، لیکن بہت ہی خوبصورت ہے، مسجد کا اندرونی حصہ رنگین پلاسٹر اور چمکدار اینٹوں سے مزین ہے، عمارت کا رخ اور پھاٹک رنگین تمغوں اور ترشے ہوئے پتھر کے پھولوں سے منقش ہیں، ان میں رنگ نیلے، زرد، سرخ، ارغوانی، سپید اور سیاہ استعمال کیے گئے ہیں، اس مسجد میں صرف ایک گنبد ہے، جس کی گردن نیچی ہے، اس کا کنگرہ بہت ہی عجیب و غریب ہے، جو مسجد قلعہ کہنہ کے کنگرے سے مشابہ ہے، مسجد کی دیواریں عمودی ہیں، لیکن مینارے ڈھلوان ہیں، موتی مسجد کی طرح پیچھے سامنے نکلے ہوئے ہیں، اس میں حجرے ہیں جو اور مسجد میں نہیں دیکھے گئے،

(۱) کیا لوجی آف دہلی، مولفہ سی اسٹیفن بحوالہ پروموشن آف محمڈن لرننگ مرتبہ ان لا، ص ۱۶۶)

یہ مسجد جس فیاضی اور فراخدلی سے طلبہ کے لیے بنائی گئی تھی، وہ ماہم بیگم کی تعلیمی دلچسپی کی بڑی دلیل ہے،

جانان بیگم بیرم خان کی لڑکی عبد الرحیم خانخانان کی بہن اور اکبر کے لڑکے شاہزادہ دانیال کی بیگم تھی، بڑی حسین وجمیل عاقلہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھی، اس کی فیاضی اور مکارم اخلاق کا بڑا شہرہ تھا، علماء وفضلاء کی قدردان اور فقراء ومشائخ سے عقیدت رکھتی تھی شاہزادہ دانیال کے انتقال بعد شاہزادہ سلیم اس کے حسن وجمال پر فریفتہ ہوگیا، لیکن اس کی آرزو پوری نہ آئی، اکبر کے بعد جب وہ خود تاج وتخت کا مالک ہوا تو جانان بیگم کو نکاح کا پیام دیا، اس وفاشعار وعفت مآب خاتون نے اس کے جواب میں کل دانت نکلوا کر اور زلفیں ترشوا کر جہانگیر کے پاس بھجوا دیں، وہ عفت وحیا کا یہ نمونہ دیکھ کر دنگ رہ گیا، اور پھر کبھی نکاح کی خواہش نہیں کی، جانان بیگم زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئی، اور کلام مجید کی تفسیر لکھنے کی سعادت بھی حاصل کی، شاعرہ بھی تھی، کلام کا نمونہ یہ ہے

خیز تا رہ بہ گذار کنیم ... خویش را چشم انتظار کنیم

زراہ امن وسلامت کسے باو برسد ... غبار تا نشود خاک پا باو نرسد[1]

نورجہان بیگم نورجہان بیگم بھی نسلاً تیموری نہ تھی، لیکن ایک تیموری حکمران کی بیوی بن کر شاہی حرم اور حکومت کے لیے باعث رونق وزینت بنی، اس لیے اگر اس کا ذکر ان صفحوں میں نہ کیا جائے گا تو ہماری یہ کتاب نامکمل رہے گی،

نورجہان نے شاہی محل میں داخل ہوتے ہی اپنے جمالیاتی ذوق سے حرم کی عورتوں کا

---

[1] مراۃ العالم ورق ۴۷۵

سارا مذاق ہی بدل دیا، پہننے اوڑھنے، بناؤ سنگار، فرش فروش اور زیور و آرایش کی چیزوں میں اتنی جدتیں پیدا کیں، کہ سارے ملک میں یہی رنگ غالب آ گیا، اس حسن مذاق کے ساتھ قدرت نے نورجہاں کو علم و ادب کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، ایک علم پرور باپ کی بیٹی اور ایک اعلیٰ ادیب و انشا پرداز اور شاعر کی بیوی تھی، اس لیے باپ کی وراثت اور شوہر کی رفاقت سے اس کی علمی صلاحیت اور لیاقت کو اتنی جلا ہوئی کہ اب تک اس کی استعدادِ علمی اور سخن سنجی کی داد دیجاتی ہے، مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے:-

"در بذلہ سنجی و سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر جوابی از نساے زمان ممتاز بود" (ص ۱۲۰)

ید بیضا مولفہ آزاد بلگرامی (قلمی نسخہ دار المصنفین) میں ہے،

"نورجہاں بیگم شعر بسیار خوش سلیقہ است"

اس کی تصدیق منتخب اللباب اور مآثر الامرا سے بھی ہوتی ہے، نورجہاں کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے لطیفے آج کل کی علمی مجلسوں میں مشہور ہیں، اگرچہ پھر بھی اس مضمون میں ان کا اعادہ شاید دلچسپی اور تفریح سے خالی نہ ہوگا،

ایک روز جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ "لعل بے بہا" کا تھا، نورجہاں نے اس کو دیکھتے ہی فوراً یہ شعر پڑھا:

ترا نہ تکمہ لعل است بر قبائے حریر   شدہ است قطرۂ خونِ منت گریبان گیر

ایک موقع پر جہانگیر نے عید کا چاند دیکھکر یہ مصرع موزون کیا،

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پڑھا،

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد[1]

1. تذکرۂ سرخوش قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال وخافی خان جلد اول ص ۲۷۰، ومراۃ الخیال ص ۱۲۹،

مفتاح التواریخ (مولفہ سر طامس ولیم بیل) میں نورجہان کی بدیہہ گوئی کی کچھ اور مثالیں منقول ہیں، ایک مرتبہ جہانگیر نورجہان سے کئی روز کے بعد ملا، ملنے کی خوشی میں نورجہان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، جہانگیر نے اس کیفیت کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا،

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نورجہان نے فوراً دوسرا مصرع فی البدیہہ کہا،

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ماہ محرم ۱۰۳۰ھ میں ایک دمدار ستارہ نظر آیا، نورجہان نے اس کو دیکھکر یہ شعر موزون کیا،

ستارہ نیست بدین طول سر برآوردہ　　فلک بشادی شہ کمر بر آوردہ

ملک الشعراء طالب آملی ایک بار شاہی عتاب میں پڑکر محبوس ہوگیا، حالت حبس میں نورجہان کے پاس یہ شعر لکھکر بھیجا،

ز شرم آب شدم آب را شکستے نیست　　بحیرتم کہ مرا آبرو ز چہ شکست

نورجہان نے فوراً یہ لکھکر جواب دیا، "یخ بست و بشکست"[۱]

ماثر الامراء کے مؤلف کا بیان ہے کہ نورجہان کا تخلص مخفی تھا[۲]، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ تیموری شہزادیون میں جب کسی نے شعر وشاعری میں طبع آزمائی کی، اس کی طرف یہی تخلص منسوب کردیا گیا، مراۃ الخیال[۳]، منتخب اللباب[۴] اور ماثر الامراء[۵] کے مؤلفین نے نورجہان کے یہ اشعار اپنی کتابون میں نقل کئے ہیں،

---

[۱] یہ تمام روایتین میری نظر سے مفتاح التواریخ (ص ۴۳۱) کے علاوہ کسی اور تاریخ اور تذکرہ میں نہین گذرین [۲] ماثر الامراء جلد اول ص ۱۳۴ [۳] مراۃ الخیال ص ۳۲۲ [۴] منتخب اللباب از خافی خان جلد اول ص ۲۷۰ [۵] ماثر الامراء جلد اول ص ۱۳۴،

دل بصورت نہ دہم تا نشدہ سیرت معلوم — بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم
زاہدا ہول قیامت مفکن در دل ما — ہول ہجران گذرانیدیم قیامت معلوم

مفتاح التواریخ میں یہ دو رباعیاں بھی نورجہاں کی طرف منسوب ہیں۔

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است — کلید قفل دل ما تبسم یار است
نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارض و زلف — دل کسے کہ بحسن و ادا گرفتار است

دیگر

چو بردارم ز رخ برقع ز گل فریاد برخیزد — زنم بر زلف اگر شانہ ز سنبل داد برخیزد
بایں حسن و ملاحت چو در گلشن گذر دارم — ز جان بلبلان شور مبارکباد برخیزد[1]

نورجہاں شعرا کی بھی سرپرست تھی، مرآۃ الخیال کے مؤلف کا بیان ہے کہ "دانش اہل سخن دانی نہ است" قاسم خان شاعر کی حیثیت سے نورجہاں ہی کی سرپرستی اور قدردانی سے مشہور ہوا۔ قاسم خان نورجہاں کی بہن منیجہ بیگم کا شوہر تھا، نورجہاں کی وساطت سے جس طرح قاسم خان کو شعر و شاعری میں فروغ حاصل ہوا، اسکا حال مؤلف تذکرۂ مرآۃ الخیال اس طرح لکھتا ہے:-

"نورجہاں بیگم با قاسم خان مناظرہ و مشاعرہ بسیار دوست میداد، و اورا در فن شعر سلیقہ تمام داشت، تا آنکہ طرح غزلے تازہ درمیان آمد و شعراے پایۂ تخت بدان درماندند، قاسم خان این سہ بیت نوشتہ نزد بیگم فرستاد، در آن ہنگام زود طبعش در حضور قبول نمود"

(انتہی ملخصاً)

---

[1] یہ رباعیاں کسی اور تذکرہ میں میری نظر سے نہیں گذریں۔ تعجب ہے کہ مفتاح التواریخ میں مندرجہ ذیل شعر نورجہاں کا بتایا گیا ہے۔

نورجہاں گرچہ بصورت زن است — در صف مردان زن شیر افگن است

گر شوی سایہ نشین رو کہ نیست باغبان ‌ ‌ ‌ ‌ سایہ بر خورشید انداز د درخت باغبان

ناخنہ چون دید بے گل باغ را نالید و گفت ‌ ‌ ‌ ‌ از چہ رو با گل نرفت این جان سخت باغبان

جشن نوروز است و فراش بہار از فیض طبع ‌ ‌ ‌ ‌ طرح کرد از سبزہ و گل تاج و تخت باغبان

نورجہان نے مہ کلال کو جس طریقے سے شاہی دربار میں روشناس کرایا، اس کا ذکر جہانگیر کے سلسلہ میں آچکا ہے، نورجہان کی مصاحبت میں بعض ایسی عورتیں بھی تھیں جو شاعری میں کافی دسترس رکھتی تھیں، ان ہی میں ایک مہری ہروی تھی جس کے بارے میں مراۃ الخیال کا مولف لکھتا ہے:

"مسماۃ مہری ہروی خورشید طلعتی بود کہ کرشمہ جمالش عروسان بہشت را جلوہ گری آموختے و از تاب عذارش آفتاب عالم تاب در آتش غیرت سوختے، با این ہمہ حسن و رعنائی بالماس فکر گوہرہای مضامین آبدار سفتے و سخن را بسیار نازک گفتے۔"

مراۃ الخیال میں مہری ہروی کا ایک دلچسپ لطیفہ درج ہے، نورجہان مہری ہروی کے ساتھ محل کے بالانشین پر بیٹھی تھی، کہ مہری ہروی کا شوہر خواجہ حکیم نیچے نظر آیا، نورجہان نے ہروی کو اس کے شوہر کو اوپر بلا لینے کا حکم دیا، حکم پاکر خواجہ حکیم نے اضطراب اور عجلت میں حاضر ہونے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ میں اس کے پاؤں لڑکھڑائے، اس اضطراب، عجلت اور گھبراہٹ کی حالت کو دیکھکر نورجہان نے مہری ہروی کو ان کیفیات پر اشعار موزون کرنے کی فرمایش کی، مہری ہروی نے خواجہ حکیم کو مخاطب کرکے کہا:-

مرا با تو سر یاری نماندہ ‌ ‌ ‌ ‌ سر مہر و وفا داری نماندہ

ترا از ضعف پیری قوت زور ‌ ‌ ‌ ‌ چنانکہ پای بیداری نماندہ

نورجہان ہنس پڑی، اور مہری کو اس صلہ میں نقد و جنس کی صورت

مین انعام دیا،[۱]

ممتاز محل | شاہجہان کی محبوب بیوی ارجمند بانو بیگم الملقب بہ ممتاز محل بھی زیور علم و فضل سے آراستہ تھی، اور وہ نہ صرف سخن فہم بلکہ سخن سنج بھی تھی، اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار شاہجہان جمنا کے کنارے بیٹھکر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا، کہ اس کی موجون کی طرف اشارہ کرکے ممتاز محل سے کہا

آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگہا

ممتاز محل نے اس کا دوسرا مصرع فوراً موزون کیا،

از ہیبت شاہجہان سر می زند بر سنگہا[۲]

جہان آرا بیگم | شاہجہان اور ممتاز محل کی بیٹی تھی، جو سیاسی واقعات کے لیے بھی اپنے عہد مین بہت نمایان رہی، ممتاز محل کی گود اور نور جہان کی صحبت اور شاہجہانی عہد کی اعلیٰ علمی فضا مین رہ کر علم و فضل کے لحاظ سے بھی مشہور ہوئی، بچپن مین تعلیم ستی النساء خانم سے حاصل کی

---

[۱] مراۃ الخیال ص ۳۳۵، مہری کی ایک غزل ملاحظہ ہو،

محل ہر نکتہ کہ بہ پیر خرد مشکل بود — آن سو دیدم بیک قطرۂ مے حاصل بود
گفتم از مدرسہ پرسم سبب حرمت مے — در ہر کس کہ زدم بے خرد لایعقل بود
خواستم سوز دل خویش بگویم با شمع — داشت او خود بزبان آنچہ مرا در دل بود
در چمن صبحدم از گریۂ زاری من — لالہ سوختہ خون در دل و پا در گل بود
آنچہ از بابل و ہاروت روایت کردند — سحر چشم تو بدیدم ہمہ را شامل بود
دولتے بود تماشای رخت مہری را — حیف صد حیف کہ این دولت مستعجل بود

[۲] یہ روایت بعض اردو کی کتابون مین منقول ہے، مگر فارسی تذکرون مین اور تاریخون مین میری نظر سے نہین گذرسکا

جو ملک الشعرا طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کے بھائی کی بیوی تھی، یہ خاتون حافظ تھی، اور زبان دانی، سخن فہمی اور علم قرأت و تجوید میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، ممتاز محل اور شاہجہاں دونوں اس کے قدرداں تھے، ممتاز محل کی مہردار تھی، اور اس کے انتقال کے بعد محل کی صدارت اسی کے سپرد ہوئی، اس کی وفات کے بعد شاہجہاں نے تیس ہزار روپئے خرچ کرکے اس کا مقبرہ بنوایا، جو روضہ تاج گنج میں ہے، جہاں آرا بیگم نے اسی خاتون کے زیر تعلیم رہکر قرأت اور تجوید سیکھا[1]، اور یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں آرا بیگم نے اعلیٰ قسم کی تعلیم پائی، کیونکہ وہ مصنفہ بھی ہوئی اور شاعر بھی، چشتیہ حضرات [illegible] ۱۰۴۹ھ میں مونس الارواح لکھی جس میں حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلہ کے اکابر خلفا مثلاً شیخ حمید الدین ناگوریؒ، حضرت قطب الدین کاکیؒ، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، اور حضرت چراغ دہلویؒ کے بہت ہی عقیدتمندانہ احوال مندرج ہیں، جن سے اس کے مذہبی اور صوفیانہ ذوق کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کی تالیف میں اس نے بڑی احتیاط کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ رقمطراز ہے:

"احوال این بزرگان کہ نقد بارگاہ صمدیت اند از کتب و رسائل معتبرہ باحتیاط تمام بیرون آوردہ بتقیید تحریر آوردہ شدہ و اعتقاد این ضعیفہ آنست در این رسالہ ثبت گردیدہ است و امید کہ خوانندگان را فیض و بہرہ تمام از آن حاصل آید"

اس احتیاط کے علاوہ کتاب کی دو اور خصوصیات ہیں، ایک تو یہ کہ بہت ہی ادب اور احترام کے ساتھ لکھی گئی ہے، حضرت معین الدین اجمیریؒ کے ذکر کی ابتدا ان اشعار کے ساتھ کرتی ہے،

آن شہنشاہ جہان معرفت — ذات او بیرون ز ادراک و صفت

۱؎ مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۲-۹۳۔

خسرو ملک فنا بے تخت و تاج — از خود و از غیر خود بے احتیاج
غرق بحر عشق از صدق و صفا — از خودی بیگانہ با حق آشنا
کرده مرغ همتش ز اوج کمال — بیضۂ افلاک را در زیر بال
اختر برج سپهر لم یزل — گوهر درج کمال بے بدل
آن معین دین و ملت بے نظیر — فارغ از دنیا بملک دین امیر
در ثنائے او زبانم را چه حد — فیض او باید که فرماید مدد

وہ جب حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے گئی تو وہاں کے جن تاثرات کو قلمبند کیا ہے، ان سے بھی اس کی والہانہ عقیدتمندی اور اخلاص کا اظہار ہوتا ہے،

"می گوید فقیرۂ حقیرہ جہان آرا کہ چون از یاوری بخت و فیروزی طالع از دار الخلافہ اکبر آباد در خدمت والد بزرگوار خود متوجہ خطۂ پاک حضرت اجمیر بے نظیر شدم از تاریخ ہژدہم ماہ شعبان المعظم سنہ یکہزار و پنجاہ سنہ ہجری تا تاریخ جمعہ ہفتم ماہ رمضان المبارک کہ داخل عمارات کنار تال آنا ساگر گشتم، موفق شدم باین معنی کہ ہر روز و ہر منزل دو رکعت نماز نافلہ ادا می کردم و یکبار سورۂ یٰسین با فاتحہ از کمال اخلاص و عقیدتمندی خواندہ و ثواب آنرا بروح پر فتوح و مطہر منور حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الحق والدین رضی اللہ عنہ نثار می نمودم و چند روز کہ در عمارات مذکورہ توقف واقع شد، از نہایت ادب شبہا بر پلنگ نخوابیدم و بطرف روضۂ متبرکہ حضرت پیر دستگیر پا دراز نساختم، بلکہ پشت بآنجانب نکردم و روزہا در زیر درختان می گذرانیدم .... و در مسجد سنگ مرمر کہ بدر بزرگوار حق شناس این حقیرہ راست کردہ اند، رفتہ نماز ادا کردہ و باز در گنبد مبارک نشستہ سورۂ یٰسین

فاتحہ بروح پُر فتوح خواندم تا وقتِ نمازِ مغرب در آنجا بودم و شمع بار رواح آنحضرت روشن کردہ، روزہ با ب جہا لرہ افطار کردم عجیب شامی دیدم آنجا کہ بہتر از صبح بود، اگرچہ اخلاص و محبت این فانیان تقاضائے آن نمی کرد کہ باین قسم جاہے متبرک پرفیض گوشۂ عافیت رفتہ باز بخانہ بیاید، اما چہ چارہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اگر اختیار میداشتم ہمیشہ در روضۂ حضرت کہ عجیب گوشۂ عافیت است و من عاشق گوشۂ عافیت ہستم بسری بردم و بسعادت طواف نیز مشرف می شدم ناچار بچشم گریان و دل بریان بصد ہزار افسوس ازان درگاہ رخصت شدہ بخانہ آمدم و تمام شب طرفہ بیقراری و رمن بود"

مونس الارواح کا سنہ تالیف ۱۰۴۹ھ ہے لیکن یہ عبارت ۱۰۵۳ھ میں بطور ضمیمہ لکھی گئی ہے، جو دارالمصنفین کے قلمی نسخہ مرقومہ ۱۰۶۸ھ میں ہے،

اس کتاب کی دوسری خصوصیت اس کا طرز انشا ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی عبارت کو نہایت صاف اور شستہ[1] بتایا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے بھی معلوم ہوگا،

مونس الارواح چھپ گئی ہے مگر اس کا ایک بہت ہی خوشخط نسخہ دارالمصنفین میں ہے، یہ نسخہ جہان آرا کے دربار کے مشہور خوشنویس عاقل خان سے وصلیوں پر لکھوایا تھا، اور پوری کتاب کو طلائی نقش و نگار اور زرین افشان سے مزین کرایا تھا، اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۸ھ مرقوم ہے، یعنی تصنیف کے انیس سال کے بعد اور جہان آرا کی عمر کے ۴۴ ویں سال میں یہ نسخہ لکھا گیا، جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب میں جن بزرگوں کے حالات ہیں،

[1] الندوہ اپریل ۱۹۱۱ء،

اُن سے جہان آرا کی عقیدت و ارادت سنِ کہولت میں بھی بدستور قائم تھی، اس قلمی نسخہ کا سائز ۱۷×۲۷ ہے، ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں، اور کل صفحات کی تعداد ۹۴ ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کو ایک بڑی رقم میں خریدا تھا، اور اپنی قلمی کتابوں کے ذخیرہ میں اس کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، (الندوہ، اپریل ۱۹۱۱ء) یہ کتاب خطاطی کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر لندن کی نمایش منعقدہ سنہ ۱۹۱۱ء میں بھی بھیجی گئی تھی،

جہان آرا کے علمی مشاغل میں زیادہ تر صوفیائے کرام کے حالات کا مطالعہ ہی رہا کرتا تھا، مونس الارواح میں ایک جگہ لکھتی ہے،

این ضعیفہ راجیہ از اداے فرض وواجبات وتلاوت قرآن مجید ہیچ امرے شریف تر از ذکر حالات ومقامات اولیاے کرام قدس اللہ ارواحہم نمی داند، بنا برین خلاصۂ اوقات خود را بمطالعہ کتب ورسائلے کہ مشتمل بر احوال سعادت مآل بزرگان دین واکابر صاحب یقین ست صرف می نماید[1]

---

[1] جہان آرا بیگم کے ایک سوانح نگار نے اس کی تالیفات میں ایک مباحث نامہ اور ایک مثنوی بھی بتائی ہے، مگر میری نظر سے ان دونوں کتابوں کے نام کسی مستند تذکرہ اور تاریخ میں نہیں گذرے، ۱۹۳۱ء میں لندن سے ایک انگریزی کتاب ایک انگریز خاتون Andrea Butensch نے Mogul princess. Jahan Ara Begum کے نام سے شائع کی ہے، خاتون مذکور نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ آگرہ کے قلعہ کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ ثمن برج کے ایک شکستہ پتھر کے نیچے سے کچھ مسودے ملے، مسودے کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ جہان آرا کی خود نوشتہ تحریریں ہیں، جن کو اس نے شاہجہان کے مجبوس ہونے کے بعد قلمبند کیا تھا، وہ بھی شاہجہان کے ساتھ قید تھی، اس لیے قید ہی کے زمانہ میں اس نے اپنی پچھلی زندگی کے واقعات

(باقی صفحہ ۴۰۲ پر)

جہان آرا شاعرہ بھی تھی، مونس الارواح میں جابجا اس کے اشعار درج ہیں، نمونہ کے طور پر حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

آنجا کہ کمال کبریائے تو بود — عالم نمی از بحر عطائے تو بود

مارا چہ حد حمد و ثنائے تو بود — ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود

دیگر

اے بوصف بیان ما ہمہ ہیچ — ہمہ آن تو آن ما ہمہ ہیچ

ہرچہ بیند خیال ما ہمہ ہیچ — ہرچہ گوید زبان ما ہمہ ہیچ

ما بکنہ حقیقتت نرسیم — اے یقین و گمان ما ہمہ ہیچ

(بقیہ حاشیہ ص۴۵۱) لکھنے شروع کیے، اور ان کو ثمن برج کے ایک پتھر کے نیچے یہ لکھکر چھپا دیا کہ ثمن برج کا پتھر جب خستہ ہو جائیگا تو یہ تحریر لوگوں کے ہاتھ آئے گی جس سے اس کے اصلی خیالات، جذبات اور حالات روشن ہوں گے، تحریر میں رومانی اور تمثیلی رنگ بہت غالب ہے، اور اسلوب بیان بہت ہی دلکش اور موثر ہے، چنانچہ اس تحریر کا انگریزی ترجمہ دیدہ زیب لکھائی چھپائی کے ساتھ لندن سے ۱۹۳۱ء میں شائع کر دیا گیا ہے، ہم نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک بہت ہی غور سے پڑھا، اور اس کو سراسر جعلی اور نقلی پایا، یہ محض ایک نئے اور دلنشین انداز میں جہاں آرا بیگم کے اخلاق اور کیرکٹر کو مسخ کرکے دکھانے اور اورنگزیب کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش میں لکھی گئی ہے، اس کتاب میں بعض لغو اور لاطائل واقعات ایسے ہیں، جن کی تردید کرنا محض تضیع اوقات ہے، مثلاً جہان آرا بیگم راجپوتوں کی بہت ہی مداح ہے، وہ ایک راجپوت سردار پر عاشق ہو گئی ہے، وہ شادی اس لیے نہیں کر سکتی ہے کہ اکبر نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ مغل بادشاہوں کی لڑکیاں رشتۂ ازدواج سے محروم رہیں، چنانچہ جہان آرا چھپ چھپ کر اپنے محبوب راجپوت سے ملتی ہے، عشق و محبت کی باتیں کرتی ہے، اور اپنی یاد تازہ رکھنے کیلیے اسکو کئی تحفے دیتی ہے، جب دارا اور اورنگزیب میں خانہ جنگی شروع ہوتی ہے، تو جہان آرا کی محبت اور عشق میں

جہان آرا بیگم کے اردو سوانح نگار منشی سیل چند، مصنف تاریخ آگرہ کے حوالہ سے اس کا ایک مرثیہ بھی نقل کرتے ہیں، جو اس نے اپنے باپ کی وفات کے موقع پر کہا تھا، اسکے تین اشعار یہ ہیں:

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر — آیا شب فراق ترا ہم بود سحر؟
اے بادشاہ عالم، وی قبلۂ جہان — بکشائے چشم رحمت و بر حال من نگر
نالم چنین ز غصہ و یادم بود بدست — سوزم چو شمع در غم و دودم رود ز سر

جہان آرا بیگم کے ذوق شعری اور اس سلسلہ میں اس کے جود و سخا کی متعدد روایتیں تذکروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲) راجپوت سردار، دارا کی حمایت میں اورنگزیب کے خلاف لڑتا ہے، جنگ میں راجپوت جہان آرا کے ایک دوسرے عاشق کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، مگر اس کا ایک ہار کسی طرح سے جہان آرا کو مل جاتا ہے جس کو وہ قیمتی یادگار سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے، اس کتاب میں اسی قسم کے اور بھی خرافات ہیں، سب سے مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ جہان آرا بیگم کا لباس ساری دکھایا گیا ہے، اور وہ ہندو دیوتاؤں سے مثلاً شیوجی اور وشنو وغیرہ سے بڑی عقیدت رکھتی تھی، اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو محض اورنگزیب اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی گذشتہ تاریخ کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، برنیئر منوکی اور اسمتھ وغیرہ جیسے متعصب یورپین مورخین نے جہان آرا بیگم کی ذات کے ساتھ بہت ہی نازیبا حکایتیں منسوب کر دی تھیں لیکن سنجیدہ مورخوں نے حقائق کی روشنی میں ان کی تردید کر دی ہے، ایک اچھوتے انداز میں پھر اس شہزادی کی ذات پر ناروا حملے کیے گئے ہیں، مگر یورپین مورخوں کی ہرزہ سرائی اور دشنام طرازی اس قدر عام ہو گئی ہے، کہ ان کی ہر بات، توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

اورینٹل کالج میگزین (اگست ۱۹۳۶ء) میں جہان آرا کے ایک اہم رسالہ صاحبیہ پر ایک مضمون شائع ہوا تھا، مضمون نگار کا بیان ہے کہ جہان آرا بیگم نے اس رسالہ میں اپنے پیر و مرشد ملا شاہ بدخشی کے سوانح کے ساتھ اپنے حالات بھی قلمبند کیے ہیں، آخر میں کچھ اس کے اشعار بھی ہیں، یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گذرا ہے اس لیے اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

میں پائی جاتی ہیں، کلمات الشعراء (سرخوش)، ریاض الشعراء اور خزانہ عامرہ میں ہے کہ جہاں آرا بیگم ایک دفعہ باغ کی سیر کو ہاتھی پر برقعہ ڈالے نکلی، میر صیدی طہرانی چھپ کر تماشا دیکھنے لگا جب ہاتھی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے بے ساختہ یہ مطلع پڑھا،

برقع بہ رخ افگندہ بردناز بباغش   تانکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

جہاں آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، وہ آیا تو اس سے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوائے، لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ اس کو شہر سے نکال دیا جائے، کیونکہ جہاں آرا بیگم کو شعر تو پسند آیا لیکن گستاخی پسند نہ آئی، مولانا شبلی مرحوم اپنے مقالہ "زیب النساء" میں اس روایت کو نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لیے کس قسم کے آداب مقرر تھے،

کلمات الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) میں جہاں آرا بیگم کی علمی فیاضی کی ایک اور مثال درج ہے، مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی نے جو شاہجہانی دربار کا ایک معزز منصبدار اور شاعر تھا، شاہجہان آباد پر ایک مثنوی لکھی، اس شہر کے باغ حیات بخش کی تعریف میں جو اشعار لکھے وہ جہاں آرا کو پسند آئے، اس کے صلہ میں اس نے پانچ سو روپے انعام اسکے پاس بھجوا دیئے،

ید بیضا (قلمی نسخہ دار المصنفین) مولانا غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ مرزا محمد علی ماہر نے جہاں آرا کی مدح میں ایک مثنوی لکھکر اس کی خدمت میں پیش کی، مثنوی کے اس شعر پر جہاں آرا نے اس کو پانسو روپے انعام دیئے،

نہ بابستہ تو صفاتت کرد گار است   کہ خود پنہان و نقشش آشکار است

مگر مولانا غلام علی آزاد اس روایت کو سرو آزاد (ص۱۳۸) میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ شعرائکی نظر سے نعمت خان عالی کی اس مثنوی میں بھی گذرا ہے جو اس نے زیب النساء کے خرگاہ پر لکھی تھی،

تذکرہ مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دار المصنفین) میں ہے کہ مرزا محمد علی ماہر نے نو سو اشعار کی ایک مثنوی زیب النساء کی شان میں لکھی جس میں مذکورہ بالا شعر زیب النساء کو بہت پسند آیا، واللہ اعلم بالصواب

جہاں آرا کی علم پروری اور اسکے ساتھ مذہبیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آگرہ کی جامع مسجد اسی کی بنوائی ہوئی ہے، اس نے مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جو بہت دنوں تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا،

جہاں آرا بیگم نے مرنے کے بعد بھی خواجگان چشتیہ سے اپنی عقیدت قائم رکھی، یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پرانوار کے ٹھیک پائین میں اپنی خواہش کے مطابق دفن ہوئی، اس کی پرہیزگاری، نیکی، انکساری اور ذوق شعری اسکے حسب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے، جو اس کی معمولی اور سادہ قبر پر مکتوب ہے، اس مزار کا کٹہرا تو سنگ مرمر کا ہے، لیکن تعویذ بالکل خام ہے، جو ہمیشہ سبزہ سے ڈھکا رہتا ہے،

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا　　کہ قبر پوش غریبان ہمیں گیاہ بس است

زیب النساء بیگم | تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کا گل سرسبد زیب النساء بیگم ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے پہلی اولاد دلرس بانو بیگم کے بطن سے تھی، دستور کے مطابق اس کو سب سے پہلے کلام پاک پڑھایا گیا، پھر عالمگیر کی ایک درباری امیر کی ماں مریم کو مقرر کیا گیا، جو کلام پاک کی حافظہ تھی، زیب النساء نے بھی کلام پاک حفظ کیا، مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ اس سعادت کے صلہ میں عالمگیر نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں انعام میں مرحمت فرمائیں،[2] زیب النساء نے عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری اور مرآۃ العالم میں ہے کہ:

"بتحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ"

۱؎ مآثر الامراء ج ۲ ص ۸۲۹　۲؎ مآثر عالمگیری اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ص ۴۹۳

زیب النساء کے معلمون میں صرف ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی کا نام تاریخوں میں مذکور ہے، جو اس کی عمر کے اکیسویں سال میں درسی کتب کے علاوہ، فقہ، اصول فقہ، اور علم حدیث کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ زیب النساء نے شعر و شاعری میں بھی انہی سے اصلاح لی[۱]، اس نے علم کی تکمیل کے لیے فن ۳
خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا، مآثر عالمگیری کا مولف رقمطراز ہے کہ وہ ہر قسم کے خطوط یعنی نسخ، نستعلیق اور شکستہ نہایت خوبی کے ساتھ تحریر کرتی تھی[۲]، یہ فن شاید اس نے ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی ہی سے سیکھا تھا، کیونکہ وہ نہ صرف ایک ممتاز شاعر اور عالم تھے، بلکہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ زیب النساء کے علم و ہنر کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکی علمی کاوش اسکی علمی و ادبی تصنیفات میں بھی ظاہر ہوگی، مگر وہ اب ناپید ہیں، مخزن الغرائب کے مولف نے اس کی صرف ایک کتاب زیب المنشآت کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے،

"زیب المنشآت کہ از تالیف آنجاب است فقیر آن را زیارت نمودہ، (قلمی نسخہ دار المصنفین)

"زیب المنشآت" زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ تھا، اس کی ایک بیاض خاص بھی تھی، جو اس کی ایک خاص ارادت فہم نامی کے ہاتھ سے حوض میں گر کر ضائع ہو گئی، ملا سعید اشرف ماژندرانی نے اسکی معذرت میں ارادت فہم کی طرف سے ایک طویل قطعہ لکھکر زیب النساء کی خدمت میں پیش کیا،

زیب النساء کے نام سے ایک مرقع بھی منسوب ہے جس میں قطعات، مشہور کاتبوں اور خطاطوں کے کمالات کے نمونے، ماہر نقاشوں اور مصوروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی انواع و اقسام کی تصویریں تھیں، یہ مرقع ناپید ہے لیکن اسکا دیباچہ جس کو ایک شاعر و نثار ملا رشید اشرف نے لکھا تھا، خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے، یہ دیباچہ ملی جلی نظم و نثر میں لکھا گیا ہے، اس سے زیب النساء کی علمی مجالس کا حال معلوم ہوتا ہے، شاعر مذکور لکھتا ہے کہ بیگم کی علمی مجلسوں میں نظم و نثر، صرف و نحو، ہندسہ و نجوم، معانی و بیان اور ہیئت و مرایا پر علماء و فضلاء جمع ہو کر بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کیا کرتے تھے،

۳۹۳

[۱] ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی پر ایک مفصل مضمون معارف نمبر ۴ ج ۱۲ میں ملاحظہ ہو، نیز دیکھو مآثر الکرام ج ۲ صفحہ ۱۱۶ [۲] مآثر عالمگیری

نہان بود آنچہ در آثار قدرت | بفضل آوردہ دست او ز قوت
ملازم دارد آن علامۃ العصر | ز اہل فضل و حق چون ابو النصر
سوالی تسعہ را حاضر جوابی | ز کلیات دانش انتخابی
مقولاتی عشر، عشری زگفتار | ز علم ظاہر و باطن خبردار
گہے تفتیش علم صرف می شد | سخن از اسم و فعل و حرف می شد
گہے در مجلس از نحو مذکور | ز مرفوع و ز منصوب و ز مجرور
گہے از ہندسہ می کرد تعداد | ز قدر خط و سطح و جسم و ابعاد
گہے می رفت حرف از علم تنجیم | ز اسطرلاب و استخراج و تقویم
گہے می کرد وصف علم اعداد | صحیح و کسر و زوج و فرد تعداد
گہ از علم بیان کردی حکایت | ز تلمیح و ز تشبیہ و کنایت
گہ از علم معانی بود گفتار | ز اسناد و ز مسند با خبردار
گہ از آثار علوی یاد می کرد | حدیث ابر و برق و باد می کرد
بہیئت مطلع از طبع درّاک | ز تسکین زمین، تحریک افلاک
شد از علم مرایا بسکہ آگاہ | بذات شخص برد، از سایہ اش راہ

اس دیباچہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیب النسا بیگم طب روحانی مین بھی حاذق تھی،

بعلم طب روحانیہ حاذق | بتہذیب است اخلاقش موافق

اور وہ علم موسیقی سے بھی واقف تھی۔

ز موسیقی و از الحانش آگاہ | بگوش استماعش لیک اکراہ

بیگم کی انشا پردازی اور علمی کمال کے بارے مین لکھتا ہے:

بلفظ مختصر معنی مطول | عبارت مجمل و معنی مفصل
بعلم او ولی تر از ہر چیز دانی | نہ در اعمال گنجد حرف ثانی

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہے :-

باہل فضل شامل جود خاصش | بعلم و شرع دایم اختصاصش
سخن سنجان معنی آفرینان | ز خرمنہاے فضلش خوشہ چینان
سخن فہم و سخن سنج و سخن دان | سخنور را نسنجد جز بمیزان[1]

شعر و شاعری کی زبان کے علاوہ شاعر نذکور دیباچہ کی نثر میں بھی بیگم کی انشا، خوشنویسی اور شاعری کا ذکر بہ شاندار اور باوقار الفاظ کے ساتھ کرتا ہے، مورخین اور تذکرہ نویس بھی اسکی علمی سرپرستی اور قدردانی کے بیان میں رطب اللسان ہیں، ماثر عالمگیری میں ہے، کہ علما و فضلا اور خوشنویسوں کا ایک گروہ زیب النسا بیگم کی سرکار سے فیضیاب ہوا کرتا تھا۔ (ص ۵۳۸)

غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں :-

ہمت بہ ترقیہ حال ارباب فضل و کمال مصروف می داشت، و جماعت کثیر از علما و شعرا و منشیان و خوشنویسان بہ سایۂ قدر دانی او آسودہ بود۔ و کتب و رسائل بسیار بنام او سمت تالیف پذیرفتہ (ید بیضا، قلمی نسخہ، دار المصنفین)

بقول مولانا شبلی مرحوم زیب النسا کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈمی (بیت العلوم) تھی، اس بیت العلوم میں ہر فن کے علما و فضلا نوکر تھے، جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے، کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جز زیب

---

[1] پروفیسر محفوظ الحق (پریزیڈنسی کالج، کلکتہ) نے مرقع کی نقل رسالہ شمع آگرہ، بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع کی تھی، یہ اشعار اسی سے لیے گئے ہیں،

کا لفظ ہوتا تھا، چنانچہ مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ ملا صفی الدین اردبیلی نے بیگم کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، تو اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا، (ص ۴۳۹) مولف مذکور کا یہ بھی بیان ہے کہ اس کتاب کے علاوہ اور دیگر رسائل بھی بیگم کے نام سے موسوم ہوئے، (ص ۵۳۹) مگر ان رسائل کے نام کہیں اور راقم حروف کی نظر سے نہیں گذرے، زیب التفاسیر کا پانچواں حصہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے، یہ حصہ ۱۱۶ صفحوں میں ختم ہوا ہے، اور خاتمہ کی تاریخ ۱۰۸۰ھ مرقوم ہے، فہرست نگار کا خیال ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کے ہاتھ کا لکھا ہے،

زیب النساء نے اپنے بیت العلوم کے علماء و فضلا کے استفادہ کے لیے ایک اعلیٰ قسم کا کتبخانہ بھی قائم کیا تھا، مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہے کہ ہنر پرور اور علم شناس شہزادی ہمیشہ کتابوں کے جمع کرنے اور نیز جدید تصنیف و تالیف کو جاری رکھنے میں کوشاں رہتی تھی، اسکا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا، (ص ۵۳۹)

زیب النساء شاعرہ بھی تھی، مگر اس کی شاعری کے متعلق بہت سی بے سر و پا اور بے بنیاد باتیں منسوب ہو گئی ہیں، جن کی تشہیر غیر مسلم مصنفوں نے زیادہ کی ہے، "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں لندن سے دیوان زیب النساء کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس میں زیب النساء کی اول پچاس فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ مگن لال اور جیسی ڈنکن ویسٹ بروک نے کیا ہے، شروع میں ۲۳ صفحے کا ایک مقدمہ ہے، جو موخر الذکر انگریز خاتون ڈنکن ویسٹ بروک کا لکھا ہوا ہے، یہ مقدمہ بظاہر بہت ہی پر از معلومات ہے، اس میں زیب النساء کے معاشقہ اور اس ضمن میں اس کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت ناپسندیدہ قصے اور واقعات درج ہیں، مگر ان کی تائید یا تردید ایک دوسرے غیر مسلم مورخ سر جادو ناتھ سرکار کے ایک مضمون سے ہو چکی ہے، جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے بڑے ہجو نگار ہیں، اس لیے

۱؎ اسٹوریا ان مغل انڈیا ص ۹۰-۷۹

اورنگزیب کی لڑکی زیب النساء کی حمایت میں ان کا کچھ لکھنا بجز اکراہ حق و صداقت کا اظہار کرتا ہے،

مولانا شبلی مرحوم نے بھی زیب النساء سے متعلق جو مہمل اور لغو روایتیں مشہور ہو گئی تھیں ان کی تردید اپنے مضمون "زیب النساء" میں کر دی ہے[1]

زیب النساء کے عشق و محبت کی طرح اس کا دیوان بھی محض افسانہ بن کر رہ گیا ہے، زیب النساء کا ایک مجموعۂ کلام "دیوان مخفی" کے نام سے مختلف مطابع سے چھپ کر بازار میں فروخت ہوتا ہے، مگر ارباب نظر ان متداول نسخوں پر اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں، کہ دیوان کی اندرونی شہادت کی بنا پر اس کو کسی طرح زیب النساء کا دیوان نہیں کہا جا سکتا ہے، پروفیسر محفوظ الحق پریزیڈنسی کالج کلکتہ نے معارف نمبر ۵ جلد ۱۱ میں یہ بتایا ہے، کہ دیوان مخفی در اصل مخفی رشتی کا دیوان ہے جس کا وطن باصطرخ تھا، وہ شاہجہان کے عہد میں خراسان سے ہندوستان طلب منفعت کے لیے آیا، مگر یہاں کی ہوا اس کو راس نہیں آئی اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے قید کر دیا گیا، چونکہ شاہی دربار میں اس کی رسائی نہ ہو سکی، اس لیے اس کا کلام اوروں کی طرح مشہور نہ ہو سکا، اور ایک مدت تک مخفی مگر محفوظ رہا، اس کا دیوان بعض غیر محقق مصنفوں کے ہاتھ لگا اور اسے دیکھے اور سمجھے بغیر غالباً محض مخفی کی رعایت کی بنا پر بیگم کی جانب منسوب کر دیا،

مستند تذکرہ نویسوں میں احمد علی سندیلوی کا بھی مخزن الغرائب میں زیب النساء کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"اما دیوان اشعارش جا بجا منظر نیامدہ، اگرچہ در تذکرہ انتخابش بنظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید بسبب آنکہ اکثر شعرا اسانید صاحب آن تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بودند"

---

[1] مقالات شبلی ج ۵ ص ۱۱۶-۱۰۶ ملاحظہ ہو اور نیشنل پبلک لائبریری کیٹلاگ ج ۳ ص ۱-۱۵۰، اور پروفیسر محفوظ الحق کا مضمون زیب النساء اور دیوان مخفی، معارف نمبر ۵ ج ۱۱،

اسی سلسلہ میں احمد علی سندیلوی نے زیب النساء کے قریب پندرہ ایسے اشعار نقل کئے ہیں، جو بعض تذکروں میں زیب النساء کی طرف منسوب ہیں لیکن یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار واقعی اسی کے ہیں، مولانا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ اس کا سارا کلام شاید اس بیاض میں جمع ہو، جو ارادت فہم سے ایک حوض میں گر کر ضائع ہو گئی، بہرحال زیب النساء کے شاعر ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے،

مرقع کا دیباچہ نگار اس کی شاعری کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہے:

ز تخیل طبع و ذہن اندیشہ کردہ   چہ گلہا و دیوہا را در شیشہ کردہ
ز طبعش موجزن بحر معانی   بہ بحر شعر آبیہ زندگانی
ز نطقش تشنہ معنی زند جوش   شود سامع چہ صورتہا بجز مدہوش
ز نظم و نثر نطقش آنچہ گفتہ   در نا سفتہ گوہرہا سے سفتہ

مولانا شبلی مرحوم نے بعض تذکروں کے اسناد پر صرف مندرجہ ذیل رباعی کو زیب النساء بیگم کی طرف منسوب کیا ہے،

بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد   کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت   غنچۂ باغ دل ما زیب دستارے نشد

مگر پروفیسر محفوظ الحق نے معارف کے مضمون ہذا میں اس رباعی کو بھی مشکوک بتایا ہے،

زیب النساء کا ذوق شعری اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس کی خدمت میں شعراء اپنے معروضات اشعار ہی میں پیش کرتے تھے، اوپر یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ زیب النساء کی بیاض اس کی ایک کنیز کے ہاتھ سے حوض میں گر گئی تھی، زیب النساء کے استاد ملا سعید اشرف ماژندرانی نے کنیز کی طرف سے ایک طویل معذرت نامہ لکھ کر زیب النساء کی خدمت میں پیش کیا، یہ نظم مخزن الغرائب میں درج ہے جس کی پوری نقل مقالات شبلی حصہ پنجم کے مضمون زیب النساء میں بھی ہے، ہم یہاں اس کے صرف چند اشعار

ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں :-

اے ادا فہمے کہ پیشت فاضلان عصر را | شستن مجموعۂ اندیشہ با آب افتادہ است
در خم افلاطون زیادہ دانشت سرخوش بود | ہمچو مجموعے کہ در فکر شراب افتادہ است
ذہن صافت تا علم گردید در دانشوری | طبع افلاطون زبس در اضطراب افتادہ است
دفتر فرہنگ در چنگش مجزا گشتہ است | از کفش مجموعۂ دانش در آب افتادہ است
آن بیاض خامۂ شاہی کہ در اطراف آن | جاے افشان نقطہاے انتخاب افتادہ است
آن مرصع خوان گہر ریزی کہ باشد جلوہ گر | دُرّ الفاظش بسے با آب و تاب افتادہ است

مآثر الکرام میں غلام علی آزاد بلگرامی، ملا سعید اشرف مازندرانی کے ذکر میں لکھتے ہیں، کہ ایک بار زیب النساء بیگم نے استاد کی خدمت کے لیے ایک کنیز بھیجی، مگر ملا سعید اس سے خوش نہ رہ سکے، اور اسکی ہجو میں ایک قطعہ لکھکر زیب النساء بیگم کے پاس بھیجا۔ غلام علی آزاد نے اس قطعہ کا صرف پہلا مصرعہ ذیل شعر نقل کیا ہے،

قدر دانشور شناسا! نور چشم عالما | اے کہ ہرگز قدرت ہم چشمیت حور را نداشت

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس ہجو میں ملا سعید نے کلام پاک کے الفاظ قاب قوسین او ادنی کو بہت ہی فحش طریقہ پر استعمال کیا، مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے لیکن ان کو تعجب ہے کہ ملا سعید نے اس قسم کی بے اعتدالی کی جرأت کس طرح کی کیونکہ شاہی بیگمات کے آداب اور زیب النساء کا زاہدانہ مذاق اس قسم کی جرأت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا،

ملا سعید کو زیب النساء کی ملازمت میں جب کافی مدت گذر گئی، تو وطن واپس جانیکی تمنا ہوئی اور رخصت کی درخواست ایک مدحیہ قصیدہ میں لکھکر دی، اس قصیدہ کے آخر میں لکھتے ہیں :-

یکبارہ از وطن نتوان بر گرفت دل | در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند | گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چه دہلی چہ اصفہان | دل پیش تست تن چہ بہ کابل چہ قندھار

(مآثر الکرام ص ۱۱۶ جلد دوم)

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) مین زیب النسا کی خدمت مین شاعرانہ معروضات کے سلسلے کا ایک اور واقعہ منقول ہے، نعمت خان عالی نے جو اس زمانہ کا ایک مشہور شاعر تھا، زیب النسا کے پاس ایک مرصع کلغی فروخت کے لیے بھیجی، زیب النسا نے اس کی قیمت بھیجنے مین دیر کی تو نعمت خان نے یہ رباعی لکھکر پیش کی،

اے بندگیت سعادت اختر من | در خدمت تو عیان شدہ جوہر من
گر جیغہ خریدنی است پس کو زر من | ور نیست خریدنی بزن بر سر من

اس رباعی کے صلہ مین زیب النسا بیگم نے پانچہزار روپے دلوائے، اور کلغی بھی واپس کر دی،

مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو خزانہ عامرہ سے نقل کیا ہے،

سنہ ۱۰۹ھ مین زیب النسا نے ابرک کا ایک بڑا خیمہ بنوایا جو تمام تر شیشہ کا معلوم ہوتا تھا، نعمت خان عالی نے اس کی تعریف مین ایک چھوٹی سی مثنوی کہی، اس کے کچھ اشعار مولانا شبلی نے اپنے مضمون زیب النسا مین بھی نقل کیے ہین، (دیکھو مقالات شبلی جلد پنجم ص ۱۱۶) زیب النسا کے دربار کے شعر و شاعری کے اسی چرچے کی بنا پر مولانا شبلی لکھتے ہین کہ عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعراء کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی زیب النسا کے حسن مذاق سے ہو گئی تھی،

اورنگزیب کی دوسری لڑکیان اورنگزیب کی دوسری لڑکیون کا علم و ہنر زیب النسا کی علمی شہرت کے سامنے ماند پڑ گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ زیب النسا کی طرح آسمان علم و ادب کی مہر و ماہ تو نہ بن سکین، مگر مختلف قسم کے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ تھین، مآثر عالمگیری کے مولف

بیان ہے کہ اورنگزیب کی لڑکیوں میں زینت النساء بیگم نے بھی باپ کی توجہ اور فیض تربیت سے علمی کمالات حاصل کیے، وہ عقاید مذہبی، احکام دینی اور مسائل شرعی سے بخوبی واقف و آگاہ تھی، (مآثر عالمگیری ص ۵۹۳) صبح گلشن میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک شاعرہ کی حیثیت سے بھی کیا ہے، مولف کے الفاظ یہ ہیں: (ص ۱۹۲-۱۹۱)

زینت النساء بیگم ہمشیرۂ زیب النساء بیگم از بنات اورنگزیب عالمگیر بادشاہ است عالمہ و شاعرہ و حافظ کلام اللہ بود، زینت المساجد بنا کردہ اش الی الآن در شہر شاہجہان آباد موجود و مشہور و بر سنگ مزارش کہ در صحن ہمان مسجد ست این شعر خودش منقوش و منقور، ؎

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است — سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ اورنگزیب کی لڑکی بدر النساء بیگم حفظ کلام اللہ کی سعادت اور علوم دینی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی، اور ہمیشہ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھا، عالمگیر کی ایک دوسری لڑکی زبدۃ النساء بیگم کے بارے میں مولف مذکور لکھتا ہے کہ ہمیشہ طاعت و عبادت و تحصیل علم میں عمر بسر کی، اور ذخیرۂ سعادت فراہم کرتی رہی،

غلط نامہ بزم تیموریہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۱۱	بیری	بیزدی	۳۷	۴	خواستہ شود	خواست شود
۶	۹	جابجا ذکر ہے	جا بجا ذکر کیا ہے	۳۹	۴	از ایجاز	ز ایجاز
۷	۱۸	پنچ	پاپنچ	"	۸	ابو الواجد	ابوالوجد
۱۹	۵	ز افعال	از افعال	۴۰	۵	مہمل	محمل
۲۷	۱۳	بنگر بہا	بنگر بہ بہا	"	۶	است کنون	رست کنون
۲۸	۱۷	ور دست اجل ہے	وز دستِ اجل ہے	۴۴	۴	سوانح حیات	سوانح عمری
۲۹	۱۳	نشینم	نشینیم	۴۵	۱۹	تین اور تالیفات	دو اور تالیفات
۳۱	۱۴	وائے آنست	وائے آنکس	۴۸	۱	ہیئت	تو ہیئت
۳۳	۳	جبین تن	جبین من	۴۹	۵	مباحث	مباحثہ
"	۵	نمین	کمین	۵۳	۱۵	خوانی جو	خوانی نے جو
"	۱۳	ز مہوشے	از مہوشے	۵۶	۱۴	لکھ نہین سکتا تھا	لکھ نہین سکتا تھا!
۳۴	۴	غمزدہ است	غمزدہ ات	۵۸	۳	مجنون را	مجنون زار
"	۱۰	ایجذ	ایزد	۶۰	۵	من یا ور دلم	من یار دلم
"	۱۱	ہم سیرت ہم آنکہ	ہم سیرت آنکہ	۶۳	۱	جس سے	اس سے
"	"	ہم صورت آنکہ ترا	ہم صورت آنکہ او ترا	۸۶	۱۱	از او سنے ملا	از او سنے جہر ملا
۳۵	۲	کردست	گردست	۹۹	۷	زین جامہ	زین خامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۰	۷	حیات آنی	حیات ثانی
۱۰۱	۶	برورش	پرورش
〃	۱۵	محو	مجو
۱۰۳	۱۹	بسیا زند	بسپا زند
۱۰۸	۱۲	نشا ندہی	نشا ندہ
۱۰۹	۱۰	این است	این ست
۱۱۰	۱۸	گرہی	گرمی
۱۱۰	۱۹	من دل با دل	من و دل بال
۱۱۲	۴	خود چشانی	خود چشانی
۱۱۳	۲	طبقات اکبری جلد سوم	طبقات اکبری جلد دوم
۱۱۳	۴	از خاک	ز خاک
۱۱۷	۶	ساتھ اپنے ساتھ اپنے	ساتھ اپنے
۱۱۸	۸	یا فتم	پا فتم
〃	حاشیہ	جلد سوم	جلد دوم
۱۱۹	۴	مجتمم	مجتیم
〃	۱۲	جلد سوم صـ ۲۲۹	جلد سوم صـ ۲۹۱
۱۲۰	۱	جلد سوم صـ ۲۱۸	جلد سوم صـ ۲۹۸
〃	۵	نذر یارهم	نذر یار یکم
〃	۱۰	نزد	بنزد
〃	۱۹	وانکه	زانکه
۱۲۱	۵	بکشود قفل	نکشود قفل
〃	۶	عرق	غرق
〃	〃	کز عیب	کز غیب
۱۲۲	۱۵	ہرکہ	ہرگہ
۱۲۳	۷	نگرا پنے	نگروہ اپنے
۱۳۶	۱۲	ولاسانامہ	ولاسانامہ در غایت مخففت
۱۴۳	۶	کروسے	گروسے
۱۵۳	۴	راودھائے	ز آ ودھائے
۱۵۷	۱۸	خاک	کز خاک
۱۵۸	۱۱	کھکلا ہی	کیکلا ہے
۱۶۱	۰	بصحرا	گرد صحرا
۱۶۲	۳	تذکرہ	[illegible]
۱۶۸	۱۳	گہری گفت	گہری سفت
۱۸۱	۱۶	فشانی	فشان
۱۸۴	۱۱	حاکم اور	حاکم بنا کر
۱۸۵	۱۷	بیاران	یاران
۱۸۶	۸	چشم	چشم
〃	〃	هژوه	هژه
۱۸۸	۱۲	نگرد	نگرد
۱۸۹	۴	، قرین	کا مد قرین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۷	۱۱	شدت	شدست	۲۳۹	۱۰	مقربان سی سرفراز فرماکر	مقربان کے خطاب سے سرفراز فرماکر
۱۹۸	۱۹	ازچه	ارچه	۲۴۰	۱۳	لبعی	ربعی
۱۹۹	۳	شنید	سپند	۲۴۱	۴	سرچشمه پهوٹا	دو سرچشمه پهوٹا
״	۴	کم وکاست	کم کاست	۲۵۰	۵	نالی معاوضه	مالی معاوضه
״	۸	نشنید	نشنیند	۲۵۱	۲	جهانگیر	عالمگیر
״	۱۱	پردلها	تردلها	۲۶۶	۷	زاری	رازی
۲۰۰	۱۱	این مصرع	این دو مصرع	۲۷۰	۱	دریاکنان	دریاکشان
۲۰۲	۱۱	زبر تسبیح	زهر تسبیح	״	۱۲	محی الدین	محی الدینی
۲۰۳	۱۲	بزیان	بزبان	۲۷۲	۱۰	رکهه مطالعه	رکهکر مطالعه
״	۱۳	پنان	بیان	۲۷۴	۱۹	حشم	چشم
״	۱۵	یدلی	بدهلی	۲۷۵	۵	باب	باپ
״	۱۷	گلشن	بگلشن	۲۷۶	۱۲	بره	براه
״	۱۸	دبی	دلی	۲۷۹	۶	لاس	برلاس
۲۰۵	۱۳	غزل کے شعر	غزل کے کچھ شعر	۲۸۳	۵	گرفت	ریخت
״	۱۸	عرق	غرق	۲۸۷	۶	اس کے نظم ونثر	اس کی نظم ونثر
۲۱۱	۱۳	بڑی درک حاصل تها	بڑا درک حاصل تها	۲۹۰	۹	جن مین	ان مین
۲۲۸	۸	یه سعادت تیموری	یه سعادت فرزاول کی	۳۱۲	۱۰	مبرسم	میرسیم
		بادشاهون مین	تیموری بادشاهون مین	״	۱۱	میازر	میازار
۲۳۰	۱۱	مصحف لکهکر بهیجا	مصحف لکهکر	۳۱۵	۱۶	چلیے تهے	چلیے تها
			مدینه منوره بهیجا	״	۱۸	مزے	مزے مین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲۹	۱۸	شرارہ	شرر	۳۶۶	۱۱	میرا	میر
۳۳۱	۴	آنسو ہے جو	آنسو جو	۳۶۷	۱	پنہا	پنہان
″	۱۰	آہین	آہن	۳۶۹	۶	زنگ سرخ	سنگ سرخ
۳۳۵	۳	نہ مے	نے	۳۷۱	۱۰	ساغرسے	ساغرے
۳۳۷	۱	شکوے	شکوے سے	″	۱۵	کل	گُل
″	۲	ہے تو پھر	ہے پھر	۳۷۲	۱۶	زینہاکہ	زینہانکر
۳۳۸	۹	یا آئین	یان آئین	۳۷۷	۱۳	بزہ اسی	بزد اسی
۳۴۲	۱۲	وہی	وہ ہی	۳۷۸	۶	بکشا ید	نکشا ید
۳۴۴	۱۰	خواب تھا	یہ خواب تھا	۳۸۲	۱۳	دیدہ است	دید است
۳۴۷	۸	عاشق!	عاشقو	۳۸۴	۴	نیاخت	نباخت
۳۵۵	۱۴	بھرے	پھرے	″	۱۷	ششے	شیشے
۳۵۶	۵	نکلنے ہین	نکلے ہے	″	۱۸	اثہ	ابد
″	۹	مادیہ	مار سیہ	۳۹۳	۱۳	اس	اس کے ویران
″	۱۸	اس	اوس (یعنی شبنم)	″	۱۸	ناکشش	تاکشش
۳۵۷	۸	دل اوپر	دل آویز	۳۹۶	۲	دستور لفصحار	دستور الفصحار
″	۱۴	دھوکے	دھوکے گر	۴۰۱	۱۹	کھایا	دکھایا
۳۶۰	۳	نگاہین ہین	نگاہین بھی سحر ہین	۴۱۲	۴	عاقل	غافل
″	۱۰	سرمہ	سرمہ کی	۴۱۳	۲	کہنا اور	کہتا اور
″	۲۰	مشکل بندی	مشکل پسندی	۴۱۶	حاشیہ	لکھا ہی مرقوم ہے	مرقوم ہے
۳۶۲	۲	کہتے تھے	یہی کہتے تھے	۴۲۴	۱۳	ثبیب	نسبت
۳۶۳	۵	چھونڈ دون	چھوڑدون	صفحہ ۴۲۴ کے بعد ۴۲۸، ۴۲۸ اور ۴۲۹ کے بجائے ۴۲۵ [illegible]			
۳۶۴	۱۹	دلی	کیا دل	۴۲۹	ہوسنے	چاہیئن	

تاریخ ہند و دوسری کتابیں

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فنِ انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے طرزِ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، قیمت للعہ، حجم، ۳۹ صفحے،

(از سید نجیب اشرف ندوی)

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات، جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کیے گئے ہیں، اور اُن سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت: ۔ ۳ر، ۴۸۸ صفحے، (مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی)

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ، اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی حکومتوں کی پوری تاریخ، اور اُن کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، (مؤلفہ مولانا سید ابوظفر ندوی) قیمت: ۔ چھ روپئے،

ضخامت: ۔ ۴۰۰ صفحے،

"منیجر"

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)